عہدِ حاضر کے نامور دانشوروں کے مدیرانِ ارژنگ کو تاریخی انٹرویوز

رُوبرو

انٹرویوز

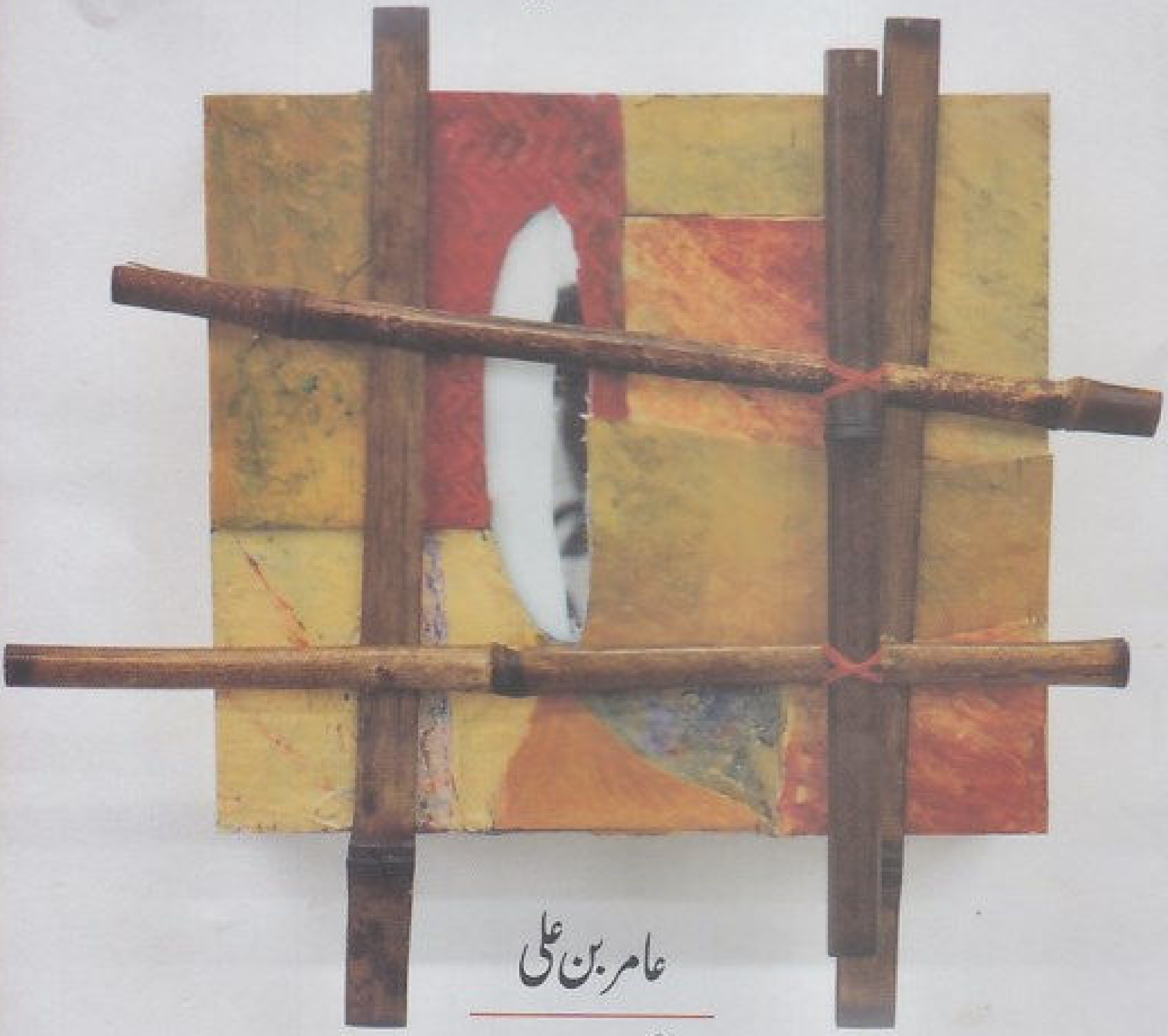

عامر بن علی

حسن عباسی

لبنیٰ صفدر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رُوبرو

عامر بن علی
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

عہد حاضر کے نامور دانشوروں کے مدیرانِ ''ارژنگ'' کو تاریخی انٹرویو

رُوبرو

(انٹرویوز)

عامر بن علی

حسن عباسی

لبنیٰ صفدر

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 0331-4489310

E-mail: nastalique786@gmail.com

نٓ والقلم وما یسطرون٥

القرآن

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	روبرو
مرتبین	عامر بن علی، حسن عباسی، لبنیٰ صفدر
سرورق	احسن گرافکس
اشاعت	جون 2019
کمپوزنگ	التمش مبین
مطبع	حاجی منیر پرنٹرز، لاہور
قیمت	600 روپے

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 0331-4489310

E-mail: nastalique786@gmail.com

انتساب

اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، مشتاق احمد یوسفی

منیر نیازی، منو بھائی، مشکور حسین یاد

شہزاد احمد، شہرت بخاری اور اسلم کولسری

کے نام

جن کے انٹرویوز اس کتاب میں موجود ہیں

مگر وہ اب ہم میں موجود نہیں

ایک اک کر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئے

ہائے کیا لوگ مرے حلقہ احباب میں تھے

فہرست

روبرو......عامر بن علی

✦ اشفاق احمد 11
✦ احمد ندیم قاسمی 15
✦ انور مسعود 22
✦ امجد اسلام امجد 26
✦ اسلم کولسری 34
✦ اقبال راہی 43
✦ اختر شمار، ڈاکٹر 48
✦ امجد اقبال امجد 57
✦ حنان عواد، ڈاکٹر 61
✦ خالد شریف 64
✦ دالیا سٹاپانکوٹی 69
✦ شہزاد احمد 74
✦ شہرت بخاری 81
✦ شہناز مزمل، ڈاکٹر 86
✦ طاہر نسیم 89

✧ عطاء الحق قاسمی	92
✧ علی محمد خاں، ڈاکٹر	113
✧ عباس تابش	119
✧ عطا محمد خاں، کیپٹن	125
✧ غلام حسین ساجد	130
✧ فرحت پروین	136
✧ گل نوخیز اختر	146
✧ منیر نیازی	151
✧ مُنّو بھائی	155
✧ مشکور حسین یاد	158
✧ مشتاق احمد یوسفی	162
✧ محسن مگھیانہ، ڈاکٹر	167
✧ نیلما ناہید درانی	171
✧ ناز بٹ	176
✧ وصی شاہ	184
✧ یاسر پیرزادہ	188

روبرو......حسن عباسی

✧ احمد عدنان طارق	193
✧ جعفر حسن مبارک، ڈاکٹر	201
✧ رفعت عباس	207
✧ سلیم شہزاد	218
✧ سلیمان عبداللہ ڈار، ڈاکٹر	224

✧ ظفر اسلام	230
✧ عاشق رحیل	235
✧ کوثر محمود، ڈاکٹر	246
✧ لبنیٰ صفدر	258
✧ محمد سعید اللہ صدیق	274
✧ منصور آفاق	285
✧ محمد عاصم بٹ	289
✧ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر	301
✧ نذیر قیصر	316

روبرو......لبنیٰ صفدر

✧ اجمل نیازی، ڈاکٹر	331
✧ امجد پرویز، ڈاکٹر	341
✧ بشریٰ رحمٰن	349
✧ بشریٰ اعجاز	360
✧ سعید آسی	372
✧ سیما غزل	382
✧ صہیب مرغوب	389
✧ ظہور الاسلام جاوید	401
✧ نصیر احمد ناصر	405
✧ نیلم احمد بشیر	419
✧ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر	425
✧ یاسمین حمید	438

اشفاق احمد

س لکھنا کیسے شروع کیا؟

ج کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ لکھنا کب شروع کیا۔ میں پڑھنے لکھنے سے بڑی جان چھڑاتا تھا کیونکہ میں اچھا سٹوڈنٹ نہیں تھا۔ مشکل سے پاس ہوتا بلکہ میٹرک میں فیل بھی ہو گیا تھا۔ جب میں ایف اے میں کالج میں داخل ہوا تو پھر میں نے اردگرد پروفیسرز اور اساتذہ کو نئے روپ میں دیکھا۔ وہ کچھ ایسے شفیق لوگ تھے اور اپنا آپ نچھاور کرنے میں تھوڑے سے ''شیخی باز'' بھی تھے۔ ان کی اس تعلّیٰ کا ہمیں بڑا فائدہ ہوا کہ وہ اپنا علم ہم پر نچھاور کرنا چاہتے تھے۔ فلسفے کے ایک پروفیسر لالہ دیس راج بڑی عمر کے پروفیسر تھے ان کی معرفت میں بلھے شاہ سے متعارف ہوا۔ جو کچھ پروفیسر صاحب نے ہمہ اوست کے فلسفہ کے بارے میں بتایا وہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ البتہ بلھے شاہ کی شاعری کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو گیا۔ پھر بلھے شاہ کی شاعری سے پھسلتا پھسلتا اس عہد کی اردو شاعری جو زیادہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھی کی طرف جا نکلا اور پھر مجھ سے پوچھے بغیر اور مجھ کو بتائے بغیر میرے اردگرد لکھنے لکھانے کا عمل شروع ہو گیا۔

س ابتداء میں کن سے متاثر تھے؟

ج ابتداء میں تو انگریزی کے وہ مصنف جن کی نظمیں اور نثر ہمارے کورس میں شامل تھیں ان سے متاثر ہوا پھر اردو نظم و نثر میں ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے بڑا ''ہانٹ'' کیا لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب میں خود لکھنے لگا تو میں ترقی پسندی کے ''ہانٹڈ'' ہاؤس سے نکل کر قریب ہی چھوٹی چھوٹی جھگیاں بنانے لگا۔ جو دیکھنے میں تو شاید اتنی خوبصورت

نہیں تھی لیکن ان کے اندر کی رہائش بڑی پرفضا اور پرسکون تھی۔

س بقول منیر نیازی ترقی پسندوں کی تمام شاعری موضوعاتی ہے اور موضوعاتی شاعری گہری شاعری کی ذیل میں نہیں آتی۔ آپ اس خیال سے کس حد تک اتفاق کریں گے؟

ج میں بھی بالکل سو فیصد یہ سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو ایک پرچہ ترکیب استعمال دیا گیا تھا۔ جس کے مطابق وہ اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے اور بعض اوقات بڑی خاصے کی چیزیں پیش کر جاتے۔ جنگ ختم ہو رہی تھی، انگریز جا رہا تھا، آزادی قریب تھی۔ ایسے میں ترقی پسندی کا لٹریچر طرارے بھر رہا تھا اور موجیں مار رہا تھا۔

س احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض ایسے بڑے شعراء اور ترقی پسندوں کی موجودگی میں منیر نیازی کی شاعرانہ حیثیت کیا بنتی ہے؟

ج اصل میں ان کا مقابلہ ایک عجیب سی بات ہے اور کسی کو کسی سے بڑا شاعر قرار دینا بھی کافی مشکل ہو جاتا ہے لیکن شاعری کے اعتبار سے تینوں ہی بڑے توجہ طلب شاعر ہیں اور سننے والے کی نگاہیں اٹھ اٹھ کر ان کی طرف جاتی ہیں۔ منیر بلاشبہ ان میں مختلف شاعر ہے۔ فیض میں جو رومانیت ہے وہ دوسرے دونوں شاعروں میں کم درجے پر ہے۔ لیکن ندیم میں موضوعات کا جو تنوع ہے وہ فیض اور منیر کے ہاں کم ملتا ہے۔ منیر کی شاعری کا بڑا وصف اس تحیر میں پنہاں ہے جو اسے اپنی ذات پر ہے کہ ہیں میں تو اپنے آپ کو بڑا اچھا سمجھتا تھا۔

س آپ کا کہنا ہے کہ کالم نگاری نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس نقصان کی کچھ وضاحت کریں؟

ج کالم نگاری نے بہت اچھے ادیبوں کا اتنا وقت لے لیا کہ وہ ادیب نہ بن سکے۔

س کیا ابن انشاء اور عطاء الحق قاسمی کے کالم بھی اسی ذیل میں آتے ہیں؟

ج یہ دونوں اور ان جیسے کچھ اور تخلیقی ادیبوں کو مستثنیات میں رکھا جا سکتا ہے؟

س کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ قدرت اللہ شہاب کو بابا بنانے میں ممتاز مفتی اور آپ کا بڑا ہاتھ ہے؟

ج لوگوں کا میں دل نہیں توڑنا چاہتا تھا کہ شاید ایسے ہی ہے۔اصل میں قدرت اللہ شہاب ایک معمولی دو ٹکے کا آدمی تھا۔نہ اس کی کوئی عزت تھی نہ شہرت، نہ ہی کوئی معاشرتی مقام چنانچہ میں نے اور ممتاز مفتی نے سوچا کہ اس کو ایک بزرگ کی حیثیت سے مشہور کر دیتے ہیں۔ ہمارا دوست معروف ہو جائے گا چنانچہ ایسے ہی ہوا لوگوں نے اس کی عزت شروع کر دی۔ پھر دس پندرہ لکھنے والوں نے مل ملا کر شہاب نامہ لکھنا شروع کیا۔ایک ایک باب اپنے ذمے لیا اور اسے مکمل کر کے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قدرت اللہ شہاب کے نام سے شائع کرایا۔یوں دیکھتے ہی دیکھتے چشم زدن میں قدرت اللہ بابا بھی بن گیا اور ادیب بھی۔

س شہاب نامے میں شامل چند مافوق الفطرت واقعات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج شہاب نامے میں جن مافوق الفطرت واقعات کا ذکر ہے وہ میرے ساتھ کبھی پیش نہیں آئے لیکن میں ان کا بطلان نہیں کر سکتا۔اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے ساتھ یہ واقعہ گزرا ہے تو میں اسے تسلیم کر لیتا ہوں کہ ایسا ہوا ہوگا۔اس دلیل سے اسے نہیں کاٹتا کہ چونکہ میرے ساتھ ایسا واقعہ نہیں گزرا اس لیے غلط ہے۔

س ایک بابا جی آپ کے بھی تو ہیں؟

ج جی ہاں: وہ میرے مرشد ہیں ان کا نام حضرت سائیں فضل شاہ صاحب نور والے ہیں۔ان کا ڈیرہ میاں میر صاحب کے دروازے کے عین سامنے انفنٹری روڈ پر ہے۔اب وہ اس جہان سے پردہ کر چکے ہیں۔

س کیا ان بابا جی سے شہاب صاحب کا بھی ملنا تھا؟

ج بالکل میری وجہ سے شہاب صاحب ان سے بہت دفعہ ملے اور وہ بابا جی کا بڑا احترام کرتے تھے۔

س تو کیا قدرت اللہ شہاب اور آپ دونوں ایک ہی سلسلے سے منسلک ہیں؟

ج شہاب نامے میں ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہاب

صاحب کا سلوک کے راستے سے گہرا تعلق تھا۔ لیکن میں علم تصوف کا جرنلسٹ ہوں۔ میں اس علم کے بارے میں متعلقہ ریفرنس اکٹھے کر کے فراہم کر سکتا ہوں لیکن خود صوفی نہیں ہوں نہ ہی میں اس راستے کا مسافر ہوں جس طرح ایک مالدار اور آسودہ حال آدمی کمیونزم کا قائل ہوتا ہے۔ کچھ ایسی کیفیت میری ہے۔ میں دل و جان سے تصوف کا قائل ہوں لیکن بد قسمتی سے اس راہ کو اختیار نہیں کر سکا۔

س آپ کی اس خواہش کی راہ میں کیا رکاوٹ حائل ہے؟

ج میں سمجھتا ہوں کہ میری راہ میں خوف اور خواہش حائل ہیں اور یہی دو انسانی راستے کے سب سے بڑے دو خوفناک بھیڑیے ہیں۔

س ان سے چھٹکارے کی کوئی راہ؟

ج جس طرح جسمانی عارضے کے لیے کسی حکیم طبیب یا ڈاکٹر کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اسی طرح روحانی عارضے کے لیے ایک بادل کی تلاش دامن گیر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حکیم کی تلاش پر تو لوگ معترض نہیں ہوتے لیکن کسی بابے کی حضوری میں جانے کی راہ میں سب سے بڑا پتھر لوگ ہی ہوتے ہیں۔ جن کا مریض کے ساتھ کوئی ذہنی، جسمانی، عقلی یا روحانی تعلق بھی نہیں ہوتا۔

س کیا ہمارے مسائل کا حل صرف روٹی ہے؟

ج ہمارے ہاں کسی کو روٹی کپڑا اور مکان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے چودہ کروڑ عوام کسی ایسے کندھے کی تلاش میں پھر رہے ہیں جس پر وہ سر رکھ کر رو سکیں مگر بد قسمتی سے وہ کندھا نہیں ملتا۔

س کیا ہم انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں؟

ج یہ پیشین گوئی تو نہیں کی جا سکتی یہ سوال صحافیوں سے کیا جانا چاہیے وہ اس کی بہتر نشاندہی کر سکتے ہیں۔

س بڑے اخبارات کے ادبی ایڈیشن ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ج وہ بھی ادب کے فروغ میں وہی کردار ادا کر رہے ہیں جتنا کہ بڑے ادبی مجلے یا پرچے۔

احمد ندیم قاسمی

برصغیر پاک و ہند کے نامور شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار احمد ندیم قاسمی نے اپنی سالگرہ پر ''ارژنگ'' کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ میں ترقی پسند تھا اور ہوں مگر ساتھ ہی ایک سیدھا سادا مسلمان بھی ہوں۔ فیض کے حوالے سے اس خصوصی انٹرویو میں انہوں نے مزید کہا کہ ''معاصر'' میں فیض کے حوالے سے میرے مضمون پر معترض حضرات آئندہ ''معاصر'' میں میرا ایک مضمون پڑھ لیں جو میں نے فیض صاحب کی صدارت میں پڑھا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میرے مضمون میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں میں نے فیض کو مدہوش، شرابی، غائب دماغ اور لاا ُبالی ثابت کیا ہے۔ فیض سے بعض شکایات اپنی جگہ وہ میرے لیے بے حد محترم تھے۔

س آپ برصغیر کے صفِ اوّل کے شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار ہیں۔ آپ نے ادبی زندگی کا آغاز کس صنف سے کیا؟

ج شاعری سے۔

س ابتداء میں کس سے متاثر تھے؟

ج شاعری میں اقبال، ظفر علی خان اور اختر شیرانی سے اور افسانے میں منشی پریم چند سے۔

س ہم عصر شعراء اور افسانہ نگاروں میں کن سے متاثر ہیں؟ چند ایک نام ضرور لیں۔

ج ہم عصر شعراء اور افسانہ نگاروں میں سے کسی سے متاثر نہیں ہوں۔ البتہ متعدد کو پسند کرتا ہوں مثلاً ن۔ م راشد، فیض احمد فیض، احمد فراز، اختر حسین جعفری، شکیب جلالی، رضی اختر شوق اور ساقی فاروقی وغیرہ کی شاعری پسند ہے۔ افسانہ نگاروں میں کرشن، منٹو، بیدی، عصمت،

خدیجہ، ہاجرہ، اشفاق احمد، منشا یاد، رفعت مرتضیٰ اور نیلوفر اقبال وغیرہ اچھے لگتے ہیں۔

س آپ کی مادری زبان پنجابی ہے۔ پنجابی میں آپ نے کچھ لکھا۔ اگر نہیں تو کیوں؟

ج میں نے پنجابی میں شاعری کی ہے اور ساتھ ہی پنجابی شعر و نثر کی متعدد کتابوں کے پنجابی ہی میں دیباچے لکھے ہیں۔ مثلاً احمد راہی کے ''ترنجن'' اور سلیم کاشر کے متعدد مجموعے۔

س علاقائی زبانوں خاص طور پر پنجابی کا مستقبل کیا ہے؟

ج نہایت روشن مستقبل ہے۔ جس زبان کو وارث شاہ، بلھے شاہ، سلطان باہو، خواجہ فرید اور میاں محمد بخش کے سے اساتذہ فن میسر ہوں اسے کیسے زوال آ سکتا ہے اور پھر دورِ جدید میں نہایت معیاری پنجابی شاعری بھی ہو رہی ہے۔ پنجابی افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں اور پنجابی ادب کی تنقید بھی چھپ رہی ہے۔

س بقول منیر نیازی ''ترقی پسندوں کی ساری شاعری موضوعاتی ہے'' اور موضوعاتی شاعری گہری شاعری کی ذیل میں نہیں آتی۔ آپ ان کی بات سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟

ج صدفی صد اختلاف کرتا ہوں۔ منیر نیازی اس طرح کے ٹوٹکے چھوڑنے کے عادی ہیں۔ اگر چہ تمام تر ترقی پسند شاعری محض موضوعاتی نہیں ہے لیکن اگر تمام موضوعاتی شاعری اس قدر مذمت کی مستحق ہے تو علامہ اقبال کی موضوعاتی شاعری کو کہاں لے جایئے گا۔ خود منیر نیازی بھی صرف سطح کی شاعری کرتے ہیں۔ انہیں تو گہرائی میں جانے سے باقاعدہ خوف آتا ہے۔

س ترقی پسند یا فحاشی! منٹو کے افسانے کس ذیل میں آتے ہیں؟

ج بیشتر ترقی پسندی کی ذیل میں آتے ہیں۔ اکا دکا افسانوں پر فحاشی کا شبہ ہوتا ہے ورنہ وہ ردشدہ انسانوں کے حالات کی عبرتناکی واضح کر کے دراصل بہتر معاشرے کی آرزو کرتے ہیں۔

س ''معاصر'' میں فیض کے حوالے سے اپنے مضمون میں آپ نے لکھا ہے کہ فیض بورژوا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور انہی میں خوش رہتے تھے۔ تو آپ کی اس بات کے

حوالے سے کیا کہا جا سکتا ہے کہ فیض کی ساری شاعری ترقی پسند منشور کے حوالے سے ان کا اصل چہرہ نہیں ہے؟

ج حسن اور عشق کے موضوعات ابدی موضوعات ہیں اور اگر فیض نے حسن و عشق کی شاعری کی ہے تو یہ بھی ترقی پسندی ہے۔ کیونکہ حسن کی بقاء اور باہمی عشق کی فضا پیدا کرنے سے بڑی ترقی پسندی اور کیا ہوگی؟ دراصل عام ذہن میں ترقی پسندی کو نہایت محدود سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ غالب بھی اپنے دور کا ترقی پسند تھا اور اقبال بھی ترقی پسند تھا۔ چنانچہ فیض کی شاعری بھی ترقی پسندی ہی کی عکاس ہے۔ ترقی پسندی کے منشور میں انسانی وقار کی بحالی اور عوام الناس کے احتجاج کو ختم کرنے کا ذکر ہے اور یہ وہ مقاصد ہیں جو ہر ایماندار اور باضمیر شاعر اور تخلیق کار کے پیش نظر ہونے چاہئیں۔ اگر فیض بورژوا لوگوں میں خوش رہتے تھے یہ ان کی مجلسی مجبوری تھی۔ ورنہ انہوں نے بورژوایت کے حق میں ایک مصرع تک نہیں لکھا۔

س ایک جگہ آپ نے لکھا ہے کہ "دستِ صبا" جیل سے مرتب ہو کر ناشر تک پہنچا اور فیض صاحب نے آپ کو لکھا کہ آپ اس مسودے پر ایک نظر ڈال لیں جس کے جواب میں آپ نے "دستِ صبا" کے بعض مقامات کے سلسلے میں شبے کا اظہار کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ فیض کے کلام میں کچھ خامیاں تھیں۔ آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ خامیاں کس نوعیت کی تھیں؟

ج ایک عمر اور ایک مرتبے کے شعراء اپنے کلام کے سلسلے میں باہمی گفتگو کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی خامیاں تلاش کی جا رہی ہیں۔ میں نے بعض اشعار میں بعض الفاظ کے متبادل الفاظ تجویز کیے جس سے میری رائے میں مفہوم زیادہ چمک اُٹھتا۔ فیض صاحب نے میرے بعض دوستانہ مشورے قبول کیے مگر بعض کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ان کے کلام میں خامیوں کی نشاندہی کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

س آپ کا شمار ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اس کا تسلسل آج کے ادب میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟

ج میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ بانی تو سید سجاد ظہیر، احمد علی

اور ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ تھے۔ میں تو ترقی پسند ادب کی تحریک میں 1948ء میں شامل ہوا اور تحریک کا آغاز 1936ء میں ہو چکا تھا۔ رہی یہ بات کہ آج کے ادب میں اس تحریک کی کیا اہمیت ہے تو معدودے چند علامت نگاروں اور تجزیہ نگاروں کو چھوڑ کر ان اِکا دُکا اہل قلم سے قطع نظر جو بڑے سے بڑے تخلیق کار کو تسلیم نہیں کرتے، باقی نوے پچانوے فیصد اہل قلم، غیر شعوری طور پر ہی سہی اس تحریک سے متاثر ہیں اور ان کی تحریریں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

س فیض احمد فیض اور دیگر سینئرز کی موجودگی میں انجمن ترقی پسند کے جنرل سیکرٹری کے طور پر آپ نے اپنی تقرری کو کیسے لیا؟

ج مجھے دور دراز کا بھی اندازہ نہ تھا کہ مجھ پر یہ بم گرے گا۔ میں ترقی پسند تو یقیناً تھا اور ہوں مگر ساتھ ہی ایک سیدھا سادا مسلمان بھی ہوں۔ میرے بارے میں مشہور تھا کہ ملک میں اس شخص کا کوئی مخالف نہیں ہے اور یہ بہت حد تک درست بھی تھا۔ میری مخالفت کا آغاز تو اس وقت ہوا جب میں نے اپنا رسالہ ''فنون'' جاری کیا۔ اس کی مقبولیت نے میرے بعض مخالف پیدا کر دیے ورنہ میں خاصا ہر دلعزیز قلمکار تھا۔ شاید اسی وجہ سے ''بڑے'' ترقی پسندوں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے جنرل سیکرٹری بنایا جائے تاکہ ترقی پسندوں کے بارے میں اپنا جو کمیونزم کا پرچار کرنے والوں کی عام افواہ تھی اسے ختم کیا جا سکے۔ جب میرا نام اتنے بڑے عہدے کے لیے تجویز کیا گیا تو میں نے احتجاج کیا کہ فیض احمد فیض صاحب کی موجودگی میں مجھے اس عہدے کے لیے نامزد کرنا زیادتی ہے۔ مگر ''یار لوگ'' شاید فیصلہ کر کے آئے تھے۔ اس لیے میری ایک نہ سنی گئی۔ یہ سب سے بڑی ذمہ داری تھی جو میں نے پانچ برس تک حتی الامکان پوری تندہی سے نبھائی۔

س آپ کے مضمون کے ردعمل میں کچھ ادیبوں کا یہ کہنا ہے کہ فیض میں اگر کچھ خامیاں تھیں یا ان سے آپ کے اختلافات تھے تو ان کا اظہار ان کی زندگی میں ہونا چاہیے تھا۔ اس حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

ج معترض حضرات آئندہ ''معاصر'' میں میرا ایک مضمون پڑھ لیں جو میں نے فیض صاحب کی موجودگی ہیں بلکہ ان کی صدارت میں پڑھا تھا۔ انہیں تسلی بخش جواب ملے گا۔

س آپ کے مضمون میں فیض صاحب کے بارے میں جو مجموعی تاثر بنتا ہے وہ ہر وقت نشے میں مدہوش، شرابی، غائب حاضر دماغ اور ایک لا اُبالی شخص کا ہے۔ جبکہ اپنی شاعری میں فیض ایک مختلف شخص نظر آتے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ؟

ج میرے مضمون میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں جہاں میں نے فیض صاحب کو مدہوش، شرابی، غائب حاضر دماغ اور ایک لا اُبالی شخص ثابت کیا ہے۔ اس کے برعکس میں نے تو واضح کیا کہ انہیں شراب کا نشہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ وہ شاعری، مصوری اور موسیقی وغیرہ کے موضوعات پر نہایت دل آویز گفتگو کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرا مضمون غور سے نہیں پڑھا۔ صرف بعض اخباروں کی فساد انگیز سرخیاں پڑھی ہیں۔

س اپنے حوالے سے آپ نے فیض احمد فیض کے جس تعصب کا ذکر کیا ہے کیا آپ اس کی کچھ مثالیں بیان کریں گے۔ اب جبکہ اس بات کو ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کو اس تعصب نے کس حد تک متاثر کیا؟

ج مجھے اس ضمن میں جو کچھ کہنا تھا میں اپنے مضمون میں کہہ چکا ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔

س دورانِ قید حکومت نے آپ کو قومی ترانہ لکھنے کی دعوت دی جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حکومت کو آپ کے مرتبے اور اہمیت کا خیال تھا۔ دوسری طرف آپ کے لیے بھی اعزاز کی بات تھی کہ تمام تر اختلافات کے باوجود حکومت کی طرف سے آپ کو ملک کا ترانہ لکھنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ آپ نے اس دعوت کو کیوں ٹھکرایا، کیا بعد میں اس حوالے سے کوئی پچھتاوا ہوا؟

ج میں کیمبل پور ڈسٹرکٹ جیل میں ایک سی کلاس میں نظر بند تھا۔ تب مجھے جیل کے

حکام نے چھا گلہ کی اس ٹیون کا ریکارڈ بھیجا جو میرے نام قومی ترانہ لکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر وہاں خنجر گاڑ دیا گیا ہے۔ مجھے اس دعوت نامے کا شدید دُکھ ہوا اور میرے اندازے کے مطابق مجھے دُکھ پہنچانے کے لیے چھا گلہ کی ٹیون مجھے جیل کے اندر بھیجی گئی تھی۔ اس صورت میں ترانہ کیوں لکھتا اور اگر لکھتا تو اس میں حکمرانوں کے مظالم کے سوا کیا ہوتا؟

س فیض صاحب کی وفات کے حوالے سے بطورِ خاص آپ نے لکھا ہے کہ ''20 نومبر کو ان کا انتقال ہوگیا۔ 20 نومبر کو جو میری پیدائش کی تاریخ ہے، ان کی تاریخ وفات قرار پائی'' ان جملوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج صرف دُکھ مراد ہے۔ فیض صاحب سے بعض شکایات اپنی جگہ مگر وہ میرے لیے محترم تھے۔ 20 نومبر کو ان کی وفات سے مجھے گہرا دُکھ ہوا۔ دس پندرہ روز قبل میں نے اپنے احباب کو اپنی سالگرہ کی دعوت میں بلا رکھا تھا مگر 20 نومبر کو یہ سانحہ ہوگیا۔ میں فیض صاحب کے جنازے کے بعد ان کی تدفین تک اور ان کے مزار پر دعا کرنے کے بعد ہی ہوٹل میں اپنے مہمانوں کے پاس پہنچا۔ ان سے معذرت کی اور چائے کی ایک ایک پیالی پیش کر کے اُنہیں رُخصت کر دیا۔

س فیض صاحب کی شاعری کے حوالے سے آپ نے لکھا کہ ''ان کے ہاں فکری گہرائی نہیں ہے'' یہ فکری گہرائی کیا ہے اور فیض کے ہاں اس کی عدم موجودگی کا کیا سبب ہے جبکہ فیض صاحب ایک پڑھے لکھے شخص تھے اور ان کی شاعری اور دانشوری کا بھی ایک عالم معترف ہے۔

ج ''یہ فکری گہرائی کیا ہے؟'' کے الفاظ سن کر میں حیران ہوگیا کہ کیا آپ جو مجھ سے سوال پوچھ رہے ہیں اتنا بھی نہیں جانتے کہ فکری گہرائی کیا ہوتی ہے۔ غالب اور اقبال کا مطالعہ کیجیے، آپ کو فکری گہرائی کا مفہوم مل جائے گا۔ میں نے بھی اپنے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ فیض بہت پڑھے لکھے تھے اور اگر وہ چاہتے تو فکری شاعری کو اپنی دوسری شاعری

کی طرح شیریں اور مترنم بنا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور مجھے حیرت ہے کیوں نہیں کیا۔

س دُنیا کے عظیم انقلابات کے حوالے سے فیض صاحب کا انقلاب ایران کو عظیم قرار دینا اور پھر اس پر جیلانی کامران کا فیض کو اسلامی تاریخ کے عظیم دانشوروں میں شامل کرنا آپ کے نزدیک حیران کن کیوں ہے؟ کیا آپ کے خیال میں بطور مسلمان فیض کی حیثیت مشکوک ہے؟

ج مجھے اگر فیض کے جواب پر حیرت ہوتی ہے تو اس طرح ان کے مسلمان ہونے پر میرے شک کرنے کی گنجائش کیسے پیدا ہوگئی؟ اگر میں کہوں کہ ایران کا انقلاب، روس اور چین کے انقلابوں سے فروتر تھا تو کیا میں کافر ہو جاؤں گا اور ایران کے انقلاب کو عظیم ترین انقلاب قرار دینے سے کوئی دانشور کیسے ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کے سامنے انقلاب ایران سے پہلے مصر اور لیبیا کے انقلاب بھی موجود ہیں اور یہ دونوں بھی مسلمان ملک ہیں اور وہاں بھی بادشاہت ختم کی گئی تھی۔

انور مسعود

س ذریعہ اظہار شاعری کیوں منتخب کیا؟ لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج بات یہ ہے کہ میں جس گھر میں پیدا ہوا وہاں شاعری کا ماحول موجود تھا۔ میری نانی اماں شاعرہ تھیں اور تایا بھی شاعر تھے۔ جس شہر میں پرورش پا رہا تھا وہاں بھی شاعری کا بہت دور دورہ تھا۔ شاعری میں مجھے شروع سے ہی دلچسپی تھی۔ آپ دیکھیں کہ میں فارسی کی شاعری پڑھتا تھا حالانکہ مجھے فارسی کی بالکل سمجھ نہیں تھی۔ میری والدہ کو لٹریچر سے بہت دلچسپی تھی۔ والد صاحب نے بچپن میں ہی مجھے حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' لا کر دیا۔ اب بھی اُس کے کئی شعر مجھے زبانی یاد ہیں۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں شوق پروان چڑھا اور لکھنے کا خیال آیا۔ یہاں میں اپنے شفیق اساتذہ چوہدری فضل حسین اور سیّد حامد حسین کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے بھی اس بابت بہت رہنمائی فرمائی۔

س آپ پیدا کہاں ہوئے؟ بچپن کہاں گزرا؟ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے گا؟

ج پیدائش تو میری سوہنی مہیوال کے چناب والے گجرات میں ہوئی۔ مگر والد صاحب کاروبار کے سلسلے میں لاہور ہجرت کر گئے۔ پرائمری سکول یعنی پانچویں جماعت تک کی تعلیم میں نے لاہور میں حاصل کی۔ بعدازاں والد صاحب واپس گجرات آ گئے اور ہم لوگ بھی ان کے ساتھ۔ میٹرک میں نے پبلک ہائی سکول گجرات سے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا۔ F.S.C میں زمیندار کالج میں داخلہ لیا۔ والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر میری طبیعت شاید ڈاکٹری کے لیے موزوں نہیں تھی۔ جب لیبارٹری میں لڑکے مینڈک وغیرہ کی

Disection کرر ہے ہوتے تو میں غزل لکھ رہا ہوتا تھا۔

س: تعلیمی سلسلہ پھر آگے کیسے بڑھا؟

ج: آرٹس کی تعلیم کی طرف آ گیا تھا۔ ایف اے میں میں نے سکالرشپ حاصل کیا۔ بی اے میں سلور میڈل لیا اور زمیندار کالج گجرات سے گریجوایشن کے بعد میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ سکول کنجاہ میں تھا۔ میری مشہور نظم ''ماں'' گجرات کے قریبی علاقے کنجاہ میں تدریسی زمانے کی یادگار ہے۔ یہ وہاں ہی لکھی گئی تھی۔ دو سال پڑھانے کے بعد میں لاہور آ گیا۔ اورینٹل کالج میں M.A میں داخلہ حاصل کیا اور ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ میری پنجاب میں پہلی پوزیشن تھی۔ اس کے بعد میں نے گورنمنٹ سروس جوائن کر لی۔

س: آپ فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ تدریسی زمانہ کیسا گزرا؟ فارسی سے آپ کے خاص لگاؤ کی وجہ کیا ہے؟

ج: فارسی تو ہمارے گھر کی روایت بھی ہے۔ یوں کہ میری بیوی بھی فارسی پڑھاتی تھی، میں نے بھی فارسی پڑھائی اور اب میری بیٹی بھی کالج میں فارسی پڑھا رہی ہے۔ تدریسی زندگی بڑی بھرپور رہی۔ کئی شہروں میں پڑھایا، ڈیرہ غازی خان، بہاولنگر، پنڈی گھیپ، گجر خان، راول پنڈی، مری میں بھی پڑھاتا رہا۔ اسی دوران ۱۹۷۶ء میں چالیس اساتذہ کے وفد کے ہمراہ چار مہینے کے لیے ایران کے سرکاری دورے پر گیا۔ مجھے اس وفد کی سربراہی کرنے کا موقع بھی ملا۔

س: آپ نے اپنی بیگم اور بیٹی کا تذکرہ کیا۔ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں گے؟

ج: میرے تین بیٹے اور دو بچیاں ہیں۔ سب شادی شدہ ہیں۔ ایک بیٹا لاہور میں عمار مسعود دنیا ٹی وی میں ملازم ہے جس نے پی ٹی وی کا مقبول پروگرام ''رات گئے'' شروع کیا تھا۔ اُس نے ایک نابینا لڑکی سے شادی کی تھی اب تو وہ بے چاری فوت ہو گئی ہے۔ باقی چاروں بچے یہاں اسلام آباد میں ہی رہتے ہیں۔

س ادب کی ترویج وترقی کے لیے قائم اداروں کی کارکردگی سے آپ مطمئن ہیں؟

ج کارکردگی ٹھیک ہی ہے۔اپنی سطح پر وہ کوشش کر رہے ہیں۔بعض لوگوں کو شکایات بھی ہیں۔ ہر چیز سے ہر کوئی تو مطمئن نہیں ہو سکتا۔ مجھے ذاتی طور پر تو کوئی شکایت نہیں ہے۔میری پہلی کتاب ''میلہ اکھیاں دا'' پر مجھے پاکستان رائٹر گلڈ کی طرف سے انعام ملا۔ پھر اکادمی ادبیات نے مجھے میری کتاب ''ہن کیہہ کریے؟'' پر ایوارڈ دیا۔ مجھے صدارتی ایوارڈ بھی ملا ہے۔میری نظر میں تو یہ ادارے اپنا کام دستیاب وسائل میں بخوبی انجام دے رہے ہیں۔سب کو مطمئن کرنا تو ممکن بھی نہیں ہے۔

س کیا ادیب کا سیاست میں بھی کوئی کردار ہونا چاہیے؟

ج ادیب جس ماحول میں رہتا ہے اُس سے جدا نہیں ہو سکتا۔سماجیات اور سیاست سے الگ ہونا ممکن ہی نہیں اور نہ ہی یہ مستحسن عمل ہے۔کیا علامہ اقبالؒ نے مسلم لیگ میں حصہ نہیں لیا تھا؟ کیا قائداعظم کے ساتھ اُن کا مکمل تعاون نہیں تھا؟ علامہ اقبال نے تو نہ صرف مقامی سیاست میں حصہ لیا بلکہ عالمی سیاست پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔اقوامِ متحدہ کی والدہ لیگ آف نیشنز کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ کفن چوروں کا ٹولہ ہے۔جس ماحول میں ادیب رہتا ہے اس کی سماجیات وسیاسیات سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔میرے خیال میں شاعری وہ جو نیکی کے ساتھ دلچسپی پیدا کرے اور برائی کے ساتھ نفرت دلائے۔یہ فرض تو میں اپنی حد تک ادا کرتا رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

س آپ نہیں سمجھتے کہ جب سے پرائیویٹ ٹی وی چینلز کا چرچا ہوا ہے ادبی سرگرمیوں کی کوریج دب سی گئی ہے؟

ج میں تائید کرتا ہوں آپ کے خیال کی۔ادبی کارروائیاں ہمارے ٹی وی چینل پر کم ہوگئی ہیں۔ کمرشلزم ٹی وی پر چھایا ہوا ہے۔اب تو بس جب محرم آتا ہے تو ایک سلام کا مشاعرہ ہو جاتا ہے یا پھر عید میلادالنبیؐ پر نعتیہ مشاعرہ کر دیا جاتا ہے۔پہلے زمانے میں ادب کی ترویج تھی اب نہیں ہے۔ہاں اخبارات میں ادب کے متعلق مواد مل جاتا ہے۔جو اس کی

کو کسی حد تک پورا کر دیتا ہے۔

س قومی اخبار کے ادارتی صفحہ پر روزانہ آپ کا قطعہ چھپتا ہے۔ کبھی صحافت بھی کی ہے؟ کالم نگاری کے بارے میں کبھی نہیں سوچا؟

ج یہ سوال اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔ کئی شعرا کرام اچھے کالم نگار بھی ہیں۔ ان میں امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی بہت اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور انتہائی اچھے کالم نگار بھی ہیں۔ مگر میری طبیعت کچھ کالم نگاری کی طرف نہیں آئی۔ میں نے ایک دفعہ ایک جگہ لکھا تھا کہ میرے قطعہ کو ہی میرا کالم سمجھ لیجیے۔

س نوجوان ادیبوں کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج ان کو پیغام صرف یہ ہے کہ شعر و ادب لفظوں کا کھیل ہے۔ جب تک لفظ سے آگاہی نہ ہو تب تک معیاری شعر و ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ لفظوں میں پائی جانے والی موسیقیت اور معنویت کے ادراک کے بغیر لفظ کا مناسب استعمال نہیں آ سکتا۔ نوجوان نسل کی گرفت لفظ پر ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ لفظ کا فنکارانہ استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ نوجوان ادیبوں کو چاہیے کہ وہ سینئرز کو خوب پڑھیں میر تقی میر، مرزا غالب، فیض احمد فیض، مجید امجد سمیت تمام سینئرز ادیبوں کا بھرپور مطالعہ کریں۔

امجد اسلام امجد

بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا تعارف کروانا تکلف زائد محسوس ہوتا ہے جنہیں عاف عام میں سلیبرٹی کہا جاتا ہے، جو درحقیقت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوتی ہیں۔ امجد اسلام امجد شعروادب کا ایسا ہی ایک روشن ستارہ ہے۔ آپ ہمارے ملک کے ان چند گنے چنے خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنہیں کسی رسمی تعارف کی ضرورت نہیں۔ ان کے ساتھ پچھلے دنوں ڈیفنس لاہور میں ان کی رہائش گاہ پر شام کی چائے کے ساتھ ہونے والی گفتگو قارئین کے لئے من وعن پیش کی جارہی ہے۔

س شاعری سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ فقط نظموں پر مشتمل تھا حالانکہ آپ غزل کو بھی بھرپور کہتے ہیں۔ اردو شاعری کی روایت رہی ہے کہ نئے لکھاری اپنے فنی سفر کا آغاز غزل سے کرتے ہیں۔ آپ کے اس باغیانہ رویئے کی کوئی خاص وجہ تھی؟ اس وقت آپ کے ذہن میں کیا تھا جب آپ نے اس قدیم روایت سے بغاوت کی؟

ج آپ نے بالکل صحیح کہا۔ اصل میں غزل اردو ادب میں شاعری کی فطری صلاحیت رکھنے والے حضرات کا نیچرل ذریعہ اظہار ہے۔ آپ اس میں نیٹ پریکٹس کر سکتے ہیں، فری فار آل ہے۔ اس جیسی سہولتیں کسی اور صنف میں نہیں۔ غالباً میں نے بھی شاعری کا آغاز غزل سے ملتی جلتی صنف سے کیا تھا، لیکن ہوا کچھ یوں کہ جب میں یونیورسٹی کے سالوں میں تھا اور کہنا چاہئے کہ لوگ ہمارے نام سے آشنا ہوئے، اس دور میں کچھ نظمیں شائع ہوئیں جن کو بہت مقبولیت ملی۔ دوسری وجہ جب مڑ کر میں دیکھتا ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے نظم کی انتخاب کی وجہ میری فطرت کا بنیادی رجحان بھی تھا۔ میں فطری طور پر چیزوں کو Totality

میں دیکھتا ہوں۔ میرے ڈراموں میں بھی یہی چیز نظر آئے گی۔ آزاد نظم سے میں بہت بعد میں Hook ہوا۔ 1967ء میں میں نے پہلی آزاد نظم لکھی تھی۔ اس سے پہلے میں بھی یہی سمجھتا رہا کہ یہ کوئی بے وزن چیز ہے یا پھر آج کل جیسے نثری نظم ہے تو یہ اس ٹائپ کی کوئی چیز ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے شعور ہونا شروع ہوا کہ یہ اس طرح کی چیز نہیں ہے بلکہ ہماری فارمل (Formal) شاعری ہے جو کسی خاص بحر میں کی جاتی ہے۔

یہ اس طرح کی چیز ہے اور اسی کی Extended شکل ہے۔ میں کالج کے زمانے میں کرکٹ کھیلنے کا بہت شوقین تھا۔ انہی دنوں مجھے کسی نے بتایا کہ کوئی شاعر مجید امجد ہیں۔ انہوں نے کرکٹ سٹار فضل محمود پر ایک نظم لکھی ہے۔ میں نے کرکٹ کے حوالے سے اس نظم میں دلچسپی ظاہر کی کہ دیکھیں شاعر نے کیا لکھا ہے۔ اس نظم نے جس کا عنوان آٹوگراف تھا مجھے انگریزی محاورے کے مطابق خرید لیا۔

مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ شاعری میں اتنا ترنم ایسی مختلف صنف میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کہ نہ اس میں قافیے کی قید ہے نہ ردیف کی قید ہے۔ مگر مزہ قافیے اور ردیف سے بھی زیادہ آ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ Turning point تھا جب میں آزاد نظم کی طرف آ گیا۔ اس نے مجھے ایسا کیا کہا کہ میں نظم کا ہو کر رہ گیا۔ اس وقت جو میرے سینئرز تھے خاص طور پر احمد ندیم قاسمی صاحب ان کا مجھے بہت تعاون حاصل رہا۔ جب میری کتاب برزخ کی اشاعت کا وقت آیا۔ اس وقت تک میری بہت سی غزلیں چھپ چکی تھیں۔ ''فنون'' کے جریدے غزل نمبر اس کے آخری پورشن میں جدید ترین شعراء کے حصے میں پہلے نمبر پر میری غزلیں شائع کی تھیں لیکن میں نے خود سے سوال کیا کہ جو میرا اپنا نیچرل اظہار ہے، جس میں میری اپنی شخصیت جھلکتی ہے چونکہ غزل میں ایسے بڑے بڑے اساتذہ ہیں کہ آپ کو اپنی پہچان اور ناک نقشہ بناتے ہوئے اک عمر لگ جاتی ہے۔ چونکہ غزل میں مشق زیادہ ہے، غزل میں ہنر زیادہ ہے اور آرٹ پیچھے رہ جاتا ہے۔ نظم کے اندر مجھے یہ آسانی لگی کہ جو میرے اندر کا آرٹسٹ ہے اس کے لئے زیادہ گنجائش ہے۔ جب میری پہلی

کتاب چھپنے کے قریب آئی تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ یہ میرا بہت بولڈ فیصلہ تھا۔ بلکہ اس وقت کے بعض دوستوں کے نزدیک تو بہت احمقانہ فیصلہ تھا۔ اس زمانے میں غزل بہت ''ان'' تھی اور نظم میں راشد صاحب اور میرا جی اور فیض صاحب کا دور اپنے ''فیگ اینڈ'' پر تھا اور نئی نظم میں کوئی نیا نام اس وقت تک تھا ہی نہیں۔ اصغر گونڈوی کا ایک شعر ہے جو میں اکثر کوٹ کرتا ہوں۔ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے۔

تو میں نے ایک مشکل راستہ لیا اور پہلی کتاب میں کوئی غزل نہیں رکھی لیکن باقی سب کتابوں میں غزل بھی ساتھ ساتھ کہی۔

س ڈرامے کے حوالے سے سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ڈرامے ''وارث'' کو پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا ڈرامہ قرار دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب ویسے ڈرامے کیوں نہیں بن رہے؟ کیا آج کل کے ڈراموں میں وہ تخلیقی جوہر ہی نہیں ہے یا کہ کوئی اور وجہ ہے کہ عوام میں ویسی مقبولیت ان ڈراموں کی نہیں رہی ہے۔

ج اصل میں یہ بڑی الجھی ہوئی سی بات ہے۔ اس کا کوئی ایک جواب نہیں ہے اور جن عوامل کا آپ نے ذکر کیا وہ سب کسی نہ کسی حد تک ذمہ دار ہیں۔ 1964ء میں جب ٹی وی آیا تو ہمارے پاس پرفارمنگ آرٹ میں فلم تھی۔ تھیٹر تھا اور ریڈیو تھا۔ یہ تین شعبے تھے اور تینوں میں بوجوہ جو تخلیقی لوگ تھے یا بڑی اچھی اور نئی سوچ والے ان کے لئے ان میں گنجائش نہیں تھی یا کم گنجائش تھی۔ ٹی وی میں آیا تو ان میں تینوں جمع ہو گئے اور تینوں بیک وقت اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے۔ جس کے سبب ٹی وی ڈرامہ بہت جلد مقبول ہونا شروع ہو گیا۔ پھر یہ کہ ایک ہی چینل ہوتا تھا۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ چونکہ وہ نیشنل چینل تھا اس لئے ملک کے تمام شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کی نمائندگی کرے۔ امیر۔ غریب، کسان، شہری، دیہاتی ہوا یہ کہ ہمارے ڈراموں میں گلدستہ سا بننا شروع ہو گیا۔ جس میں ہماری پوری قومی زندگی کی جھلک نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں مڈل کلاس کا غلبہ رہا۔ آؤٹ ڈور کے لئے وسائل نہیں تھے اور Set designing کی اتنی امپورٹینٹ نہیں ہوتی تھی۔ تو زیادہ تر

ڈرامے گھروں میں، ڈرائنگ روموں میں، جیسا کہ حسینہ معین نے بہت اچھا ڈرامہ اس زمانہ میں لکھا، مگر وہ سارے کے سارے شہری مڈل کلاس کے گرد گھومتے تھے۔ مگر باہر اور خاص طور پر دیہاتی زندگی کی طرف تو بالکل بھی نہیں جاتا تھا۔ منو بھائی کے ''جھول سیال'' اور اکا دکا دوسرے ڈراموں کو چھوڑ کر ''وارث'' سے پہلے آپ کو بہت کم گاؤں کی زندگی project ہوتی نظر آئے گی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ساٹھ ستر فیصد خاموش اکثریت جسے پچھلے دس بارہ سال میں ٹیلی ویژن پر ڈرامے کی مقبولیت کے باوجود جگہ نہیں ملی تو ایک تو وہ اس میں انوالو ہوئی۔ دوسرا یہ کہ ان کے مسائل جو باقی تیس چالیس فیصد ہیں ان لوگوں کے لئے بھی ایک نیا انکشاف تھے کہ اچھا ہمارے ہی ملک میں لوگ اس طرح سے بھی رہتے ہیں اور یہ جو وڈیرے جو کہ شہروں میں پارٹیوں میں یا کہیں ڈسٹ نظر آتے ہیں کیا وہ اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں؟ پھر اس میں ایکٹنگ بہت اعلیٰ ہوئی۔ اس سے قطع نظر کہ یوں کہتے ہیں کہ وہ لکھا ہی بہت اچھا تھا یقیناً میں نے لکھا بھی اچھا ہوگا۔ ٹی وی کی تاریخ رہی تھی کہ ہر ڈرامے میں دو تین کردار ہی بہت ہوتے ہیں۔ یہ واحد ڈرامہ تھا جس میں چھ سات کردار بہت ہٹ ہوئے تھے۔ یعنی لوگ چودھری حشمت کو تو دیکھنا چاہتے ہی تھے مگر وہ پانیاز، چودھری انوار، دلاور، مولا داد، عظمیٰ گیلانی، طاہر نقوی اور ثمینہ احمد کو بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر جیسا میں نے کہا اس زمانے میں معاشرے کے ہر طبقے کو نمائندگی کرنی تھی۔ پی ٹی وی کا دور جب ختم ہوا اور پرائیویٹ چینل آئے تو ان چینلز کی آمد سے یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی چیز ٹی وی پر چلنی چاہئے، یہ فیصلہ غلط لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ غلط لوگ اس سینس میں یہ ایڈورٹائزر کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اب ایڈورٹائزر جو ہے وہ اپنے کام کو تو یقیناً اچھی طرح جانتا ہے مگر اس کام کو وہ کیسے جان سکتا ہے کہ ڈرامے کا مرکزی خیال کیا ہونا چاہئے۔ فنکاروں کے کردار کیا ہونے چاہئیں۔ ہوا یہ کہ ایڈورٹائزر نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھے فلاں اداکار چاہئیں۔ اب اس سے پہلے ٹی وی کریکٹر کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا۔ اب ایکٹر کے حوالے سے دیکھا جانے لگا۔ پھر یہ ہونے لگا کہ مجھے اس معاشی طبقے کی کہانی

چاہئے پھر یہ کہ عورتوں پر جو ظلم ہے یہ اگر دکھائیں تو گھروں میں بیٹھی ہوئی عورتیں متاثر ہوتی ہیں اور اس سے ریٹنگ بڑھتی ہے۔ اب مڑتے مڑتے وہ ڈرامہ جو پورے معاشرے کو دکھایا کرتا تھا اب صرف مخصوص طبقے کو دکھانے لگا اور پھر سارا ہی ڈرامہ ان کے گرد گھومنے لگا۔ تو اس سے آہستہ آہستہ جو ڈرامے کی یونیورسل اپیل تھی وہ متاثر ہوتی ہے لیکن یہ کہنا تھوڑی زیادتی ہوگی کہ یہ جتنا ڈرامہ پچھلے پندرہ بیس سال میں بنا یہ سارے کا سارا بڑا فضول اور بے معنی تھا ایسا نہیں ہے۔ کئی نئے پروڈکشن ہاؤسز اور اچھے مصنف و اداکار آئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جو پی ٹی وی کی روایت تھی اور کولیکٹر نئے ٹرینڈز کا ایک بلینڈ بناتے تو وہ یقین لوگوں کے دل و دماغ میں اپنا گھر ضرور بناتے۔ پرابلم یہ ہے کہ ڈرامے بنتے ہیں، چلتے ہیں اور لوگ دیکھتے بھی ہیں مگر ایک ہفتے کے بعد کسی کو نہ اس کی کہانی یاد رہتی ہے نہ کردار۔ سوسائٹی کے سبھی شعبوں کی نمائندگی ہونی چاہئے۔ اب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا ڈرامہ ہے جسے سب لوگ دیکھنے پر مجبور ہیں۔

س ہمارے معاشرے کا تو بڑا حصہ اور اس کے مسائل تو ٹی وی پر نظر ہی نہیں آتے۔ کیا لوگوں کی غالب اکثریت ٹی وی ڈرامے کے لئے غیر متعلق نہیں ہے؟

ج میں سمجھتا ہوں آپ کے سوال کا بنیادی جواب یہی ہے۔

س آپ کے گیت بھی بہت مقبول ہوئے، آپ کے گیت پاکستان کے زندہ گیتوں میں سے ہیں۔ گیت نگاری کا تجربہ کیسا رہا؟

ج اصل میں گیت نگاری ہماری شاعری کا حصہ تو شروع سے رہی ہے لیکن پاکستان بننے سے قبل گیتوں پر پابندی الفاظ کا غلبہ رہا۔ بنیادی طور پر تو یہ گیت کی صنف بھی ہندی سے آئی ہے، اس لئے یہ غلبہ بھی درست تھا لیکن پھر آرزو لکھنوی کے زمانے سے لے کر ساحر لدھیانوی آئے اور قتیل شفائی۔ تنویر نقوی تو ان لوگوں نے آ کر ایک ایسی فرہنگ رائج کی جو اردو سے زیادہ قریب تھی۔ میں نے دراصل گیت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے لکھنے شروع کئے تھے۔ شروع شروع میں جب ہم شاعر بننے کی کوشش کر رہے تھے تو سب سے آسان

رستہ یہی تھا کہ آپ کا کوئی گیت ہٹ ہو جائے۔ پھر میں نے ٹی وی پر بچوں کے لئے بہت گیت لکھے۔ ''ہم کلیاں ہم تارے ہیں''، خلیل احمد کے ساتھ میں نے بہت گیت لکھے۔ اب میری تین گیتوں کی کتابیں ہیں۔ ان میں خاص بات یہ ہے کہ ہر ایک میں سپنے کا لفظ ''آنکھوں میں تیرے سپنے'' ''سپنے بات نہیں کرتے'' ''سپنے کیسے بات کریں'' اور پھر ان کا جو کلیات چھپا ہے وہ بھی ''سپنوں سے بھری باتیں'' گیتوں میں خوشابی تو ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ تمام موضوعات پر گیت لکھے ہیں۔ غنائیت چونکہ گیت کا بنیادی حصہ ہے اس لئے میں اب بھی گیت لکھتا رہتا ہوں۔ فلموں کے لئے بھی لکھا لیکن بہت کم۔ کچھ ہندوستانی فلموں کے گیت بھی لکھے ہیں لیکن زیادہ تر پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو۔

س کتاب کے زوال کے متعلق سوال ہے کہ ہمارے ہاں کتابیں کم تعداد میں شائع ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ بکتی ہیں۔ مغرب میں لاکھوں کی تعداد میں کتاب شائع ہوتی ہے اور ہمارے ہاں ہزار یا پانچ سو کی تعداد میں ایڈیشن چھپتا ہے۔ اس میں بھی جو مقبول مصنفین ہیں کیا اس کی وجہ ادب سے معاشرے کی دوری ہے یا پھر آن لائن مفت ڈاؤن لوڈ یا پھر ایس ایم ایس وغیرہ کی وجہ سے لوگ مفت چیزیں پڑھ لیتے اور کتابیں خریدتے ہیں۔ آپ کس نظر سے اس صورت حال کو دیکھتے ہیں؟

ج ان ساری چیزوں نے مل کر یہ یہ صورت حال پیدا کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ تھی۔ تقسیم سے پہلے بھی اردو شاعری کی کتاب کا ایڈیشن ایک ہزار کتاب کا ہی چھپتا تھا۔ یہ جو ہمارے بڑے بڑے استاد شعراء اکرام ہیں، ان کی کتابیں بھی بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک زبان اتنے زیادہ لوگ جانتے ہوں اور پھر بھی یہ صورت حال ہو، حالانکہ اس وقت تو ادب سے دلچسپی بھی تھی۔ آہستہ آہستہ ہمارے نظام تعلیم کی وجہ سے بچوں کے اندر پڑھنے کی عادت ختم ہوتی چلی گئی۔ فنون جو ہیں وہ علوم پر حاوی ہونا شروع ہو گئے۔ پھر انگلش میڈیم نے آ کر رہی سہی کسر پوری کر دی۔ جن لوگوں میں کتاب خریدنے کی استطاعت تھی وہ سارے کے سارے ادھر چلے گئے۔ اس پر مستزاد

یہ ٹیکنالوجی کی طرف آپ نے اشارہ کیا۔لائبریری کلچر ختم ہونے لگا۔بچے کو اردو پڑھنے کی عادت ہی نہیں ڈالی جاتی اور جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اس میں یہ عادت Develop نہیں ہوتی۔باقی رہی شعروشاعری کی بات تو شعروشاعری پہلے بھی کم ہی لوگ پڑھتے تھے۔زیادہ تر یہ سننے کی چیز ہے۔اب اگر آپ اپنی پسندیدہ چیز پڑھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے کتاب خریدنا ضروری نہیں رہا۔آپ کے پاس دس اور طریقے ہیں جس سے آپ وہ چیز پڑھ سکتے ہیں۔اس میں سنگ دلی ہماری حکومتوں کی بھی ہے کہ سب سے زیادہ ٹیکس کاغذ اور پرنٹنگ کے میٹریل پر ہیں۔کتاب ہم نے مہنگی کر دی اور پڑھنے کی عادت ختم کر دی۔میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی اگر سکولوں کی سطح پر بزم ادب کے پیریڈ، لائبریری کے پیریڈ وغیرہ بحال کیے جائیں تو بچوں کی اس سے ایک بنیاد بن جائے گی۔پھر وہ ادب کے ساتھ ساتھ زندگی بھر کتاب سے منسلک رہیں گے۔مگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر مجھے اس سے بھی تاریک تر مستقبل نظر آتا ہے۔اردو شاعری ادب اور اس کی کتابوں کا۔

س اپنی نئی آنے والی کتابوں کے متعلق ہمیں کچھ بتائیں؟

ج اصل میں جیسا آپ کے علم میں ہے زیادہ تر میری کتابیں شاعری اور ڈرامے کی ہیں۔اب ماشاءاللہ کالموں کی بھی آٹھ نو کتابیں ہوگئی ہیں اور سفرنامے بھی چار شائع ہو چکے ہیں۔تراجم کی تین کتابیں ہیں۔

میرے تعزیتی کالم ''کوئی دن اور'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور شاعری کی کتاب ''شام سرائے'' ابھی پچھلے برس شائع ہوئی ہے۔اسی طرح ڈراموں کا مجموعہ ''خواب جاگتے ہیں'' وہ بھی انہی دنوں شائع ہوا ہے۔بہت سی کتابیں پائپ لائن میں ہیں اور مجھے امید ہے کہ آئندہ ایک دو برس میں کوئی چار پانچ کتابیں اور آئیں گی۔

س نیا ڈرامہ بھی کوئی لکھ رہے ہیں؟

ج ہمیں فیڈ بیک اس حوالے سے بھی لینی چاہئے کہ کون سی چیز کتنے لوگوں تک پہنچتی ہے۔پھر ان کی اوسط فیڈ بیک سے پتہ چلتا ہے کہ ڈرامہ ایسی چیز ہے جو لاکھوں بلکہ کروڑوں

لوگ دیکھتے ہیں۔شاعری ایک مختلف چیز ہے،میرا نہیں خیال کہ کوئی چار پانچ لاکھ سے زیادہ لوگ ملا جلا کر پڑھتے ہیں۔شاعری کی فیڈ بیک ہمیں کئی چار پانچ لاکھ لوگوں سے لینی چاہئے۔اگر ہم جنرل کریں گے تو......!

تو پھر معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ڈرامہ میں نے پچھلے آٹھ دس سال سے لکھا ہی نہیں۔ سوائے ایک ایئرفورس کے متعلق۔"شیر دل" کے ڈرامہ لکھنا تو میں نے بند ہی کیا ہوا ہے۔ اب میں شاید لکھوں گا۔کیونکہ اب یہ احساس پیدا ہوا کہ ایک دائرے کے ڈراموں سے انہوں نے بہت سارے ناظرین کھو دیئے ہیں اور اب لوگ اس طرح کے ڈرامے نہیں دیکھنا چاہتے اور بیزار ہیں۔اب کچھ لوگ واپس آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارا اسی اور نوے کی دہائی کا کلاسیکی ڈرامہ۔

صرف میں ہی نہیں منو بھائی نہیں لکھ رہا۔حسینہ معین اور بانو قدسیہ نہیں لکھ رہیں۔ یونس جاوید نہیں لکھ رہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب تھوڑی سی جگہ بنی ہے اور میں بھی ایک ڈرامہ سیریل لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔

اسلم کولسری

موجودہ دور میں مشاعرہ ڈرامہ بنتا جا رہا ہے۔ جدت اور ندرت اچھی بات ہے لیکن تجربات مسلمہ حدود میں رہتے ہوئے کرنے ہوں گے۔ یہ بات نامور شاعر اور کالم نگار اسلم کولسری نے ارژنگ کے ساتھ ایک انٹرویو میں کہی۔ مزید گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دیباچے اور فلیپ نگاری میں تنقید کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں صاحب کتاب کا تعارف اور کتاب کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔

س شاعری کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟

ج میٹرک کے بعد جب گاؤں سے اوکاڑہ آیا تو جہاں میں رہتا تھا وہاں قریب ہی کالج کے چند طالب علم بھی رہتے تھے۔ انہی میں سید ناصر بھی تھے۔ میں ان دنوں پرائیویٹ کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔ سید ناصر سے میری دوستی کالج مشاعروں میں حصہ لینے تک تھی۔ وہ غزل کہتے تھے میں ان کی غزل میں کبھی رائے دیا کرتا تھا۔ انہی دنوں ستلج کاٹن ملز میں مشاعرہ ہوا۔ صدارت ڈپٹی کمشنر ساہیوال نے کی۔ مہمان خصوصی ناصر شہزاد تھے۔ سید ناصر جمعے کو میرے پاس آئے کہ مشاعرے میں شرکت کرنی ہے اور میرا نام بطور شاعر دے دیا ہے۔ میں نے پریشان ہو کر کہا میں نے کبھی شعر کہا نہیں۔ سید ناصر نے بہت اصرار کیا تو میں نے غزل کہنے کی کوشش کی۔ اس طرح میں نے اپنا پہلا باقاعدہ شعر یہ کہا:

سوئے مقتل چل رہے ہیں پھر بھی محوِ رقص ہیں
ساز سے کچھ کم نہیں زنجیر کی جھنکار بھی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

ہم بھی تنکے چُن رہے ہیں آشیانے کے لئے
گو نظر آتے ہیں اب طوفان کے آثار بھی

پہلی بار جب سٹیج پر گیا تو ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن سامعین کی حوصلہ افزائی پر دوسرے شعر کے بعد سنبھل گیا۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ اوکاڑہ میں پندرہ روزہ ادبی نشست ہوتی تھی۔ وہاں راؤ جمشید علی خاں لے گئے۔ جہاں اینج غلام صادق اور محمد اقبال، راؤ تحسین، سیف اللہ صاحب اور کچھ اور دوست کافی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اسی طرح وہاں پروفیسر ممتاز محی الدین صاحب بھی تھے۔ ان کے ہاں محفل ہوتی تھی جس میں اسلم نجمی، انور چودھری، یونس خان اور دوسرے دوست شریک ہوتے تھے۔ وہاں یہ شاعری پروان چڑھتی رہی۔ اس کے بعد ٹیچنگ چھوڑ کر عرفان فارمیسی میں آ گیا۔ جہاں ایڈووکیٹ حفیظ جاوید مرحوم۔ ڈاکٹر ضیاء الحق، ڈاکٹر سید خالد جو آج کل ارجنٹائن میں پاکستان کے سفیر ہیں۔ منور جاوید اور صوفی عبدالباری صاحب جو خود بھی شاعر تھے وہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ میں نے اپنی پہلی غزل اوراق کو بھیجی۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے واپس کر دی۔ تب تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن بعد میں غور کرتا رہا، ذہن اس طرف آمادہ ہو گیا۔ اس کے بعد شاعری کا رنگ بدلا اور غزل سامنے آئی جس کے دو شعر دوستوں نے پسند کئے۔

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا
میں نے اپنے سارے آنسو بخش دیئے
بچے نے تو ایک ہی پیسہ مانگا تھا

اس کے بعد اقبال صلاح الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑی شفقت اور مہربانی کا ثبوت دیا اور مجھے مجموعہ کلام ترتیب دینے پر آمادہ کیا۔ مجموعے کی ترتیب و تزئین میں پروفیسر ابو اعجاز اور حفیظ صدیق نے بہت معاونت کی۔ اس طرح اقبال صلاح الدین صاحب کی توسط سے میرا پہلا مجموعہ "نخلِ جاں" کے نام سے سامنے آیا۔ 1981ء میں لاہور آ گیا۔ یہاں مکتبہ تعمیر انسانیت کے سعید اللہ صدیق صاحب سے سعد اللہ شاہ

صاحب نے متعارف کرایا۔ سعید صاحب بہت مہربان ثابت ہوئے۔ میرے باقی مجموعے انہوں نے ہی شائع کیے ہیں۔

س اب تک آپ کے کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ج اب تک میرے سات شعری مجموعے آ چکے ہیں۔ ان میں چھ اردو اور ایک پنجابی میں ہے جن کے نام بالترتیب یوں ہیں۔

نخلِ جاں، کاش، ویرانہ، پنچھی (پنجابی) نیند، جیون اور برسات۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد اکرم چغتائی کے توسط سے آسٹریا کی جدید شاعری کا ترجمہ کیا ہے جو ''ایک نظر کافی ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ نثر کی کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لیکن روزنامہ مشرق میں ''روشنیوں سے دور'' کے عنوان سے کالم لکھتا رہا ہوں۔

س کبھی ٹی وی ڈرامے، فلمی کہانیاں یا گیت وغیرہ لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

ج سوچتا تو ہوں لیکن یہ فلم اور ٹی وی کا راستہ مجھے بہت دشوار نظر آتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے کا جو ایک خاص انداز ہے وہ مجھے نہیں آتا۔ کبھی اتفاق ہوا تو ضرور کوشش کروں گا۔ جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے تو ریڈیو، ٹیلی ویژن کے لئے میں نے گیت لکھے ہیں لیکن فلم سے رابطے کا اتفاق نہیں ہوا۔ موقع ملا تو ضرور لکھوں گا بلکہ میری خواہش ہے کہ کوئی اچھی ٹیم ملے تو میں فلم کے گیت اور کہانی لکھوں۔

س اب تک آپ کو کسی کتاب پر ایوارڈ ملا اور اگر نہیں تو اس کی وجہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

ج ابھی تک مجھے کسی کتاب پر ایوارڈ نہیں ملا۔ شاید اس لئے کہ ان میں سے کوئی کتاب ایوارڈ کے قابل نہیں ہوگی۔

س ہمارے ناقدین ادب انصاف سے کام لیتے ہیں؟

ج میرے خیال میں تو انصاف سے کام لیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہماری فطرت میں وضع داری بھی ہے۔ اس لئے لحاظ سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

س دیباچے اور فلیپ نگاری میں تنقید کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ اس میں صرف کتاب کی خوبیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں مثبت رائے ہی بھلی لگتی

ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی کتاب کا دیباچہ نگار یہ لکھے کہ کتاب پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔

س موجودہ دور میں مشاعروں کا کیا کردار رہ گیا ہے۔

ج مشاعرے ہونے چاہئیں تاکہ سامعین اور ناظرین کو تھیٹر ڈرامے اور کھیل کے علاوہ بھی کچھ تو میسر ہو۔ حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ دوسری تینوں چیزیں تھیٹر، ڈرامہ اور کھیل اس قدر غائب ہوگئے ہیں کہ مشاعروں میں سامعین تھیٹریکل موڈ لے کر آتے ہیں اور زیادہ تر ہوٹنگ انجوائے کرتے ہیں لیکن یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے اور بہتری کی امید رکھنی چاہئے۔ بیرون ملک مشاعروں کی فضا نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے پردیسیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ وطن سے آنے والوں کو سننے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک خالص دیسی تقریب ہوتی ہے جسے وہ پردیس میں خوب انجوائے کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ مشاعروں میں جو سیکھنے اور سکھانے کی روایت تھی، باقی ہے یا نہیں۔ تو میں کہوں گا کہ مشاعرے کی روح اب سامعین کے دل و دماغ میں نہیں ہوتی نہ ان کا مقصد کوئی سیکھنے کا ہوتا ہے۔ وہ صرف ہوٹنگ کرنے آتے ہیں۔

س کسی شاعر کی کامیابی کا معیار مشاعروں میں اس کی مقبولیت کو قرار دیا جاسکتا ہے؟

ج مشاعروں میں وہ لوگ بھی جاتے ہیں جو کسی اور حوالے سے مقبول ہوتے ہیں۔ یہاں میں ایک واقعہ بیان کروں گا۔ قطر کے ایک مشاعرے میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو بہت داد ملی۔ مشاعرے کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں ادبی ایڈیشنوں کی وجہ سے مشاعروں میں بلایا جاتا ہے۔ ایسا نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ لوگوں نے مجھے کتنی محبت سے سنا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ مختلف حوالوں سے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ کسی کو میری کالم نگاری پسند ہے کسی کو میرے ڈرامے اچھے لگتے ہیں۔ اسی طرح وہ میری شاعری کو بھی پسند کرتے ہیں۔

س جدت پسندی کے نام پر ہمارے ہاں ادب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے مطمئن ہیں؟

ج جدت اور ندرت اچھی بات ہے لیکن ہمارے سارے تجربات مسلمہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی کرنے ہوں گے، تبھی وہ مقبول ہوں گے۔ جدت کے نام پر غزل میں

ردیف کو پہلے، قافیہ کو درمیان میں رکھ دینا اس سے بات نہیں بنے گی۔

س ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب میں سے کس پر یقین رکھتے ہیں؟

ج دونوں ضروری ہیں۔ ادب برائے اصلاح بھی اور ادب برائے ادب بھی۔ مگر ان میں تناسب ہونا ضروری ہے۔ ادب برائے ادب بھی ادب برائے زندگی ہے۔

س ہم عصر شعراء میں کون کون پسند ہے؟

ج سبھی پسند ہیں اور سبھی بہت اچھا شعر کہتے ہیں۔ بزرگ بھی حق ادا کر رہے ہیں اور نوجوان بھی حیران کر رہے ہیں۔ ان میں میں شامل نہیں ہوں۔

س نامور ادیب ظفر اقبال کا تعلق بھی آپ کے شہر اوکاڑہ سے ہے۔ آپ ان کو بطور شاعر معتبر سمجھتے ہیں یا بطور کالم نگار؟

ج میں تو ظفر اقبال کو بطور شاعر زیادہ معتبر سمجھتا ہوں لیکن ان کی کالم نگاری بھی اچھی ہے۔ جس طرح انہوں نے شاعری میں نئی سمتیں روشن کی ہیں وہی کوشش وہ کالم نگاری میں بھی کرتے ہیں لیکن اہمیت ان کی شاعری کو ہی حاصل ہے۔

س کس صنف ادب میں لکھتے ہوئے آسانی محسوس کرتے ہیں؟

ج یوں تو سب کچھ لکھتے ہوئے آسانی محسوس کرتا ہوں تاہم میں نے تیر کسی فن میں بھی نہیں مارا۔ اپنی سی جو کوشش کرتا ہوں وہ اگرچہ ناکام ہوتی ہے لیکن میرے لئے وہ دشوار نہیں ہوتی اور یہ آسانی خدا تعالیٰ کی عطا ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ ناکامی البتہ اپنی محنت سے حاصل کرتا ہوں۔

س شعر کیوں کہتے ہیں؟

ج قدرت نے یہ صلاحیت عطا کی، بعد میں ایسا ماحول ملا کہ میں شعر گوئی کی طرف مائل ہوتا گیا، یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔

س اگر یہ خداداد صلاحیت ہے تو پھر سینئر، جونیئر کا جھگڑا کیسا؟

ج دیکھیں صلاحیت بھی تو کم یا زیادہ ہو سکتی ہے اور پھر اس میں انسان کی محنت اور ریاضت اس درجہ بندی کا باعث بنتی ہے۔

س شاعری میں ''محنت اور ریاضت'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت کریں گے؟

ج میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں۔ بعض اوقات شعر کہنے کا موڈ ہوتا ہے۔ اسی دوران میں کوئی کام یا مجبوری سامنے آجاتی ہے۔ میں شاعری کے موڈ کا بیڑہ غرق کر کے اس کام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ یہ میری غفلت ہے یا بے نیازی ہے۔ اگر ایسی کیفیت میں میں کام کو خواہ کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو نظر انداز کر کے اپنی کیفیت سے استفادہ کروں اور شاعری یا ذہن میں آئی ہوئی غزل کو مکمل کروں تو اسے محنت کہیں گے۔ میں ایک مدت سے ایسی کیفیت کو ہوا میں اڑا رہا ہوں، سو محنت نہیں کر رہا ہوں۔ جہاں تک ''ریاضت'' کا تعلق ہے اس میں مطالعہ شامل ہے۔ علم عروض پر مکمل دسترس حاصل کرنے کی کوشش شامل ہے۔ اور میرے مرحوم دوست حسن رضا خان کا مشورہ شامل ہے کہ روزانہ شاعری کرو۔ بے شک وہ غزلیں پھاڑتے چلے جاؤ۔ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی آپ ایسی غزل کہنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے جس سے آپ مطمئن ہوں گے۔

س اور ان شعراء کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو روزانہ اس ریاضت سے تو گزرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ اب تک لاتعداد مجموعوں کے مصنف ہیں۔ مگر ان کی شاعری سے نہ تو قاری مطمئن ہے اور غالباً نہ وہ خود بھی مطمئن ہیں؟

ج اگر وہ خود مطمئن نہ ہوتے تو کبھی بھی مجموعے شائع نہ کرتے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں ان سے کہیں زیادہ انہوں نے انتخاب کرتے وقت ضائع کر دیے ہوں۔

س غالباً آپ طنز کر رہے ہیں؟

ج (مسکراتے ہوئے) ہرگز نہیں۔

س اب تک آپ کے جتنے بھی انٹرویوز چھپے ہیں ان میں آپ نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ایسا مزاجاً کرتے ہیں یا احتیاط؟

ج زیادہ مزاجاً کم کم احتیاطاً۔

س اس احتیاط کو ہم "بزدلی" بھی کہہ سکتے ہیں؟

ج ضرور۔

س بے شک آخرت میں اس کا حساب دینا پڑے؟

ج اللہ معاف کرنے والا ہے۔

س گویا آپ ایسے شعراء کے حوالے سے ڈنڈی مارنے کا اعتراف کر رہے ہیں؟

ج اب مجھے تھوڑی سی وضاحت کرنی پڑے گی۔ دیکھیں ایک تو میری طبیعت میں لڑائی جھگڑا نہیں۔ دوسرا مجھے اس کا تجربہ بھی نہیں اور تیسری بات اگر آپ غور کریں جس شخص نے آپ کو دکھ پہنچایا ہے اس نے کبھی نہ کبھی آپ کو سکھ بھی پہنچایا ہوگا۔ میں ارادتاً ان خوشگوار لمحوں کو اپنے ذہن میں ہمیشہ زندہ رکھتا ہوں۔ اس طرح دکھ کی اذیت کم ہو جاتی ہے اور میں اس سطح پر نہیں آتا کہ لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاؤں۔ اس کیفیت کو میں نے ایک شعر میں بھی بیان کیا ہے۔

بہ صورت ستم سہنا کسے مرغوب ہے لیکن
کوئی احسان کر دیتے وہ بیداد سے پہلے

س کیا شاعری میں بسیار گوئی شاعری کے معیار پر اثر انداز نہیں ہوتی؟

ج نہیں میرے بھائی اچھا شاعر جتنا بھی زیادہ لکھے، اچھا لگے گا۔ جیسے مولانا روم اور علامہ اقبال اور کئی دوسرے شعراء کرام اور کم تر صلاحیت والا شاعری ساری زندگی میں تین بھی شعر کہتے تو تینوں بیکار ہوں گے۔

س یہاں "کئی دوسرے شعراء" سے آپ کا اشارہ کن کی طرف ہے؟

ج میں نے مولانا روم اور علامہ اقبال کا ذکر کر کے ان شعراء کی جانب اشارہ کر دیا ہے جو اس سطح کے ہیں۔

س کبھی نثر لکھنے کا خیال آیا؟

ج میں نے لکھنے کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا اور ایک انتہائی دردناک افسانہ لکھا۔ دردناک پر واوین لگا لیجئے۔ اس وقت میرے واحد سامع اور میرے دوست سید ناصر تھے۔

ان کو سنایا تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ یاد رہے کہ انتہائی دردناک افسانہ تھا۔ چنانچہ میں نے افسانے کے اس دردناک انجام پر کانوں کو ہاتھ لگالیا۔ شاعری کے سلسلے میں ایسا نہ ہوسکا بلکہ شاعری پر مجھے انہوں نے ہی اکسایا تھا اور پہلی غزل پر خوب داد دی تھی لیکن سنجیدگی کے ساتھ۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ روزنامہ مشرق میں رہتے ہوئے کالم نگاری کی کوشش کی۔ کچھ لکھے وہ ''اینویں'' سے تھے۔ آج کل تو شاعری بھی بہت کم کم ہو رہی ہے۔

س اب تک آپ کے کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج اب تک میرے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک پنجابی شعری مجموعہ ہے اور باقی سات اردو مجموعے ہیں۔

س آٹھ مجموعوں کی اشاعت کے باوجود آج تک آپ نے کسی مجموعے کی تقریب رونمائی نہیں کی۔ خبر سننے میں نہیں آئی۔ حالانکہ آپ کے دوستوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہے؟

ج میں جب اوکاڑہ میں تھا تب میری پہلی کتاب ''نخلِ جاں'' شائع ہوئی تھی۔ اس کی تقریب لاہور میں ہوئی تھی اور اس کا اہتمام نعیم اظہر مرحوم، انور قمر اور یوسف مثالی نے کیا تھا۔ پھر میں لاہور آ گیا۔ باقی کتابوں کی تقریب رونمائی نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھے اس کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ ہاں البتہ پچھلے دنوں خبریں اور ادبی تنظیم ''روش'' کے زیر اہتمام میرے ساتھ ایک تقریب ہوئی۔ جس کا اہتمام ممتاز نوجوان شاعر ثناءاللہ شاہ نے کیا۔ بلکہ انہوں نے مجھے اس تقریب کے لئے مجبور کیا اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے پر خلوص کوششیں کیں اور آپ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ روزنامہ ''خبریں'' کے طاہر انجم اور عفت علوی نے اس تقریب کو کامیاب بنانے میں انتہائی جدوجہد کی۔

س اس تقریب میں ملک کے ممتاز نقاد خواجہ زکریا نے آپ کو عصر حاضر کے دس بہترین شعراء میں شمار کیا۔ آپ کے خیال میں باقی نو کون سے ہیں؟

ج اصل میں جب کسی کے ساتھ تقریب منعقد کی جاتی ہے تو اس کی کارکردگی کی تعریف کی جاتی ہے۔ خامیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے بھی میری حوصلہ افزائی کی جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

س کیا ایسا ممکن ہے کہ خواجہ صاحب جیسا سنجیدہ نقاد برسرِ عام اتنی بڑی رائے محض کسی کی عزت افزائی کے لئے دے دے؟

ج پھر میں عرض کروں گا کہ ایسی تقریب کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اس بات کو ان کی حتمی رائے نہیں سمجھنا چاہیے۔

س آپ اتنے مردم بے زار کیوں رہتے ہیں؟

ج ایسی بات نہیں۔ میں فطری طور پر کم آمیز ضرور ہوں۔ خلوت کچھ زیادہ ہی پسند ہے۔

س آپ لاہور جیسے شہر میں ایک عرصہ سے رہ رہے ہیں لیکن مزاجاً ابھی تک آپ اپنے گاؤں سے باہر نہیں نکل سکے کیوں؟

ج واقعی مجھے گاؤں بہت یاد آتا ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ اب اس کا وجود باقی نہیں رہا۔ مجھے وہ آنگن بہت یاد آتا ہے جس میں میرے ماں باپ کے قدموں کے نشان ہوا کرتے تھے۔ وہ درخت بھی یاد آتے ہیں جن کے نیچے کھیلتے ہوئے میرا بچپن گزرا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اور ہمجولی بہت یاد آتے ہیں۔ میں انہیں بھلا نہیں سکتا مجھ میں اتنی طاقت نہیں۔

س آپ کا ایک شعری مجموعہ ''کاش'' کے نام سے چھپا ہے۔ کس حد تک آپ کی ساری شاعری اس ایک لفظ کے گرد گھومتی ہے۔ اس ''کاش'' کی وضاحت کریں گے؟

ج کاش اپنی وضاحت خود ہے اور اس کی تفصیل میری شاعری میں بھی موجود ہے۔

س میں نے تفصیل کی نہیں محرک کی بات کی ہے؟

ج اصل میں، میں زندگی کو جس طرح بسر کرنا چاہتا تھا۔ ویسے نہیں کر پایا حالات بھی موافق نہیں تھے اور انتھک جدوجہد بھی نہ کر سکا۔ یوں کہیں:

سدا آنکھیں رہیں برسے ہوئے بادل کے ٹکڑے پر
اچانک راستے پر کوئی دریا بھی نہیں آیا

اقبال راہی

س ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ج ہماری رہائش انارکلی بازار میں تھی۔ پیسہ اخبار میں ایک کارپوریشن کا اسکول تھا۔ پانچویں جماعت وہاں سے پاس کی۔ اس کے بعد دیگر اسکولوں میں زیر تعلیم رہے مگر ساتویں جماعت سے آئے نہ پڑھ سکے۔

س شاعری کی طرف کس طرح آنا ہوا؟

ج ہم چونکہ نامور شاعر حضرت احسان دانش کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے اور بچوں کی نظمیں لکھنے کا شوق تھا۔ ایک شاعر آغاز برنی ہمیں احسان دانش کے پاس لے گئے اور ہمیں ان کے حوالے کر دیا۔ بس یہیں سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ یہ ایک درسگاہ تھی جہاں سے ہم نے فیض حاصل کیا۔ بعد میں ہم نے باقاعدہ ان کی شاگردی اختیار کی۔

س آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بیٹھے بیٹھے شعر لکھ لیتے ہیں؟

ج دراصل ہمارے دور میں اساتذہ اپنے شاگردوں کو مشق کراتے تھے۔ ہمیں احسان صاحب کوئی مصرعہ دے کر کہتے تھے اس پر جتنے شعر لکھ سکو لکھ کر لاؤ۔ چونکہ نیا نیا شوق تھا ہم ساری رات یہی کام کرتے تھے۔ جب جا کر سناتے تھے تو تین چار مصرعے سننے کے بعد استاد کہتے تھے انہیں ردی کی ٹوکری میں پھینک آؤ۔ اس وقت اگرچہ ناگواری کی ایک کیفیت دل و دماغ پر طاری ہوتی تھی لیکن اب یہ کھلا کہ یہ ذہنی تربیت تھی اور اب ہم اس حوالے سے ہر جگہ مقبول ہیں۔

س کس کس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے؟

ج پہلے مقبول جہانگیر مرحوم نے امروز کے لئے بچوں کی نظمیں لکھوائیں۔ پھر مزاحیہ شاعری کا چکر لگا۔ پھر قطعہ نگاری کی طرف آئے۔اب نثر کے میدان میں بھی کوشش جاری ہے۔

س کبھی پاکستان سے باہر کسی مشاعرے میں جانا ہوا؟

ج بچپن میں ایک کہاوت سنتے تھے۔ چٹ پٹی ترکاریاں جب ہوویں ساتھ۔دال کو پھر کون لگاتا ہے ہاتھ۔تو جناب ہم بڑے سفید پوش آدمی ہیں ہمیں کون پوچھتا ہے۔ یہاں تو بڑے بڑے دانشوروں کا ہولڈ ہے جسے وہ چاہتے ہیں بھیج دیتے ہیں یا ساتھ لے جاتے ہیں۔

س نثری نظم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج میرے خیال کے مطابق جو شاعر بحر اور وزن کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو وہ اپنے لئے یہ میدان منتخب کر لیتا ہے۔اس میں نہ ہینگ لگے اور نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آنے والی بات ہے۔

س ابتدائی دور میں کن کن شعراء کا مطالعہ کیا؟

ج مجھے بچپن ہی سے فانی، میر، داغ اور جگر پسند تھے۔ میں نے انہیں پڑھا اور اب تک اسی نوعیت کے دیگر اساتذہ میرے زیر مطالعہ ہیں۔

س اور موجودہ شاعروں میں کس سے متاثر ہیں؟

ج منیر نیازی اپنی طرز کے انوکھے شاعر تھے۔ جوش ملیح آبادی، احسان دانش، شکیب جلالی، ڈاکٹر خورشید رضوی، شہزاد احمد، حمیدہ شاہین، ادا جعفری، رخشندہ نوید شاعری کے وہ مینار ہیں جن کی روشنی سے ادب جگمگا رہا ہے۔

س مطالعے کا رجحان کس حد تک قائم ہے؟

ج جب سے الیکٹرانک میڈیا نے سر اٹھایا ہے مطالعہ کا رجحان نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ بچے بڑے سب اس طرف راغب ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ اب نئی کتابیں فٹ پاتھوں پر باآسانی دستیاب ہیں۔

س ترقی پذیر معاشرے میں ادیب کا کیا مقام ہے؟

ج یوں تو ادیب کا بڑا مقام ہے مگر جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ نئی نسل تک منتقل نہیں ہو پا رہا۔ چند مخصوص ادیب ہیں جن کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ زندگی کے مسائل اس قدر ہولناک اور گھمبیر ہو گئے ہیں کہ عام آدمی کو روٹی کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ معاشرتی ناہمواری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ بے روزگاری اپنی آخری حد بھی پار کر گئی ہے۔ معاشرہ ایک نہ ختم ہونے والی الجھن کا شکار ہے جس سے عدم تحفظ کا احساس بڑھ رہا ہے۔

س اب تک کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج پہلا مجموعہ زندہ حروف مرحوم اختر کاشمیری نے توفیق بٹ کے کہنے پر شائع کیا۔ دوسرا مجموعہ قطعات پر مشتمل تھا (جو میں روزنامہ اوصاف میں لکھتا رہا، اب بھی جاری ہے) ہائی الرٹ پاکستان تیسرا مجموعہ قطع برید حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ بھی کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا، کے مصداق ہے کہ اس میں پروفیسر عاشق رحیل، حسن عباسی، میاں منظور شاہد، محمد جمیل خان، عبدالمجید چٹھہ اور سلیم اختر ملک کا تعاون حاصل ہے۔

س آپ کے گھریلو حالات ابتر ہیں، کیا وجہ ہے؟

ج میری شادی 1973ء میں ہوئی۔ گھر میں غربت کا راج تھا۔ روزگار نہ ہونے کے برابر تھا۔ پہلے خواجہ محمد رفیق کے پریس میں کام کیا، پھر بچوں کا رسالہ چندا ماموں میں چپراسی سے لے کر ایڈیٹر تک خود تھا۔ ماہنامہ قہقہہ میں مزاحیہ شاعری لکھتا تھا۔ اس کے علاوہ جب قطعات کا سلسلہ شروع ہوا تو کوہستان، مغربی پاکستان، استیصال، سما، افلاک اور اب گزشتہ چند سالوں سے روزنامہ اوصاف میں یہ سلسلہ جاری ہے۔ جن کا معاوضہ ندارد۔

س تنقیدی اجلاسوں کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

ج حضور ہمارے زمانے میں تنقیدی اجلاس برائے اصلاح ہوا کرتے تھے۔ اب صرف تنقید برائے تنقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی گروپ ہیں جو اس محاذ آرائی میں پیش پیش ہیں یا یوں کہیں کہ یہ شعبہ قبضہ گروپوں کے ہاتھ آ گیا ہے اور اس میں ہاتھ دکھانے والوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔

س پنجابی میں بھی کوئی کتاب آئی ہے؟

ج پنجابی میں شعر تو کافی لکھے ہیں۔ جب محترم دلدار پرویز بھٹی زندہ تھے تو وہ اپنے پروگرام میں بلاتے تھے۔ وہاں ہم پنجابی نظمیں پڑھتے تھے۔ جن کی تعداد بھی اب سو کے قریب ہے۔ منظوم خراج کے عنوان سے ایک مجموعہ تیار ہے جو 150 نظموں پر مشتمل ہے جو مشاہیر مرحوم اور حاضر شعراء کے بارے میں کہی گئی تھیں لیکن کتابی صورت میں لانے کے لئے خدا جانے کتنے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں گے۔

س آپ کے ساتھ پے بہ پے حادثے ہوتے رہے، اس کی مختصر تفصیل؟

ج ہمارا انیس سال کا بیٹا 1997ء میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد جو تین بچے خون کی مہلک بیماری تھیلسیمیا کا شکار تھے۔ ان میں سے ایک بیٹی نیلم اقبال آٹھ سال قبل عید کے دوسرے دن اللہ کو پیاری ہوگئی۔ والد محترم ہمشیرہ کی شادی والے دن انتقال کر گئے۔ والدہ بھی کچھ عرصے بعد دماغی عارضے میں مبتلا ہو کر ہمیں روتا چھوڑ گئی۔ اب تازہ المیہ یہ ہے کہ ہمارا شاعر بیٹا (مصنف لہو کا حصار) 15 دسمبر 1914ء کو ایک ہفتہ زندگی اور موت کی کشمکش کے بعد ہمیں لاکھوں برس کے غم دے گیا۔ اس کی وفات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ بینائی کم ہوگئی اور بدن کمزوری سے اپنا رشتہ مستحکم کرنے پر تل گیا۔

س آج کل آپ کے کیا مشاغل ہیں؟

ج 2005ء میں ضلعی حکومت کی طرف سے ملازمت سے ریٹائر ہوا۔ ماہنامہ احوال لاہور میں ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی نے ڈیوٹی لگا رکھی ہے کہ ہر ماہ کسی شاعر یا شاعرہ کا کلام اس ماہ کا شاعر کے عنوان سے مہیا کریں۔ روزنامہ اوصاف میں روزانہ کی بنیاد پر ایک قطعہ تحریر کرتا ہوں۔ ایک ماہنامہ تارکین وطن ہے جو بیرون ملک ارسال کیا جاتا ہے۔ اس کی مجلس ادارت میں شامل ہوں اور گوشہ ادب تحریر کرتا ہوں جس میں تقریبات کا احوال، کتابوں پر تبصرے مختلف ادبی خبریں اور اساتذہ کا اردو پنجابی کلام شائع ہوتا ہے۔ اس کے چیف ایڈیٹر میاں منظور شاہد ہیں جو بہت پیارے انسان اور صاحب مطالعہ شخص ہیں۔

س ارژنگ کے بارے میں کوئی رائے؟

ج یوں تو ادبی رسالے کافی تعداد میں شائع ہوتے ہیں لیکن بیشتر رسالوں کے مدیروں نے اس کو کمائی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ عامر بن علی اور حسن عباسی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ یہ ارژنگ کے ذریعے ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مضافات میں رہنے والے شاعروں کا کلام تواتر سے شائع ہوتا ہے اور یہ کسی کے خلاف ایک حرف بھی لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔

اختر شمار، ڈاکٹر

چیئرمین شعبہ اردو ایف سی کالج یونیورسٹی ڈاکٹر اختر شمار کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ آپ ایک منجھے ہوئے شاعر، محقق، استاد ادب، کالم نگار کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اردو شعری روایت میں ''دلیری'' سے مکالمہ کرنے اور محنت کی عظمت کو اجاگر کرنے کے ساتھ، کیفیات دل کی ''کوملتا'' کو شاعری سے ہمکنار کرنے میں ایک انفرادی لب ولہجہ متعارف کرایا۔ اب تک ان کے 8 شعری مجموعے ادبی حلقوں اور بین الاقوامی سطح پر قارئین میں متعارف ہو چکے ہیں اور ان کے لاتعداد اشعار زبان زد خاص وعام ہیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی شاعری کے دو اور کہانی اور اردو پنجابی کالموں کے چار مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ سفرنامہ، تحقیق، تصوف پر بھی ان کی کتب مقبول ہوئیں۔ مختلف قومی روزناموں میں ان کے کالم شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت روزنامہ نئی بات میں کالم کے علاوہ ادبی ایڈیشن بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ادب میں آپ کی بھرپور کنٹری بیوشن ہی کے سبب ہم آج ڈاکٹر اختر شمار سے ایک بھرپور مکالمہ آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ جس میں زندگی کو بالکل نئے انداز میں ڈسکس کیا گیا ہے۔

س جی ڈاکٹر صاحب، بہت شکریہ وقت دینے کا۔ ہمیں علم ہے آپ کی بے پناہ مصروفیات ہیں، پہلے مختصراً اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بیان کریں تاکہ قارئین مکمل آپ سے متعارف ہو سکیں؟

ج جی بسم اللہ...... میری ولادت راولپنڈی میں 17 اپریل 1960ء کو ہوئی۔ والد صاحب پاک فوج میں صوبیدار تھے۔ بنیادی طور پر ہمارا گھرانہ کاشتکار تھا مگر بارانی زمینوں

کی فصلوں کا دارومدار بارشوں پر ہوتا ہے سو اس علاقے کے لوگ زیادہ تر آرمی جوائن کر لیتے ہیں، ویسے بھی آرمی کی سروس کو اس علاقے میں باعث عزت بھی سمجھا جاتا ہے۔ میرے بھائی بھی آرمی میں رہے ہیں۔ باقی اب بھی اس علاقے میں ہمیں اچھا خاصا زمیندار خیال کیا جاتا ہے مگر بنجر اور پتھریلی زمینوں کا۔ دادا جان نے کچھ زمین کاشت کے قابل بنائی تھی جو اس وقت میرے بھانجوں کی نگرانی میں ہے۔ میں نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی پھر ہم ملتان آ گئے کہ والد صاحب آرمی سے سبکدوش ہو کر کھاد فیکٹری میں جاب کر رہے تھے۔ سو بی اے تک ملتان میں پڑھتا رہا۔ اسی زمانے میں شاعری سے لگاؤ پیدا ہوا، بیدل حیدری صاحب اس دور میں نوجوان شعراء کی ادبی تربیت کرتے تھے۔ اپنے پہلے ادبی دوست اطہر ناسک کی وساطت سے میں بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوا۔ الحمدللہ اب تک انہیں شاعری میں استاد سمجھتا ہوں جبکہ کتنے ہی شاعران سے تربیت لینے کے باوجود بھی انہیں اون نہیں کرتے۔ شوکت مہدی میں اور اطہر ناسک باقاعدہ بیدل صاحب کے فارغ التحصیل شاگرد ہیں۔

س بیدل حیدری صاحب کے حوالے سے ایک نوجوان فیس بک پر کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے؟ آپ کا تذکرہ بھی کرتا ہے کہ آپ نے بیدل صاحب کا مجموعہ اب تک دبا رکھا ہے جو انہوں نے شائع کرنے کی غرض سے آپ کو دیا تھا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

ج جی مجھے پتہ چلا ہے کہ ایک نوجوان اس طرح کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے اسے کبھی کوئی جواب نہیں دیا صرف ریکارڈ کی درستی کیلئے چند باتیں ضروری سمجھتا ہوں۔

سارا ملتان گواہ ہے کہ اس نوجوان کی شعری تربیت کس نے کی۔ اسے سکول کی پہلی کلاس میں انگلی پکڑ کر داخل میں نے کرایا، وہ جو چوتھی کلاس سے بھاگا ہوا تھا۔ اپنے ہیڈ ماسٹر دوست سے کہہ کر اسے نئے سرے سے پہلی جماعت میں داخل کرایا، اسے شاعری کی سدھ بدھ سکھائی، رضی الدین رضی، شاکر حسین شاکر، نوازش ندیم، شفیق آصف سے لے کر ناصر بشیر تک سبھی ماشاءاللہ حیات ہیں اور سب گواہ ہیں کہ اسے کس طرح تعلیم و تربیت دی۔ محلے

دار ہونے کے سبب، اس کی ہر طرح کی مدد بھی کی۔ محلے دار بھی کچھ جانتے ہیں۔ میں اسے لے کر بیدل صاحب کے پاس بھی جایا کرتا۔ اسی دوران بیدل صاحب نے اسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ وہ ان کے ہاں آنے جانے لگا۔ اصلاح بھی لیتا رہا لیکن افسوس یہ ہے کہ آخرکار اس نے بیدل صاحب ہی کو ڈس لیا۔ انہوں نے بھگا دیا۔ اب وہ ہر پل نہ صرف یہ کہ بیدل صاحب بلکہ مجھے بھی یاد کرتا رہتا ہے۔ بیدل صاحب کی سب ڈائریاں ان کے گھر والوں کے پاس موجود ہیں۔ ان کا کوئی مجموعہ لے کر کہاں بھاگ سکتا ہے۔ پھر میرا کون سا اشاعتی ادارہ تھا کہ ان سے مجموعہ لے کر آتا اور پھر دبا کر بیٹھ جاتا۔ اب تو ان کے سارے مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام کی تدوین بھی ہو چکی ہے بلکہ کل کلام کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ کلیات بھی خود ان کے جانشین شکیل سروش نے چھپوا دیا ہے۔ لہٰذا یہ انتہائی لغو بات ہے کہ بیدل صاحب کا کوئی غیر مطبوعہ کلام کسی کے پاس ہے۔ مجھے کوئی متشاعر کہتا پھرے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر جب بیدل صاحب کی صاحبزادی کے حوالے سے وہ بدبخت بے سروپا باتیں کرتا ہے تو دکھ ہوتا ہے۔ اللہ اسے ہدایت دے۔ مجھے یقین ہے ایک دن وہ اس سارے پروپیگنڈے پر پشیمان ضرور ہوگا کہ میں نے کبھی اس کا برا نہیں چاہا۔ میں اس کی ساری کوتاہیوں کو ہمیشہ کیلئے معاف کرتا ہوں۔

س پانچ برس ملک سے باہر، ادبی حلقوں سے دور (مصر میں) تجربہ کیسا رہا اور اس کے آپ کے ادبی کیریئر اور ذات پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج وطن سے دوری کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ والدین، بہن بھائی، عزیز و اقارب اور احباب کو انسان Miss کرتا ہے لیکن ظاہر ہے انسان اپنے مسائل اور مجبوریوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اسے کبھی تعلیم اور کبھی رزق کے معاملات میں سفر بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میرے لئے بھی یہ ایک اعزاز تھا کہ میں اردو چیئر پرسن منتخب ہوا۔ بیرون ملک یونیورسٹیوں میں پڑھانے کا تجربہ حاصل ہوا۔ کیریئر میں اس کی اپنی اہمیت بھی ہے۔ اس سے معاشی طور پر بھی قدرے تبدیلی آتی ہے۔ میں نے ان برسوں میں جمع پونجی سے لاہور میں اپنے لئے

ایک 'چھت' کا بندوبست کیا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی بہتری آئی۔ اس کے علاوہ وطن سے دوررہ کر وطن سے محبت کے جذبے بھی تقویت اختیار کرتے ہیں۔ میں نے بیرون ملک قدرے تنہائی سے ایک اور فائدہ بھی حاصل کیا۔ یعنی خود احتسابی اور ذات وحیات پر غور وفکر کے لمحوں سے اپنی تطہیر پر بھی توجہ دی۔

اگرچہ ایف سی کالج یونیورسٹی میں آنے کے بعد وہ ''بجنگ آمد'' کا ادارتی رویہ خود سے منہا کرنے کی کوشش کر چکا تھا مگر مصر میں مطالعے اور تفکر نے مجھے انسان کی اصل تک رسائی حاصل کرنے کے راستے پر ڈال دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اپنی شخصیت کی تعمیر پر توجہ دینی چاہیے۔ اس میں شخصیت کی باطنی صحت وشفافیت کو خاص طور پر مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ مصر میں رہ کر اپنے طالب علموں خاص طور پر نوجوان قارئین کیلئے ایک مختصر سی کتاب ''آداب خود آگاہی'' بھی تیار کی۔ اب اس سے آگے کا سفر جاری ہے اور آنے والے دنوں میں انسان کی پریشانیوں سے نجات کے حوالے سے میری کتاب آنے والی ہے۔ جس میں تصوف کے حوالے سے آج کے انسان کی بے چینی کا کسی حد تک حل تلاش کرنے کی کوشش شامل ہے۔ آج اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو ایک عجیب افراتفری، بے سکونی، حرص وہوس کا دور دورہ ہے۔ معاشی مسائل بھی اپنی جگہ ہیں۔ نظام کی خرابیاں اور ناانصافیاں بھی ہیں مگر ان مسائل پر تفکر اور تدبر سے قابو پایا جاسکتا ہے۔

ہم میں برداشت کیوں کم ہوگئی ہے۔ انسانوں میں رواداری، محبت اور اخوت ناپید کیوں ہورہی ہے؟ ان ایشوز پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔ مگر بدقسمتی سے دانشور بھی جنہیں اپنے کردار اور تحریر وتقریر سے لوگوں کو ''ایجوکیٹ'' کرنا تھا۔ وہ بھی زندگی کی حقیقت سے دور نکل چکے ہیں اور اسی زندگی کی آسودگی کو سب کچھ سمجھ کر اپنے آپ کو ''خوشحال'' کرنے کے لئے ہانپتے کانپتے نظر آتے ہیں۔

س اس تناظر میں ادیب، شاعر کہاں کھڑے ہیں؟

ج میں نے کہا نا آج ہر شخص جلدی میں ہے۔ وہ صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے۔

اس ''میں'' نے ہمیں دانش سے دور کر دیا ہے۔

ہمارے سماج میں ادب کو کارفضول سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بھی شخص اولاد میں سے کسی کو ادیب شاعر بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہمارا سارا دھیان صرف اور صرف بہترین ''ملازمت'' کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ ہماری درس گاہوں میں بھی اچھے کیریئر کیلئے ایسے ہی مضامین میں ڈگریاں حاصل کرنے کی دوڑ جاری ہے۔ کسی زمانے میں والدین اپنے بچوں کو ڈاکٹر انجینئر بنانے کا شوق رکھتے تھے۔ اس سے بے روزگار ڈاکٹروں کی کھیپ تیار ہوئی۔ آج کل آئی ٹی کے گریجوایٹس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں ہیومینیٹیز کے شعبوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ سائنس کے شعبے میں تنخواہیں اور مراعات زیادہ ہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا صرف سائنس اور ٹیکنالوجی سے انسان سچی خوشی اور طمانیت حاصل کر سکتا ہے۔ رات دن مشینوں سے وابستگی نے انسان کو بھی مشین بنا دیا ہے۔ جبکہ ہمارے قومی شاعر کہتے ہیں۔ دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت ایسے ماحول میں انسان، انسان سے کٹ گیا ہے۔ ایک عجیب سا ''مفاداتی کلچر'' تشکیل پا رہا ہے۔ سوشل میڈیا خاص کر الیکٹرانک میڈیا نے ہماری زندگی پر خاص اثرات مرتب کیے۔

کتاب کلچر ناپید ہو رہا ہے۔ اس سے انسانی دل و دماغ متاثر ہو رہا ہے۔ جسمانی اور روحانی صحت تباہ ہو رہی ہے۔ ہم میں آسائش اور آسودگی کے لئے ایک بھاگ دوڑ جاری ہے۔ ہر شخص راتوں رات دولت مند بننے کی فکر میں ہانپ رہا ہے۔ دولت کی اہمیت سے انکار نہیں مگر بہت سے دولت مند اپنی صحت کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ انہیں سو طرح کے امراض، خدشات اور خطرات نے گھیر رکھا ہے۔ نیند جیسی نعمت کے لئے بھی انہیں دواؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ حقیقی سکون اور خوشی صرف دولت سے حاصل نہیں ہوتی۔ دولت سے اچھا بیڈروم تیار ہو سکتا ہے، نیند اور سکون نہیں خریدا جا سکتا۔

س دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا سماجی منظرنامہ تبدیل ہو چکا ہے، آپ کیا کہتے ہیں؟

ج وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں تو آتی ہیں لیکن ہمارے ہاں سادگی، قناعت اور محبت، اخوت ختم ہو رہی ہے۔ لوگ سادہ غذا کے عادی تھے۔ مرغی گھروں میں کبھی کبھار

پکائی جاتی وہ بھی کسی مہمان کے آنے پر۔ مرغی کی اس ترکاری میں ذائقہ بھی ہوتا تھا۔ آج ہر گھر کی فریج میں برائلر کے پیکٹ رکھے ہوئے ہوتے ہیں، جب دل چاہا نکال کر استعمال کرلیا۔ گوشت خوری کی عادت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے۔

اور خالص گوشت کا تصور ماند پڑتا جا رہا ہے۔ مردہ جانوروں کے گوشت اور اس کی چربی سے کھانے کا تیل بنایا جاتا ہے۔ برائلر مرغیوں کی خوراک میں بھی مردہ جانوروں کی آنتیں الائش استعمال ہوتی ہیں۔ بیکری، مٹھائیوں میں کیمیکل والا دودھ استعمال کیا جاتا ہے۔ خالص پانی تک نایاب ہو رہا ہے۔ ایسی دو نمبر خوراک سے انسان کی صحت کیا کرے گی؟ بیماریوں میں اضافہ ہو چکا ہے لیکن دواؤں میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے۔ بندہ کہاں جائے؟ نئی نسل کا ''آئی کیو'' متاثر ہو رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خوراک کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ جیسا ہم کھاتے پیتے ہیں ویسی ہی ہماری سوچ پنپتی ہے۔ یوں سمجھ لیں بندے ڈنگر ہوندے جاندے نیں۔

س 2018ء کے حوالے سے آپ نے کوئی ادبی منصوبہ بندی کی ہے؟

ج منصوبے تو ذہن میں بہت سے ہیں لیکن اصل معاملہ ان کی تکمیل ہے۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے، بہر حال ارادے تو ہوا کرتے ہیں، آنے والے دنوں میں میری دو کتب تو سمجھیں پبلشرز کے پاس ہیں جن میں ایک کتاب مرحوم شعراء ادباء کے حوالے سے ''خاکے'' ہیں۔ میرے روزنامہ نئی بات میں شائع ہونے والے کالموں کا انتخاب بھی شائع ہونے والا ہے۔ یہ کالم خاص طور پر تصوفانہ انداز لئے ہوئے ہیں اور ان میں درویشوں، ملنگوں کے ساتھ گزرے حالات و واقعات ہیں۔

میرا تازہ شعری مجموعہ نعتیہ آہنگ میں بھی لکھی گئی غزلیات پر مبنی ہے جو اس برس انشاءاللہ ضرور قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ویسے میں ذاتی طور پر نثر کی طرف زیادہ توجہ دے رہا ہوں۔

س کیا نثری تحریروں کے ذریعے آپ لوگوں کی تربیت کا منصوبہ رکھتے ہیں؟

ج کسی حد تک آپ کہہ سکتے ہیں کہ میری نثری تحریروں میں نئی نسل کو سکون سے زندگی گزارنے کے ڈھب بیان کرنے کی کوشش ہے۔ مقصدیت سے عاری تحریر وقت کا

ضیاع ہے۔ میں اپنے طالب علموں اور نوجوان قارئین کی تربیت کے بارے میں اپنے حصے کا کردار ادا کرنا چاہتا ہوں۔ خاص طور پر نوجوانوں کی باطنی صحت، کردار اور شخصیت سازی پر توجہ دینے کا ارادہ ہے۔

س اس سلسلے میں آپ نے ڈرامے جیسے میڈیم کا سہارا کیوں نہیں لیا؟ کسی زمانے میں آپ نے ٹی وی کے لئے ڈرامے بھی تو لکھے تھے؟

ج ہاں وقت ملا اور کوئی مناسب اور ذہین پروڈیوسر میسر آیا تو میں ڈرامہ ضرور لکھوں گا۔ اس حوالے سے میرے پاس چند اچھوتے آئیڈیاز موجود ہیں۔ ٹی وی ڈرامے جیسا میڈیم یکسانیت کا شکار ہے۔ عہد حاضر میں عملی تصوف سے لوگوں کی ذہنی قلبی اور روحانی تربیت ڈراموں سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک موثر ہتھیار ہے۔ اس کے اثرات بھی گہرے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی ہمارے ہاں بیڈ رومز تک رسائی ہے۔ اس سے لوگوں میں فکر و شعور عام کیا جا سکتا ہے مگر اس میں سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔

س ڈرامہ سے ہمارے معاشرے پر اور زندگیوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

ج اس وقت ہمارا ڈرامہ نئی نسل کو بگاڑنے میں ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔ نوجوان جو کچھ دیکھتے ہیں اثر لیتے ہیں۔ زبان، عادات، رسم و رواج سب کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ اخلاقیات پر قطعی کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ ہر کہانی ٹیلی ویژن پر نہیں دکھائی جا سکتی۔ معاشرے کو مثالی بنانے کیلئے منفی کرداروں کی بجائے مثبت کہانیوں اور کرداروں کو رواج ملنا ضروری ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے اشتہار تک بے تکے غیر سنجیدہ اور مضحکہ خیز بنائے جانے لگے ہیں۔ اس پر کوئی توجہ دینے والا نہیں............ اب دیکھیں ناں ''داغ تو اچھے ہوتے ہیں'' جیسا جملہ نئی نسل پر کیا اثرات مرتب کرے گا، بھلا داغ اچھے کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ واشنگ پوڈر کی طرف مائل کرنے کے لئے کوئی اور مکالمہ بھی تو تحریر کر سکتے ہیں۔ ڈراموں میں ماں کو یار کہہ کر مخاطب کرنا کہاں کی روشن خیالی ہے؟

س دانشور اور تخلیق کار کی آواز موثر کیوں نہیں رہی؟ آپ کی رائے؟

ج آج دانشور بھی میڈیا 'پرسن' کو ہی سمجھا جانے لگا ہے۔ جو کوئی چند دن سکرین پر نظر

آنے لگتا ہے خیر سے دانشوروں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ صحافت میں ادیب شاعر بھی ہوتے ہیں مگر محض رپورٹنگ کرنے والے جب ٹی وی کے اینکر بن کر دانشوری بگھارتے ہیں تو معیار کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں، اب تو دانشوری بھی آٹھ دس اینکر پرسنز کا نام ہے۔ وہ جس موضوع کو اچھال دیں ہمارا میڈیا ادھر دوڑ پڑتا ہے۔ زندگی کے سنجیدہ اہم اور بہت سے عوامی مسائل پر بات کرنے والے خال خال ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب راہ دکھانے والے بندے خود ہی حرص ہوس کے بندے بن جائیں تو راستے متعین کون کرے گا۔

س لیکن اہل قلم میں حبیب جالب جیسا کردار ادا کرنے والے کہاں ہیں؟

ج حبیب جالب جیسی قناعت، برداشت، صبر اور استقامت، اب اہل قلم میں عنقا ہو چکی ہے۔ اب ادب وثقافت میں ایسے سچے کھرے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں کیوں کہ یہ ایک کٹھن راستہ ہے۔ اور اس راہ میں چند کڑے مقامات آیا کرتے ہیں۔ آج کی نئی نسل کو بہت جلدی ہے۔ وہ شارٹ کٹ سے جلد ہر منزل حاصل کرنے کی آرزومند ہے۔ نئے تخلیق کار راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھونے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور ہر حال میں چاہے اس میں ان کی عزت نفس کا جنازہ نکل جائے۔ شہرت اور دولت کی منزلیں طے کرنے کی فکر میں ہیں۔ جیسا ہمارا معاشرہ ہے، اہل قلم بھی ویسے ہی ہونگے۔ قومی سطح پر سنجیدہ روایات، اخلاقیات اور شائستگی کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔

س لیکن ایسا نہیں ہے، بہت سے لوگ ادب میں نام کما رہے ہیں کیا وہ عزت دار نہیں؟

ج دراصل میں کسی پر تنقید نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو اجتماعی زوال کے حوالے سے گفتگو کر رہا ہوں۔ دیکھیں عزت اور شہرت میں باریک سا فرق ہے۔ اس کا ادراک ہو جائے تو یار لوگ گم نامی کو زیادہ ترجیح دیں لیکن یہ شعور بھی تو رب ذوالجلال کی دین ہے۔ جس شاعر کو ہوٹنگ اور داد کا فرق سمجھ نہیں آتا اسے شاعر کون کہے گا؟ شاعری باشعور لوگوں کا کام ہے۔ اگر فہم وادراک کی طرف سے ہاتھ تنگ ہو تو محض شہرت کے لئے تو کوئی بھی میدان اختیار کیا جا سکتا ہے۔ سو ادب وشعر میں اپنی انا اور عزت نفس کو داؤ پر لگائے، خواتین وحضرات کی کمی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں لوگ اپنی خودداری اور عزت نفس پر توجہ دینے کی بجائے آسائش

وآسودگی کے لئے ہانپ رہے ہیں۔

س آج کل نظم، آزاد نظم سے اگلے پڑاؤ...... نثری نظم تک جا پہنچی ہے؟ آپ اسے کیسے لیتے ہیں؟

ج نظم ایک بھرپور صنف سخن ہے۔ نثری نظم بھی کہنے والے موجود ہیں مگر میری رائے میں نثری نظم کہنے کا حق اسے حاصل ہونا چاہئے جو پابند نظم کہہ سکے یا غزل بھی کہہ سکتا ہو۔ صرف شاعری میں نثری نظم کا لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے مگر بہت سے لوگ وزن میں ایک مصرع نہیں کہہ سکتے مگر وہ نثر میں اپنے آپ کو شاعر کہلوانے پر مصر ہیں۔

س شمار صاحب کیا انسان اپنی ذات سے بھرپور مکالمہ کرسکتا ہے؟

ج ذات سے مکالمہ بالکل ہوسکتا ہے لیکن اس کے لئے ایک ''حواس بیدار'' انسان کی ضرورت ہے جو شخص اپنی آواز خود نہیں سن سکتا کہ اس کی زبان سے کیا ادا ہورہا ہے وہ بیدار مغز کیسے ہوسکتا ہے، خود سے مکالمے کیلئے اپنے آپ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے اپنے شب وروز، اپنے کردار اور افعال پر غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ باطنی تربیت کیلئے روزمرہ معمولات کے علاوہ خوراک پر بھی 'فوکس' کرنا لازم ہے۔

س مشاعرہ کلچر کس مقام پر ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

ج مشاعرے شعروادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن مشاعرے کو صرف اور صرف تفریح کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے شاعر کو مصرعوں سے ''گدگدی'' کرنا پڑتی ہے جس سے ماحول میں ایک غیر سنجیدگی جنم لیتی ہے۔

مشاعرے کے فروغ میں ٹی وی چینلز خاص کردار ادا کرسکتے ہیں اور پرائم ٹائم میں ایسے مشاعروں کی کوریج سے لوگوں میں شعروادب کی دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس سے کتاب کلچر کے فروغ میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

امجد اقبال امجد

پاکستان سے باہر تارکین وطن پاکستانیوں سے سب سے بڑی آبادی متحدہ عرب امارات میں مقیم ہے۔ یو اے ای میں مقیم پاکستانیوں کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق پندرہ لاکھ کے قریب ہے جو مقامی آبادی سے دوگنا سے بھی کچھ زیادہ ہے۔اسی تناسب کے سبب یہ دیس منی پاکستان محسوس ہوتا ہے۔اس احساس کا سبب فقط ہماری وہاں مقیم آبادی نہیں بلکہ پاکستان اور اردو زبان کے روابط ہیں۔ پاکستانی ثقافت اور اردو زبان وادب کے متحدہ عرب امارات کے ساتھ یہ ثقافتی رشتے مضبوط بنانے کے لئے کوشاں نامور شخصیات میں سے ایک امجد اقبال امجد ہیں۔ وہ صاحب دیوان شاعر ہیں اور پاکستانی ایسوی ایشن دوبئی لٹریری سوسائٹی کے صدر بھی ہیں۔ گزشتہ دنوں دوبئی جانے کا موقع ملا تو ان کی دعوت پر پاکستان سنٹر اور لائبریری کا بھی دورہ کیا۔ گرینڈ حیات ہوٹل میں انہوں نے ایک شاندار شعری نشست کا میرے اعزاز میں اہتمام کیا۔ کچھ فراغت محسوس ہوئی تو میں قارئین کے لئے ان سے انٹرویو کی فرمائش کر دی۔ یہ رسمی گفتگو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

س ابتدائی زندگی سے بات کی ابتدا کرتے ہیں۔ پیدائش کہاں ہوئی؟ ابتدائی زندگی کیسے گزری؟

ج میری پیدائش کھاریاں کے نواح میں واقع ایک گاؤں سدھ میں ہوئی اور وہاں ہی میری ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہ گاؤں میجر عزیز بھٹی شہید نشان حیدر کے گاؤں کے بالکل پاس ہی ہے۔ میرے والد صاحب نے گاؤں میں ایک لائبریری قائم کر رکھی تھی۔ وہ ذہنی طور پر جماعت اسلامی سے نظریاتی وابستگی رکھتے تھے۔ میری عمر ابھی بہت چھوٹی تھی

جب انہوں نے مجھے اس لائبریری کا انچارج بنا دیا۔ جو بھی آدمی لائبریری سے کتاب لے کر جاتا اس کے نام کا اندراج، جو کتاب واپس کرتا اس کا اندراج میں کرتا۔ اگر کوئی پندرہ دن سے زیادہ کتاب واپس نہ کرتا تو پھر اس سے میں دو روپیہ جرمانہ وصول کرتا تھا۔ میرے خیال میں یہیں سے میری کتابوں اور حرفوں سے دوستی شروع ہوئی تھی۔

س لکھنے کی ابتدا کیسے ہوئی؟

ج جیسا کہ میں نے عرض کیا طبیعت میں موزونیت تو شروع سے ہی تھی اور پڑھنے لکھنے کا ماحول بھی میسر تھا، تین دہائیاں قبل جب میں دوبئ آیا تو یہاں پر سلیم جعفری کی قائم کردہ ایک ادبی تنظیم سے منسلک ہو گیا۔ انہوں نے یہاں جشن فروغ اردو ادب کے نام سے سالانہ مشاعرے کی خوبصورت روایت قائم کی۔ پاکستان سے بڑے بڑے نامور شعراء کو مدعو کیا جاتا اور ہندوستان سے بھی اردو زبان کے سرکردہ شعراء کرام ان کی دعوت پر دوبئ آنے لگے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بیگم صاحبہ سے مل کر میں نے یہ شمع جلائے رکھی اور ابھی تک کسی نہ کسی رنگ میں ادبی و علمی سلسلہ جاری ہے۔

س آپ صاحب دیوان شاعر ہیں، اپنی تخلیقات کے بارے میں قارئین کو کچھ بتائیں؟

ج میرا پہلا شعری مجموعہ ”صدائے دل“ کے نام سے کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اس کی تقریب رونمائی مگر ہم نے یہاں دوبئ میں ہی رکھی تھی۔ دوستوں نے بھرپور پذیرائی بخشی اور قارئین نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اس کتاب کی رونمائی اور پذیرائی کی آدھ درجن تقریبات منعقد ہوئیں۔ دوسری کتاب لاہور سے نستعلیق پبلشرز نے شائع کی ہے۔ اعلیٰ طباعت کے ساتھ ساتھ اس میں میرا شعری سفر بھی ارتقائی اعتبار سے اگلی منزلوں کی طرف رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بھی پاکستان اور دوبئ میں کئی تقریبات منعقد ہوئیں۔ شعر و سخن سے وابستہ احباب نے بڑی پذیرائی بخشی۔

س آپ کی دوسری کتاب کی تقریب رونمائی جو لاہور میں ہوئی، اس میں حاضری کا موقع تو ملا تھا مگر نام ذہن سے اتر گیا۔ بھلا کیا نام تھا؟

ج دوسرے شعری مجموعے کا نام ''بارش والی شام'' تھا۔ کتاب کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لوگوں نے بہت پسند کیا۔

س آپ نثر بھی لکھتے ہیں؟

ج میں نے چند افسانے بھی تحریر کیے ہیں اور مضامین بھی، نثر لکھنا بھی مجھے پسند ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرا حقیقی تخلیقی جوہر شاعری میں ہی اظہار پاتا ہے۔

س آپ کے علاوہ بھی متحدہ عرب امارات میں اردو شاعر موجود ہیں؟

ج مقامی شعراء میں ڈاکٹر زبیر فاروق اچھے شاعر ہیں۔ حالانکہ وہ عرب ہیں مگر اردو میں شعر کہتے ہیں۔ شفیق سلیمی اور سلیمان جاذب بھی اچھا شعر کہتے ہیں۔

س آپ نے پاکستان کی ثقافت اور اردو زبان کی متحدہ عرب امارات میں ترویج کے لئے بہت فعال کردار ادا کیا ہے۔ اس وقت ہماری ثقافت اور اردو زبان یو اے ای میں کہاں کھڑی ہے؟

ج جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ میں نے اپنے ادبی اور سماجی خدمت کا آغاز ''شام سخن'' تنظیم سے کیا۔ اس کا سربراہ اور مدار المہام بھی رہا۔ آج کل پاکستان ایسوسی ایشن دوبئ کے ادبی فورم کا میں صدر ہوں۔ اس سفر میں ہم نے پاکستان اور اردو زبان کے لئے بڑی دل جمعی سے کام کیا۔ آج جب اردو زبان اور پاکستانی ثقافت کا دوبئ میں چرچا دیکھتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ ہر دوسرا شخص یہاں اردو جانتا ہے۔ اردو بالخصوص دوبئ کی تو قومی زبان کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ وطن سے دور وطن کی خوشبو کی مثال دیکھنی ہو تو وہ متحدہ عرب امارات ہے، یعنی پاکستانی ثقافت اس قدر یہاں رچ بس گئی ہے۔

س آپ نے مجھے پاکستان سنٹر کا دورہ کروایا اور اس میں قائم اردو لائبریری بھی ملاحظہ کی۔ اتنا بڑا پروجیکٹ آپ لوگوں نے حکومتی مدد کے بغیر اپنی مدد آپ کے تحت کیسے مکمل کیا؟

ج ہماری خوش قسمتی کہ دوبئ حکومت نے ہمیں چند دیگر دوست ممالک کے ساتھ ایک وسیع قطعہ اراضی تحفے میں دیا۔ پاکستانی کمیونٹی میں ہم نے fund raising کر کے

ایک عظیم الشان آڈیٹوریم بنایا جس میں آپ نے دیکھا ایک ہزار لوگ با آسانی بیٹھ سکتے ہیں۔کھیلوں کے مقابلے ہو سکتے ہیں۔ پاکستانیوں کے مفت علاج کے لئے اسی میں ہسپتال بن رہا ہے جو کہ اپنی تعمیر کے آخری مراحل میں ہے۔ باسکٹ بال، بیڈمنٹن اور ٹینس کے میدان بنائے گئے ہیں۔ایک پاکستانی اہل دل کی فیملی نے اردو لائبریری عطیہ کی ہے جو انہی کے نام سے نیاز علی لائبریری مشرق وسطیٰ میں اردو کتابوں کا انشاء اللہ سب سے بڑا ذخیرہ ہوگی۔

س پاکستان سنٹر میں کوئی سکول بھی کھول رہے ہیں۔

ج یہاں پر پہلے ہی بفضلِ خدا گیارہ پاکستانی سکول قائم ہیں اور بڑے بھرپور انداز میں طالب علموں کو پاکستان اور اردو زبان سے مکمل تعارف فراہم کر رہے ہیں۔آبادی کی غالب اکثریت تو ویسے ہی مسلمان ہے اور ریاست کا بنیادی ڈھانچہ بھی اسلامی ہے۔اس لئے وہ تو ہم تارکین وطن کے لئے پہلے ہی ایک نعمت میسر ہے۔

س آپ کا ادبی سفر کیسا چل رہا ہے؟ آج کل کس موضوع پر زیادہ کام ہو رہا ہے۔

ج میں شعر وسخن سے اپنی وابستگی باعث عزت سمجھتا ہوں۔شعری سفر رواں دواں ہے البتہ نثر ذرا کم کم لکھتا ہوں۔شعر وسخن تو سانس کے ساتھ منسلک لگتے ہیں۔سانس لیتے ہیں، شعر کہتے ہیں۔

حنان عواد، ڈاکٹر

فلسطینی شاعرہ اورادیبہ ڈاکٹر حنان عواد اپنے منفرد طرز تحریر کے سبب عالمی ادب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ان کی آٹھ کتابیں شائع ہونے کے بعد کئی عالمی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ شاعری اور نثر میں یکساں مہارت رکھنے والی اس فنکارہ نے آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ سے عالمی ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لے رکھی ہے۔ فلسطینی رائٹرز ایسوسی ایشن کی منتخب صدر ہیں۔ انقلابی رہنما یاسر عرفات کی مشیر برائے ثقافتی امور رہ چکی ہیں اور آج کل فلسطین کے موجودہ صدر محمود عباس کی بھی کلچرل ایڈوائزر ہیں۔ اخبار میں مستقل کالم لکھتی ہیں۔ تنقید کے موضوع پر انہیں عرب دنیا میں ایک اتھارٹی سمجھا جاتا ہے اور پھر جنسی امتیاز کے متعلق ان کی تحریریں بھی عالمی سطح پر ان کا اہم تعارف ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کے پچاس سے زائد علمی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ قارئین کے لئے ان کے ساتھ پچھلے دنوں ہونے والی بات چیت پیش خدمت ہے۔

س شروع سے ہی بات شروع کرتے ہیں، لکھنا کب شروع کیا؟

ج میری عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی جب یروشلم کے ایک اخبار میں میرا پہلا مضمون شائع ہوا تھا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، شاعری بھی انہی دنوں شروع کی تھی۔ شاعری یوں تو چھوٹی عمر میں ہی شروع کر دی تھی مگر ان دنوں سنجیدگی آ گئی۔

س یہ بتائیں لکھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا؟ یہ خیال کیسے آیا کہ لکھنا چاہئے؟

ج میرا سارا گھرانہ بہت پڑھا لکھا تھا۔ خصوصاً میرے والد تو اچھے خاصے ادبی آدمی تھے۔ طبیعت میں موزونیت شاید کچھ قدرتی بھی تھی مگر جس چیز نے سب سے اہم کردار ادا کیا

وہ یہ احساس تھا کہ ہم اسرائیل کے زیر تسلط ہیں، شعور سنبھالتے ہی یہ بات سمجھ آئی کہ فلسطین غلام ہو چکا ہے۔ ہم اپنے مادر وطن میں ہی غیر قرار دیئے جا چکے ہیں۔ میرا لکھنے کی طرف مائل ہونا ایک احتجاج بھی تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ لفظ کی طاقت تلوار کی طاقت کی طرح ہے اور فلسطین کی تحریک آزادی میں لفظ کی قوت بھی تلوار جیسی موثر ہے۔ میرے خیال میں یہی بنیادی وجوہات تھیں جنھوں نے مجھے ذریعہ اظہار کے لئے تحریر کو منتخب کرنے میں ایک کردار ادا کیا تھا۔

س اب تک کن موضوعات پر لکھ چکی ہیں اور کتنی کتابیں آپ کی شائع ہو چکی ہیں؟

ج آج کل میری سیاسی یادداشتوں پر مشتمل کتاب اپنی اشاعت کے آخری مراحل میں ہے۔ اس کتاب میں فلسطین پر اسرائیل کے ناجائز قبضے کی تمام کہانی بیان کی گئی ہے۔ فلسطینیوں کے مسائل اور ان کی جدوجہد آزادی پر مبنی اس کتاب کے علاوہ میری آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میری تمام شاعری دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ بالخصوص ''ہیرو کی واپسی'' اور ''خاردار تاروں کے پیچھے'' نامی کتابیں عالمی سطح پر میرا حوالہ بنی ہیں۔ ان کے تراجم کئی عالمی زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ فلسطین کا مقدمہ ہی میری تحریروں کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ ''مرحوم کی یادداشتیں'' خالصتاً سیاسی موضوع پر مبنی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ تنقید اور دیگر سماجی و ثقافتی موضوعات پر بھی میری کتابیں موجود ہیں۔ پچاس سے زائد اب تک میرے مقالے دنیا بھر کے اخبارات، رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ فلسطین اور مغرب کے اخبارات میں مستقل کالم نگاری بھی کرتی ہوں۔

س ادب میں کن لکھاریوں نے زیادہ متاثر کیا؟

ج محمود درویش اور ابوسلمان کی شاعری نے مجھے بے انتہا متاثر کیا بلکہ میں تو کہوں گی کہ میرے والد اور اہل خانہ کے بعد میرے سیاسی اور ادبی نظریات کی تشکیل میں ان دو شعراء کرام نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ محمود درویش اور ابوسلمان کی شاعری کی بدولت میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہم الفاظ کے ذریعے پورے عالم کو فلسطین کے

عوام کا موقف سمجھا سکتے ہیں۔

س پاکستانی ادیبوں کی تحریریں بھی پڑھنے کا موقع ملا؟

ج جی ہاں! مجھے فیض احمد فیض بہت پسند آتے ہیں۔ پاکستان کے خصوصاً ترقی پسند ادیبوں نے بہت اعلیٰ معیار کا ادب تخلیق کیا ہے۔

س آپ لکھتی کیا صرف عربی زبان میں ہی ہیں؟

ج نہیں! عربی کے علاوہ میں انگریزی میں بھی لکھتی ہوں بلکہ میری دو کتابیں تو پہلے انگریزی زبان میں ہی شائع ہوئیں بعدازاں ان کے عربی زبان میں تراجم شائع ہوئے ہیں۔

س ہمارے پاکستان میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے عنوان سے دو مختلف نظریات اہل قلم میں پائے جاتے ہیں، آپ ان میں سے کون سے نظریئے کی قائل ہیں؟

ج ادب برائے زندگی ہی میری نظر میں معتبر بات ہے۔ ادب برائے ادب ایک مقصد تو ہوسکتا ہے لیکن زندگی کی خاطر ادب تخلیق کرنا زیادہ ارفع مقصد ہے۔

خالد شریف

خالد شریف اردو شعر وادب کا ایسا نام ہے جن کے ذکر کے بغیر ہمارے عہد کا ادبی تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔ آپ نہ صرف نامور شاعر وادیب ہیں بلکہ کتابوں کے عاشق بھی ہیں۔ کتاب سے اسی عشق کی بنیاد پر آپ نے سول سروس چھوڑ کر اشاعتی ادارہ قائم کیا جو کہ ''ماورا'' کے نام سے آج بھی پاکستانی عوام کی علمی وادبی تربیت کے لئے اعلیٰ معیار کی کتب شائع کر رہا ہے۔ لاہور شہر کے مال روڈ پر واقع اسی اشاعتی ادارے کے دفتر میں ان سے گزشتہ دنوں چائے پر ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

س پاکستانی نوجوانوں کے لئے عموماً یہ خوبصورت خواب ہوتا ہے کہ وہ مقابلے کا امتحان پاس کر کے بیوروکریٹ بن جائیں جبکہ شاعروں کو نکمے اور مفلوک الحال افراد کے طور پر نہ صرف میڈیا پیش کرتا ہے بلکہ عوامی رائے بھی کم وبیش یہی ہے۔ آپ اچھے خاصے ڈپٹی کمشنر اور وہ بھی انکم ٹیکس جیسے دبنگ محکمے کے۔ پھر کیا ہوا کہ افسری کو لات مار کر شاعری اور کتابوں کو ہی اوڑھنا بچھونا بنالیا؟

ج وہ یوں تھا کہ پہلا ماسٹرز میں نے اکنامکس کے شعبے میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی سے کیا۔ ان دنوں ہمارے گھر کے معاشی حالات بس ایسے ہی تھے جیسے ہمارے ہاں اکثر وبیشتر لوگوں کے ہوتے ہیں۔ میں چھ بہنوں کا اکیلا بھائی تھا۔ والد صاحب کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی، کوئی خاص کام وہ نہیں کر رہے تھے۔ نرینہ اولاد ہونے کے ناتے گھر کی ذمہ داری مجھے خود پر محسوس ہوتی تھی۔ اس لئے نوکری کرنا وقت کی ضرورت تھی۔ انہی دنوں چانس ملا، مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور کامیاب بھی ہوگیا۔ مجھے انکم ٹیکس کا محکمہ دیا گیا اور پہلی تعیناتی فیصل آباد جو کہ ان دنوں لائل پور ہوا کرتا تھا، کر دی گئی۔

س ضمنی سوال ہے کہ آپ نے اپنے اندر کے شاعر کو کب دریافت کیا؟ نیز باقاعدہ شاعری کیسے شروع کی تھی؟

ج لکھنے پڑھنے کا کیڑا تو مجھ میں شروع سے موجود تھا۔ کالج کے فرسٹ ایئر کے دنوں کی بات ہے کہ نوٹس بورڈ پر طرحی غزل کا اشتہار دیکھا۔ کالج کے طلباء کے مابین اس مقابلے کے لئے طرح مصرع دیا گیا تھا۔ میں نے بھی اس مصرعے پر ٹوٹی پھوٹی غزل کہی اور اپنے کالج کے شعبہ فارسی کے ایک استاد کو دکھائی۔ انہوں نے ایک آدھ مصرع تبدیل کر کے ہمیں دے دی۔ حسن اتفاق سے ہماری اس غزل کو اول انعام مل گیا۔ اسی اول انعام نے ہی ہمیں پکڑ لیا۔ یہی شعری سفر کا نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس انعام کے بعد ہمیں سٹوڈنٹ یونین کے دفتر میں بلا کر کہا گیا کہ اگلے ہفتے ہمیں شعری مقابلے کے لئے جہلم جانا ہے۔ جہلم گئے تو وہاں سے بھی اول انعام اور ٹرفی لے آئے۔ پھر کیا تھا کہ پورے پاکستان میں جاتے اور ٹرافیاں لے کر آتے۔ خوبصورتی یہ تھی کہ ایک تو شاعری کی مشق ہوتی گئی اور دوسرا یہ ہوا کہ دوستوں کی ایک کہکشاں بنتی گئی۔ جن سے مشاعروں اور مقابلوں میں مختلف کالجز میں ملاقات ہوتی تھی۔ اجمل نیازی، محمود شام اور امجد اسلام امجد سے میں پہلی مرتبہ انہی دنوں شعری حوالے سے ملا تھا۔ لاہور آئے تو یہاں سرمد صہبائی کے چرچے تھے۔ جب ان کے مقابلے میں ہماری غزل کو پہلا انعام ملا تو لوگوں کی ہم میں دلچسپی بڑھی کہ یہ کون ہے، اس مقابلے کے جج جناب احمد ندیم قاسمی تھے۔ دماغ میں شاعری کا فتور تو پہلے سے ہی موجود تھا، یہ دریافت کالج کے دنوں ہوا۔

س کالج کے ابتدائی سالوں میں جب آپ نے شعری سفر کا آغاز کیا تھا، کوئی ایسا واقعہ جو بہت یاد آتا ہو؟

ج جہلم میں مشاعرہ تھا۔ پورے پاکستان سے طلباء اس مقابلے میں شریک تھے۔ اسٹیج پر احمد فراز، شہزاد احمد اور احسان اکبر جیسے شعراء بیٹھے ہوئے تھے۔ جب نتیجے کے اعلان کا وقت آیا تو سید ضمیر جعفری نے مائیک پر کہا کہ خالد شریف تمہیں پہلا انعام نہیں دیا جائے گا کیونکہ پچھلے تین مشاعروں میں، میں تمہیں اول انعام دے چکا ہوں۔ تمہارا انعام یہ ہے کہ

تم اسٹیج پر آکر ہمارے ساتھ بیٹھو۔ جہاں پر احمد فراز، شہزاد احمد براجمان تھے جبکہ اول انعام انہوں نے دیگر طالب علم کو دے دیا۔ یہ واقعہ ضمیر جعفری نے اپنی ڈائری میں درج کیا ہے جو کہ اب کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

س اشاعت کے شعبے سے وابستگی کیسے ہوگئی؟ اس شعبے میں تو آپ نے انقلاب برپا کر دیا۔ یہ سب کیسے ہوا؟

ج میرے ماموں جان کے راولپنڈی میں چار پرنٹنگ پریس تھے۔ میرا بچپن انہی پرنٹنگ مشینوں کے درمیان کھیلتے ہوئے گزرا ہے۔ میں کمپوزنگ بھی کر لیتا تھا۔ پرنٹنگ مشین بھی چلا لیتا تھا۔ کتاب سے عشق مجھے ابتدا سے ہی تھا۔ ہمارے گھر کے قریب کتابوں کی ایک بڑی دکان تھی۔ میں اکثر وہاں بیٹھ کر کتابیں پڑھتا۔ کتاب خانے کے مالک سے دوستی کے سبب مجھے وہ کبھی کبھی دکان پر بٹھا کر کسی ضروری کام سے جانا ہوتو چلے جاتے تھے۔ میں اکثر ان کی غیر موجودگی میں کتابیں اور میگزین وغیرہ بیچ بھی دیا کرتا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ کون سی کتاب بکتی ہے اور کون سی پڑی رہتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے ابتدائی عمر میں ہی معلوم ہوگیا کہ کتاب چھپتی کیسے ہے؟ جیسے ہی میرے پاس کچھ پیسے جمع ہوئے میں احمد فراز کے پاس چلا گیا اور ان سے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب چھاپنی ہے۔ مجھے زندگی کا پہلا چائنیز کھانا فراز صاحب نے کھلایا۔ پہلی کتاب میں نے انہی کی چھاپی تھی۔ ان دنوں دو سو کتابیں تو ڈھاکہ چلی جاتی تھیں، پانچ سو کراچی اور لاہور میں بھی کافی کھپت تھی۔ یعنی اگر ہم گیارہ سو کتابیں چھاپتے تو ہمارے پاس کوئی کتاب نہ بچتی تھی۔ فراز کی تو پانچ ہزار کتب کا ایڈیشن چھاپا تھا۔ انہی دنوں رضیہ بٹ کا ناول چھاپا۔ وہ اپنے پبلشر سے ناخوش تھیں، شاید اسی لئے انہوں نے بغیر کسی تفصیل اور ہچکچاہٹ کے کہہ دیا کہ لے جاؤ اور چھاپ دو۔ پھر وہ ہوا جو اکثر سرکاری ملازمین کے ساتھ ہوتا ہے، ہمارا راولپنڈی سے لاہور تبدیلی کا پروانہ ہو گیا۔ ہم روتے پیٹتے لاہور آ گئے۔

لاہور میں ان دنوں فلمسٹار حبیب بہاولپور روڈ پر کچھ فلیٹ بنا رہے تھے۔ ایک ڈیڑھ مرلہ جگہ کا فلیٹ ایک لاکھ چالیس ہزار میں فروخت کر رہے تھے۔ ہمارے پاس صرف چالیس

ہزار تھے۔ انہوں نے فلیٹ دینے پر رضامندی ظاہر کر دی مگر شرط رکھی کہ ان کی فلم کے گانے میں لکھوں۔ میری شرط تھی کہ میں سٹوڈیو نہیں جاؤں گا یہیں بیٹھ کر لکھوں گا۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے رجسٹری ہمیں پکڑا دی اور باقی کی رقم میں قسطوں میں ادا کرتا رہا۔ اسی جگہ میں نے ماورا کے نام سے پبلشنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مال روڈ کی اس عمارت میں بعد ازاں منتقل ہوا۔ یہاں آ کر اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ راولپنڈی میں جس کتاب کو چھاپنے میں چار چھ مہینے لگتے ہیں لاہور میں وہ چار چھ دنوں میں شائع ہو جاتی ہے۔

س آپ کے اشاعتی ادارے کا نام ''ماورا'' آپ کو کیسے سوجھا؟

ج یہ اردو کے عہد ساز شاعر ن م راشد کی پہلی کتاب کا نام تھا۔ ادارے کا نام ''ماورا'' انہی سے مستعار لیا ہے۔ ن م راشد کے کلیات میں میں نے اس کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام بھی آج کل ہم ہی شائع کر رہے ہیں۔

س ابتدائی زندگی کیسی اور کہاں گزری؟ اس بارے میں کچھ بتایئے گا؟

ج ہم لوگ انبالہ سے مہاجر ہیں۔ میری پیدائش 1947ء میں ہوئی۔ میں چھ ماہ کا شیر خوار تھا جب ہم پاکستان ہجرت کر کے پہنچے۔ راولپنڈی میں میرے والد نے راجہ بازار میں گھڑیوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ ابتدائی تعلیم مشن ہائی سکول سے حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج راولپنڈی میں داخلہ لیا اور وہیں سے ایم اے کی ڈگری لی۔ بعد ازاں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے سول سروس میں آ گیا۔

س محسن نقوی اور آپ کی تحریروں کے علاوہ ادبی حلقوں میں یہ بات گفتگو کا موضوع رہتی ہے کہ آپ دونوں کا تعلق پبلشر اور شاعر سے زیادہ دوستی کا تھا۔ اس بارے میں ہمارے قارئین کو کچھ بتائیں گے؟

ج ملکہ کوہسار مری میں 1973ء کو ایک مشاعرہ ہوا۔ میں مشاعرہ پڑھنے کے بعد اسٹیج سے نیچے اترا تو ہجوم میں سے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ یہ محسن نقوی تھے اور ان سے پہلی ملاقات تھی۔ میری کتاب نارسائی کے دیباچے میں محسن نے اس کی تمام تفصیل لکھی ہے۔ پتہ چلا کہ وہ بڑے شاعر اور ذاکر ہیں۔ ہمارا مسلک مختلف تھا۔ وہ سید بادشاہ

تھے اور میں راجپوت مگر میرے دل میں ہمیشہ سے اہل بیت رسولؐ کے لئے ایک نرم گوشہ اور محبت موجود تھی۔ ٹرانسفر ہو کر جب لاہور آیا تو علامہ اقبال ٹاؤن نشتر بلاک میں ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا۔ ہمارے درمیان ایسی دوستی ہوگئی کہ وہ ہمارے گھر کا فرد بن گیا۔ میری بیگم ان کی بہن بن گئی۔ محسن نقوی کو بطور شاعر ہمارے ادارے نے متعارف کروایا۔ گو کہ زمانہ طالب علمی میں ان کی کتاب شائع ہو چکی تھی مگر وہ ان کو پسند نہیں تھی۔ بہت بری چھپی تھی اور شاعری بھی طالب علمی کے دور کی تھی۔ میں نے کتاب شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے 1978ء میں برگ صحرا کا مسودہ دے دیا۔ ساتھ ہی اپنا مخصوص جملہ کہ یہ آپ کے لئے چیلنج ہے۔ اسے کیسے خوبصورت چھاپتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں آپ کو گولڈ دے رہا ہوں اس کے بعد ان کی کتابیں آتی رہیں، میں شائع کرتا رہا۔ شام کو وہ روزانہ چار بجے کے قریب ''ماورا'' آجاتے۔ یہاں سے ہم آٹھ بجے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل چلے جاتے، ہماری شامیں اکثر اکٹھے گزرتیں۔ پی سی سے ہم گھر چلے جاتے۔ واپسی پر وہ لبرٹی مارکیٹ سے قوام والا پان لیتے تھے۔ ان کی شہادت تک ہماری یہی روٹین رہی۔ ہم دونوں میں ایک بات مشترک تھی کہ ہم کسی بھی ادبی گروہ کا حصہ نہیں تھے۔

س یہ عجیب بات ہے کہ آپ نے سینکڑوں کتابیں شائع کیں مگر آپ کی اپنی پہلی کتاب بہت تاخیر سے شائع ہو، اس کی کیا وجہ تھی؟

ج پہلی کتاب تو میری ان دنوں ہی مکمل ہوگئی تھی جب میں راولپنڈی میں تعینات تھا، کتابت بھی کروالی گئی تھی۔ یہ ہوتا رہا کہ پہلے کوئی اور کتاب آگئی۔ کبھی فراز، کبھی محسن نقوی اور منیر نیازی، کبھی قتیل شفائی اور مظفر وارثی کی کتاب۔ جن دنوں ٹی وی ڈرامہ ''وارث'' آیا تو امجد اسلام امجد کی کتابوں کی فروخت میں ایک دم اضافہ ہوگیا۔ بہت سارے سال گزر گئے۔ محسن نقوی نے دیباچہ بھی لکھ دیا۔ خیر اب تو اس کتاب کے پچیس ایڈیشن ماشاء اللہ شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تین شعری مجموعے اور دو انتخاب شائع ہوئے ہیں۔

کچھ شعر، چند دوست، کتابیں، کسی کا پیار
خالد یہی کمائی میری عمر بھر کی ہے

دالیاسٹاپانکوٹی

ڈاکٹر دالیاسٹاپانکوٹی کا نام عالمی ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔سکالر، فلسفی، مترجم و محقق ہونے کے علاوہ ممتاز ماہر تعلیم بھی ہیں۔روس کی سینٹ پیٹرز برگ یونیورسٹی سے فلسفے میں امتیازی حیثیت سے ڈگری لینے کے بعد برطانیہ میں پی ایچ ڈی کرنے کے علاوہ وہاں پڑھتی بھی رہی ہیں۔لتھونیا میں پیدا ہوئیں جو اس وقت سوویت یونین کا حصہ تھا اور بعد ازاں الگ ملک بن کر یورپی یونین کا حصہ بن گیا۔عمر کا زیادہ تر حصہ انہوں نے پردیس میں گزارا اور یہی ہجرتیں ان کی عالمی شہرت یافتہ تحریروں کا موضوع بھی ہیں۔صوفی ازم میں خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں۔کئی عالمی ادبی ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں اور ان کی تخلیقات کے کئی زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔پنج زبان میں، اپنی مادری زبان کے علاوہ روسی، انگریزی، یونانی اور جرمن بھی روانی سے بولتی ہیں۔آج کل جرمنی کے شہر ہیمبرگ کی یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہیں۔پچھلے دنوں محترم فخر زمان نے لاہور میں انٹرنیشنل پنجابی کانگریس کے زیر اہتمام عالمی امن کانفرنس کا اہتمام کیا تو اس میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر پاکستان تشریف لائیں۔قارئین کے لئے ان سے ہونے والی گفتگو کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔

س ہم آپ کو پاکستان میں خوش آمدید کہتے ہیں۔سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ کو یہاں آ کر کیسا محسوس ہو رہا ہے؟ اور کیا یہ آپ کا پاکستان کا پہلا دورہ ہے؟

ج پاکستان میں پہلی دفعہ نہیں آئی بلکہ چار سال پہلے اسلام آباد میں اکادمی ادبیات کی جانب سے منعقدہ کانفرنس میں بھی شریک ہو چکی ہوں۔پہلی مرتبہ پاکستان میں آنے اور

ادبی کانفرنس میں شریک ہونے کا تجربہ بہت شاندار رہا تھا اور یہی پسندیدگی میری دوسری دفعہ آنے کی وجہ بھی ہے۔ پاکستان دوبارہ آنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میں پچھلی دفعہ صرف اسلام آباد ہی دیکھ پائی تھی اور لاہور کی سیاحت سے محروم رہی تھی۔ اس تاریخی شہر کو دیکھنے کی خواہش بھی میرے پاکستانی دورے کی وجہ بنی ہے۔

س ہمارے قارئین آپ کی اپنی زبان سے سننا چاہیں گے کہ آپ نے اب تک ادب میں کیا کام کیا ہے؟ اپنی تحریروں کے بارے میں کچھ بتائیں گی؟

ج (عاجزی سے) میری لکھنے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ میں نے بطور سکالر لکھنا شروع کیا تھا۔ بطور محقق اور نقاد میری ادبی تحریروں کا آغاز ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد میری زندگی میں کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ میں تراجم کرنے لگی۔ میں نے کلاسیکی ادب بطور خاص یونانی ادب کو لتھونین زبان میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ لتھونیا میں اس کی بہت ضرورت تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد لتھونیا ایک الگ ملک بنا تھا اور عالمی ادب کو لتھونین زبان میں ترجمہ کرنا بڑا ضروری تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ بطور مترجم میں نے اپنے ملک کے لئے بڑا ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ قدیم یونانی ادب اور جدید یونان کے ادب کو میں نے اپنی زبان میں ترجمہ کرنے میں کافی محنت اور کام کیا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ میں نے تخلیقی تحریریں رقم کرنا شروع کر دیں۔ میری ذاتی تحریروں کی عمر دس سال کے قریب ہے۔ تخلیق کی بات کروں تو اس حوالے سے میری اب تک دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میرے موضوعات ہجرت اور گلوبلائزیشن کے متعلق ہیں۔ دور جدید کے مسائل جیسا کہ مختلف النسل خاندان، وہ بچے جن کے والدین مختلف ممالک اور لسانی پس منظر رکھتے ہیں۔ مادری زبان کا کھو دینا۔ میرا اپنا کنبہ مختلف النسل ہے۔ میرے خاوند کا تعلق یونان سے تھا جس سے میری دو بیٹیاں پیدا ہوئیں، ان کی پیدائش قبرص میں ہوئی تھی اور وہ خود کو سائپرس کی باسی سمجھتی ہیں۔ لتھونیا کو اپنا ملک نہیں مانتیں۔ ایک ماں کی حیثیت سے میرے بہت سارے تحفظات ہیں۔ بہت سارے مسائل ہیں، نفسیاتی اور جذباتی تھی۔ میں نے اس متعلق اونچی آواز کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا ہے اور لکھنا شروع کر دیا ہے۔ جب اس

متعلق میری پہلی کتاب شائع ہوئی تو اسے بڑی کامیابی ملی۔اس پذیرائی کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ یہ صرف میرا مسئلہ نہیں تھا بلکہ بہت سارے خاندان ان مسائل سے نبرد آزما تھے۔

س عام طور پر آپ نثر تحریر کرنے کے لئے کون سی صنف پسند کرتی ہیں؟ کیونکہ لکھتی تو آپ تقریباً سبھی اصناف ادب میں ہیں؟

ج میری پسندیدہ صنف تو سفر نامہ ہے۔سفر نامے کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں نثر کی سبھی اصناف سما سکتی ہیں۔مضامین، کہانی، بیانیہ اور بھی بہت کچھ بہت کچھ۔ میں بذات خود تو سفر نامہ کہانی کی شکل میں لکھتی ہوں۔ایک بڑی کہانی جس کے اندر کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہوتی ہیں، جیسے ایک طرح کا ناول۔

س آپ کے خیال میں سفر نامہ فکشن ہے؟ یا پھر سفر نامے کو فکشن نہیں کہا جاسکتا؟

ج دیکھو یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں جواب دینے کی، سفر نامہ حرکت کو ظاہر کرتا ہے، سفر کے دوران آپ مختلف لوگوں سے ملتے ہیں جو بعض اوقات نہیں چاہتے کہ ان کا نام ظاہر کیا جائے، کبھی کبھی آپ حقائق کے ساتھ ساتھ افسانہ بھی شامل کر دیتے ہیں۔اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ یہ فکشن بھی نہیں ہے اور نان فکشن بھی نہیں بلکہ دونوں کے درمیان کی ایک چیز ہے۔یوں کہہ لیں کہ اس کی دوہری شناخت ہے۔

س سفر نامے کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سنجیدہ ادب کا حصہ نہیں ہے اور تراجم کی بھی عمومی طور پر ادبی حیثیت متنازعہ سمجھی جاتی ہے۔یہاں وضاحت کر دوں کہ میں نے خود بھی ہسپانوی زبان کے اردو میں گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری ترجمہ کی ہے اور حال ہی میں میرا جاپان کے بارے میں سفر نامہ بھی شائع ہوا ہے۔اس کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

ج سفر نامہ بلا شبہ ادب کا حصہ ہے۔سفر کی دستان تحریر کرنا عین ادب ہے۔جب آپ کسی جگہ جاتے ہیں تو آپ کا بیانہ اس جگہ میں سے کہانی تشکیل دیتا ہے۔معلومات کے ساتھ تجربہ مل کر ایک نئی چیز تخلیق کرتا ہے۔لوگوں کے ساتھ ملنا، ان سے بات چیت کر کے آپ ایک کہانی تخلیق کرتے ہیں۔آپ اس کہانی کے ہیرو ہوتے ہیں اور آپ کے ارد گرد

ایڈونچر ہورہا ہوتا ہے۔میرے خیال میں سفرنامہ ایک ایڈونچر کہانی بھی ہے اور ترجمہ بھی۔ کیونکہ سب سے پہلے تو آپ اردگرد کے ماحول کو اپنے لئے قابل فہم بناتے ہیں۔آپ کے اردگرد بہت سارے سائن بورڈ ہوتے ہیں جنہیں آپ فوری ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔پھر تحریر کرتے ہوئے اپنے مشاہدات و تجربات کو بیانیے کا رنگ دیتے ہیں۔آپ نے کہا کہ یہ مین سٹریم کا حصہ نہیں سمجھا جاتا تو میں کہوں گی کہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ مین سٹریم کسے قرار دیتے ہیں۔اگر آپ کہتے ہیں کہ ناول مین سٹریم ہے تو پھر ناول انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں تو مقبول ترین صنف رہا ہے لیکن اب اکیسویں صدی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ناول کے قارئین سکڑتے جا رہے ہیں۔ناول پس منظر میں جارہا ہے اور شاعری عالمی سطح پر دوبارہ مقبول ترین صنف سخن بن کرابھر رہی ہے۔مین سٹریم کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔مگر شاعری کا ان دنوں چرچا ہے کہ آپ شاعر کو مدعو کر سکتے ہیں۔ شاعری با آسانی ساتھ لے جائی جاسکتی ہے۔مشاعرہ بھی ایک خوبصورت روایت ہے مگر ناول کا یہ معاملہ نہیں۔میرے خیال میں ادب کا مستقبل شاعری ہے۔

س ہمارے شعراء کرام تو آپ کی بات سن کرنہال ہو جائیں گے۔آپ نے خود بھی شاعری کرنے کی کبھی کوشش کی ہے؟

ج میں نے مختلف زبانوں کی شاعری کا لتھونین زبان میں ترجمہ کیا ہے۔بلکہ حال ہی میں میرا جدید یونانی شعراء کے کلام کا ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے جسے بھرپور عوامی پذیرائی ملی ہے۔خود شاعری کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی مگر یہ آج تک کی صورتحال ہے۔

س آپ نے آپ بیتی لکھی۔تراجم کیے۔کہانیاں تخلیق کیں۔کیا اخبارات میں مضامین بھی لکھتی ہیں؟

ج ہاں!ہاں! فلسفے اور تراجم کے موضوع پر میں مستقل اخبارات میں لکھتی رہتی ہوں۔ ادب اور تنقید کے ساتھ ساتھ مابعد فلسفہ میرا محبوب موضوع ہے۔کیونکہ میں نے روس کے شہر سینٹ پیٹرز برگ میں فلسفے کے موضوع پر پہلی ڈگری حاصل کی تھی۔اس کے بعد میں نے جو کچھ بھی پڑھا اور جو کچھ بھی کیا وہ میرے فلسفہ کے پس منظر سے ہی منسلک ہے۔

س آپ کی صوفی ازم سے دلچسپی کی کیا وجہ ہے؟ صوفی ادب سے آپ کا رشتہ کیسے پیدا ہوا؟

ج صوفی ازم سے میری رغبت کا باعث میرا قبرص میں قیام تھا۔ قبرص میں مجھے اپنے قیام کے دوران بہت سے صوفی شعراء سے ملنے کا موقع میسر آیا۔ ترکی میں تو آپ صوفی ازم یونیورسٹی میں پڑھ سکتے ہیں۔ ترکی سے قربت کے باعث میں صوفی ادب کے کئی پروفیسرز صاحبان سے ملتی رہی۔ مگر میری بنیادی دلچسپی کا موضوع صوفیانہ شاعری ہے۔ صوفیانہ شاعری میں بہت گہرائی اور دانائی ہے۔ یہ ادبی اور عقلی تاریخ کا نچوڑ ہے۔ میرے پاکستان آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ خطہ صوفیاء کرام اور صوفیانہ شاعری کا مرکز رہا ہے۔ میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ سیاسی حالات کی وجہ سے کچھ مسائل ضرور ہیں لیکن یہ سرزمین بنیادی طور پر صوفیاء کرام کی ہے۔ یہ متمول تاریخ اور تہذیب کا خطہ ہے جہاں اب بھی صوفی ازم اپنا وجود رکھتا ہے۔

س کیا لتھونیا میں بھی صوفی ازم کے موضوع پر کوئی کام ہو رہا ہے؟

ج زیادہ تر کام تو انگریزی زبان میں ہی ہوا ہے۔ ایک ادیب نے لتھونین زبان میں صوفی ازم پر کام کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا مگر بدقسمتی سے وہ بہت چھوٹی عمر میں ہی انتقال کر گیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں اس کے ادھورے کام کو پورا کروں گی اور اس کی خالی کی ہوئی جگہ کو پر کروں گی۔ میں پاکستان اور صوفی ازم سے اپنے تعلق پر ایک کہانی بھی لکھ رہی ہوں۔ اس موضوع پر میں اپنی ادبی اور علمی ریسرچ مکمل کر چکی ہوں۔

پس تحریر: ڈاکٹر والیا کو پاکستان اتنا پسند آیا ہے کہ وہ لاہور میں کم از کم تین چار مہینے اپنے اور کسی کالج یونیورسٹی میں پڑھانے کی خواہشمند ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے کاغذات بھی بھجوا دیئے ہیں۔ جب ان سے پاکستان میں امن وامان کی تشویشناک صورتحال کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ بات میرے دماغ میں آنے والی آخری چیز ہے، یعنی کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

شہزاد احمد

س کیا ہمارے علمی، ادبی ثقافتی ادارے آپ کے خیال میں کوئی تعمیری کام کر رہے ہیں؟

ج یہ سوال اگر سرکاری اداروں سے متعلق ہے تو اس کا جواب اور ہو گا اور اگر سوال ایسے اداروں سے ہے جو غیر سرکاری ہیں تو ممکن ہے سوال کی نوعیت بالکل بدل جائے۔ جہاں تک سرکاری اداروں کا تعلق ہے۔ اس میں کارکردگی کا معیار ہمیشہ کمزور رہا ہے۔ کیونکہ سرکاری طور پر ان اداروں کا سربراہ ہونے کے لیے صرف سیاسی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو ان اداروں کا سربراہ بنایا جاتا ہے۔ جو ان اداروں کی کارکردگی میں کچھ اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ان اداروں کے مقاصد کے بارے میں سرے سے کچھ جانتے ہیں۔ کچھ ادارے ایسے ہیں جن کا وجود ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ مثال کے طور پر مقتدرہ قومی ادارہ اس لیے بنایا گیا تھا کہ اردو کو اس کی وساطت سے دفتری زبان بنایا جائے گا۔ ۱۹۸۶ء میں اردو کو مکمل طور پر دفتری زبان کے طور پر نافذ ہونا تھا۔ ۸۶ء گزر گیا پھر ۸۹ء گزر گیا۔ اب تک ۱۳ برس گزر چکے ہیں۔ نہ قومی اسمبلی میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ یوں لگتا ہے یہ حکومت اور اس سے جو پچھلی حکومتیں تھیں اردو کو دفتری زبان بنانا نہیں چاہتیں۔ میں اس بات پر اصرار نہیں کرتا کہ اردو کو ضرور دفتری زبان ہونا چاہیے۔ لیکن اس سلسلے میں دو ٹوک فیصلہ ضرور ہو جانا چاہیے کہ اردو دفتری زبان ہو گی یا نہیں۔ حکومت نہ اردو کو دفتری زبان بنانے کا فیصلہ کرتی ہے اور نہ وہ مقتدرہ قومی زبان کے ادارے کو ختم کرتی ہے۔ حکومت کروڑوں روپے فضول میں ایسے ادارے پر خرچ کر رہی ہے۔ جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ایک اردو سائنس بورڈ کا ادارہ ہے جس کا رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو اس ادارے کا سربراہ بنایا جاتا رہا ہے۔ جو سائنس کی مبادیات بھی نہیں جانتے۔ میں نام تو نہیں لیتا لیکن ایسے لوگوں کو اس

ادارے کا سربراہ ہونا چاہیے جو سائنسی علوم سے کم از کم ہمدردی رکھتے ہوں اور سائنسی مسائل کو سمجھتے ہوں۔ جہاں تک سرکاری اداروں میں ادب دوستی کا سوال ہے اس سلسلے کا سارے کا سارا روپیہ تقریباً ضائع ہو رہا ہے۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جہاں روپے کا صحیح مصرف نکل آتا ہے۔ ہاں البتہ نجی طور پر بعض ادارے اپنے طور پر کچھ کام کر رہے ہیں۔

س خالد احمد نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اس دنیا میں خوبصورت چہرہ رکھنے والا انسان زندگی میں کسی اضطراب کا شکار نہیں ہوتا۔ مگر کم شکل لوگ اپنی شخصیت میں کوئی ایسا کرشمہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ان کو خوبصورت لوگوں کے سامنے لا کھڑا کرے۔ اس سلسلے میں انسان مختلف ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے۔ شعر کہتا ہے، افسانے لکھتا ہے۔ کالم نگاری کرتا ہے وغیرہ وغیرہ آپ اس سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

ج بات یہ ہے کہ اگر آدمی خوش شکل ہو تو پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں بہت سی مزاحمت جو لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے وہ فوری طور پر پیدا نہیں ہوتی ایک سرٹیفکیٹ ہوتا ہے فوری طور پر قبول کیے جانے کا۔ پھر اس کے ساتھ اگر آواز بہتر ہو، لباس اچھا ہو تو یہ کوالفیکیشن ہے اور اگر اس کے ساتھ اگر اسے کچھ آتا جاتا بھی ہو تو یہ ایک ایکسٹرا کوالفیکیشن ہے۔ اس لحاظ سے میں خالد احمد کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔

س سچ کے نام پر ادب میں بدتمیزی کی جو لہر چلی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے اور اس کا ادبی مستقبل پر کیا اثر پڑے گا؟

ج ہر آدمی کے نزدیک سچ کی اپنی تشریح ہے۔ بعض لوگ صرف اسی کو سچ سمجھتے ہیں جو ان کے اپنے لیے قابل قبول ہو۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جو جمہوریت کے عمل سے حاصل کیا گیا ہو وہاں سچ کے معنی اس قدر محدود نہیں ہو سکتے۔ سچ ایسا ہونا چاہئے جو معاشرے کے لیے زیادہ سے زیادہ قابل قبول ہو۔ محض اپنے سچ کو لے کر نہ آپ اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں نہ معاشرے کے مسائل گرفت میں لے سکتے ہیں۔ اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ سب سے بڑا جھوٹ ہوتا ہے۔

س ادبی گروہ بندیاں ادب کی ترقی کے لیے سودمند ہیں یا نقصان دہ؟

ج: ادبی گروہ بندیاں ادب کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اور قدرتی بن جاتی ہیں۔ اگر آپ ایک خاص طرح کا مزاج رکھتے ہیں۔ مثلاً آپ غزل کہنے والے ہیں تو آپ کے دوست بھی غزل کہنے والے ہوں گے۔ اور اگر آپ افسانہ لکھتے ہیں تو آپ کا اٹھنا بیٹھنا افسانہ لکھنے والے لوگوں کے ساتھ ہوگا یہ ایک قدرتی طریقہ ہے مل بیٹھ کے کام کرنے کا۔ مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں آپ اپنے حقوق کا تقاضا تو کرتے ہیں لیکن اپنے فرائض کی طرف توجہ نہیں دیتے صرف حقوق کے سلسلے میں نعرے بازی کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ بیچ میں رہ جاتا ہے کہ آپ کے فرائض کیا ہیں۔ یہ بہت ضروری بات ہے کہ جب گروہ بنایا جائے تو اس گروہ کو کسی سیاسی یا سماجی مسئلے کے لیے مثبت طور پر تو استعمال کیا جائے لیکن منفی استعمال نہ ہو۔

س: بقول اشفاق احمد کالم نگاری ادبی صنف نہیں ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے خاص طور پر مشتاق یوسفی، ابن انشاء، عطاء الحق قاسمی اور منو بھائی کے کالموں کے حوالے سے۔

ج: دیکھیں عمومی طور پر اشفاق احمد کی اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ کیونکہ عام طور پر ہمارے ہاں جو کالم لکھے جاتے ہیں ان کے موضوعات روز مرہ کے گزر جانے والے موضوعات ہوتے ہیں۔ اور کالم نویسی میں زیادہ احتیاط بھی نہیں کی جاتی نہ کالم نگار کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ ادبی لحاظ سے کالم کی نوک پلک سنوار سکے۔ مگر بعض اوقات کالم بھی ایسا ہوسکتا ہے جو ادب کی سطح پر آسکتا ہے۔ اب یہ ہر کالم پر الگ منحصر ہے کہ اس کو کس حد تک ادب کہا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اصولی طور پر اشفاق احمد کی بات درست ہے لیکن یہ بات ہمیشہ کے لیے درست نہیں ہے۔

س: کسی ایک تخلیق کے بارے میں ایک ہی سطح کے دو ادیبوں کی متضاد رائے کو آپ کیا نام دیں گے؟

ج: یہ ہوسکتا ہے دونوں کے پاس جو جواز موجود ہو۔ کیونکہ ادب ہمیشہ مکمل سچائی نہیں ہوتا اور یہ بالکل سچائی ہے۔ دو آدمی اگر پوری ایمانداری سے بات کر رہے ہیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ متضاد ہونے کے باوجود اپنی اپنی جگہ دونوں سچے ہوں۔

س: فلیپ اور دیباچہ نگاری کا فائدہ یا نقصان کیا ہے۔ آپ اسے تنقید یا ستائش کے

کس خانے میں رکھیں گے؟

ج: فلیپ اور دیباچہ نگاری کی مثال سہرابندی کی ہے جب دولہا کو سجایا جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ، میک اپ، تو کیا جاتا ہے۔ یہی حال دیباچہ اور فلیپ نگاری کا ہے۔ یہ باقاعدہ تنقید کے زمرے میں نہیں آتے اس میں فن پارے کے صرف مثبت پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے اور اس کا مقصد صرف لکھاری کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

س: ٹی وی چینلز کی بھرمار اور انسان کی بے انتہا مصروفیت کے دور میں ادب اور ادیب کا مستقبل کیا ہے۔

ج: اصل میں ہم ایک ایسے دور میں سے گزرے ہیں۔ جس میں ادب کو سب کا مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں تانگے والا بھی شعر کہہ لیا کرتا تھا۔ جو بھٹیارن تھی وہ بھی شعر کہتی تھی۔ اب نہ تانگے والے کو فرصت ہے نہ بھٹیارن کے پاس وقت ہے۔ اب چونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اس لیے بہت تھوڑے لوگ رہ گئے ہیں جو ادب کو پڑھتے ہیں اور ادب کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں۔ ادب کی اہمیت انسانی زندگی میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس اہمیت میں عمر یا وقت کے لحاظ سے کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ادب صرف نوجوانوں کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ لیکن آگے چل کے ادب زیادہ عمر کے لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنے گا۔ اس وقت جو شاعری پسند کی جارہی ہے وہ نوجوانوں کے موضوعات ہیں لیکن بعد میں جو ادب لکھا جائے گا وہ ایسے لوگوں کے متعلق ہوگا جن کے پاس وقت بھی ہے اور جن کی عمر یں رسیدہ ہیں۔ اس وقت ادب میں جذباتیت کم ہو جائے گی۔ مگر گہرائی زیادہ ہوگی لیکن اس کے پڑھنے والے کم ہوں گے۔

س: کیا شاعر اور ادیب کے لیے کسی نظریے کا حامل ہونا ضروری ہے؟

ج: بالکل ہونا چاہیے۔ مگر یہ کہ دوسروں پر اپنے نظریے کو تھوپنا نہیں چاہیے۔ یہی غلطی ترقی پسندوں نے کی تھی۔ اور انہوں نے اس کا برا حشر بھی دیکھا۔ ادب اپنے طور پر ایک مقصد ہے۔ اس کو کسی اور مقصد کے تابع نہیں ہونا چاہیے۔ جو آپ محسوس کرتے ہیں بس اسی کو بیان کریں اور اس بات کو بھول جائیں کہ پہلے سے متعین مقاصد پر لکھیں۔ ادب سے مراد یہ

ہے کہ آپ جس طرح جو محسوس کرتے ہیں۔اس کو بغیر کسی خیانت کے ویسا ہی بیان کریں۔

س آج کی غزل کس مقام پر ہے؟

ج آج کی غزل بڑے اچھے مقام پر ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کلاسیکی غزل کا انتخاب کیا جائے تو ممکن ہے جدید شاعروں کا انتخاب کلاسیکی شعراء کے انتخاب کے برابر ٹھہرے۔اس دور میں بڑی اچھی غزل ہو رہی ہے اور اس میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو زیادہ معروف نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں غزل نے ترقی کی ہے اس کے موضوعات میں بہت اضافہ ہوا ہے۔اس میں افقی اور عمودی دونوں طرح ہی ترقی ہوئی ہے۔

س موجودہ دور میں اردو کے کون کون سے شاعر پسند ہیں۔

ج نام لینے میں گڑ بڑ ہو گی۔اس لیے میں کسی کا نام نہیں لوں گا۔ کیونکہ بعض اوقات آپ بہت اہم نام بھول جاتے ہیں جو ساری عمر کے لیے طعنہ بن جاتے ہیں۔

س پنجابی لکھنا کیوں چھوڑا؟

ج یہ میرے لیے واقعی دکھ کی بات ہے۔ مجھے پنجابی لکھتے رہنا چاہیے تھا۔ مگر مشکل میرے لیے یہ ہے کہ پڑھتا میں انگریزی ہوں، لکھتا اردو ہوں، اور بولتا پنجابی ہوں۔اصل میں ایک عجیب سا سوشل رویہ ہمارے ہاں چل نکلا ہے کہ جب ماں کے پاس بیٹھیں گے تو پنجابی بولیں گے۔ جب سکول میں جائیں گے تو اردو بولیں گے اور جب ذرا سا علمی مسئلہ ہو گا تو انگریزی میں بولیں گے۔

س تو کیا پنجابی کے بارے میں ہمارے ہاں احساس کمتری ہے؟

ج نہیں میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔اصل میں پنجابی اور اردو کے درمیان فاصلہ بہت کم ہے۔صرف چند ایک الفاظ بدل دینے سے اردو بن جاتی ہے اور اردو کا چونکہ ابلاغ پنجابی کی نسبت زیادہ ہے۔اس لیے اردو کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ ہاں اگر اردو اور پنجابی بالکل متضاد زبانیں ہوتیں تو صورتحال یقیناً مختلف ہوتی۔

شہزاد احمد دُنیا سے چلے گئے ہیں۔شعر و ادب کا ایک باب تکمیل کو پہنچا۔ ''کل نفس

ذائقۃ الموت'' فرمان ہے اس پاک پروردگار کا جس کے قبضہ قدرت میں سب کی جان ہے۔ یقیناً ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہمیشہ باقی رہنے والا تو خدائے ذوالجلال کا چہرہ ہی ہے۔ دل کو مگر یقین نہیں آتا کہ وہ اس جہانِ فانی سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ یقین کرنا یوں بھی دشوار پاتا ہوں کہ پچھلے ہفتے ان سے ٹیلیفون پر گپ شپ ہو رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور قہقہے بکھیرتا کٹیلا لہجہ۔ دراصل کالم لکھتے ہوئے میں ایک لفظ پر اٹک گیا تھا۔ کپڑے کی باریک کترن کو ہماری پنجابی زبان میں ''لیر'' کہتے ہیں۔ اُردو زبان میں اسے کیا لکھا جائے؟ بہت سوچا اور کئی کتابیں ٹٹولیں مگر جواب ندارد۔ کسی سے پوچھ لیا جائے؟ رہنمائی لینے کا خیال آتے ہی شہزاد احمد ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب کا نام ذہن میں اُبھرا۔ فون کر کے میں نے انہیں اپنی اُلجھن بتائی۔ بڑے پیار سے انہوں نے سمجھایا کہ اُردو میں بھی اسے ''لیر'' ہی لکھ دیں۔

باباجی اشفاق احمد کہ جن کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا شرف مجھے حاصل رہا ان کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اُردو زبان کا ہاضمہ بہت اچھا ہے۔ نئے الفاظ سمونے کی اس زبان کی صلاحیت بے مثال ہے۔ ایسا عالم شخص کہ لاکھوں نہیں کروڑوں میں ایک، مگر علم پر غرور و تکبر کا سایہ تک ان کو چھو کر نہ گزرا تھا۔ تصنع و بناوٹ نام کی کسی چیز سے تو ان کی شخصیت واقف ہی نہ تھی۔ کتاب سے بے پناہ محبت کرنے والے آدمی تھے۔ بہت سی کتابیں انہوں نے مجھے تحفے میں دیں۔ کتاب کی فرمائش وہ مجھ سے ہر ملاقات میں کیا کرتے تھے۔ اس بات کا افسوس مجھے تمام عمر رہے گا کہ انہوں نے مجھے جاپان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کی گئی کچھ کتابیں لانے کی خواہش کا اظہار کیا جسے میں پورا نہ کر سکا اور کتاب کے علاوہ انہوں نے کبھی کوئی فرمائش کی بھی نہیں تھی۔ مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔

مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر تعینات ہوئے تو کتابوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی۔ کئی نایاب کتب کی تازہ اشاعت کا اہتمام کیا۔ بہت سی اہم کتابیں نستعلیق خط میں نہیں تھیں۔ ان کو دورِ حاضر کے مقبول خط نوری نستعلیق میں شائع کروایا۔ ہمارے ملک میں عموماً

سرکاری عہدیداروں کی عزت وتکریم ان کی کرسی کی وجہ سے ہوتی ہے۔مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ان عہدوں اور کرسیوں کو عزت بخشتے ہیں۔شہزاد احمد بھی ایسے ہی نابغہ روزگار شخص تھے۔انہوں نے مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر کا عہدہ قبول کر کے اس عہدے کو عزت بخشی۔انہوں نے اپنے فرائض کو نہ صرف بخوبی سرانجام دیا بلکہ آنے والے آئندہ افسران کے لیے بھی ایک بلند معیار مقرر کر دیا ہے۔وہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارہ تھے۔اپنی ذات میں انجمن ہونے کا مطلب اگر کسی کو سمجھ نہ آ رہا ہو تو صرف شہزاد احمد کی زندگی پر ایک نگاہ ڈال لے۔تاریخ میں زندہ رہنے کے لیے وہ کسی منصب کے محتاج قطعاً نہیں تھے۔ان کی خوبصورت شاعری عمر خیام کی طرح انہیں ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔عالم مغرب کو جن چند مسلم تاریخی کرداروں نے اپنا گرویدہ بنایا ان میں سے ایک نام عمر خیام کا ہے۔وہ یتیمی اور غریبی میں بچپن گزار کر فقط اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر ترک، ایران کی مشترکہ سلطنت کے سلجوقی حکمران کے دربار تک پہنچا۔شاہی منجم مقرر ہونے کے ساتھ ہی شہنشاہ ملک شاہ کا قریبی مشیر بن گیا۔ابراہیم خیمہ فروش کے بیٹے عمر نے اپنا تخلص خیام رکھا۔

ایک جنگ کے ہنگام، جس میں عمر خیام سترہ سالہ عام نوجوان سپاہی کے طور پر سلجوق بادشاہ الپ ارسلان کی سپاہ میں دادِ شجاعت دے رہا تھا تو اس نے وہاں تین پیشین گوئیاں کی تھیں۔اوّل: الپ ارسلان جنگ جیتے گا۔دوم: رومی اور سلجوقی دونوں بادشاہ قتل ہو جائیں گے۔سوم: ملک شاہ زمام اقتدار سنبھالے گا۔اس وقت کے درپیش حالات میں یہ تینوں باتیں انہونی سی لگ رہی تھیں کہ جنگ میں رومیوں کا لشکر الپ ارسلان کی فوج سے چھ گنا بڑا تھا اور جدید ہتھیاروں سے لیس۔دونوں بادشاہوں کا مارا جانا غیر منطقی بات تھی اور ملک شاہ کے تخت نشین ہونے کا جہاں تک تعلق تھا تو وہ ابھی نوعمر تھا۔چشم فلک نے مگر دیکھا کہ ایک سال کے اندر یہ تینوں پیشگوئیاں سچ ثابت ہو گئیں۔انہی پیشگوئیوں کی صداقت کے صلے میں وہ شاہی ستارہ شناس بنا دیا گیا۔

(پس تحریر/ عامر بن علی)

شہرت بخاری

شہرت بخاری کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے شہرت بخاری لندن میں مقیم ہیں۔ لندن میں رہنے کے باوجود ان کا انداز بالکل روایتی ہے، لاہور کا نام سن کر اب بھی ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

س آپ ایک طویل عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں۔ لندن اور انگریزوں کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

ج میرے نزدیک پاکستان کے بعد رہنے کے لیے سب سے اچھی جگہ لندن ہے اور لندن میں بھی پرانا لندن۔ پرانے لندن کے لوگ بڑے روایتی ہیں۔ ہمیشہ روایتوں کا پاس رکھتے ہیں۔ یہاں کا موسم بھی بہت خوب ہے اور ماحول بھی، جہاں تک گوروں کا تعلق ہے تو میری دانست میں گورے بڑے غیر متعصب ہیں۔ کبھی بھی تعصب سے کام نہیں لیتے یہاں میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ کچھ سال پہلے میں اور میری بیوی لندن میں ایک سٹیشن پر بیٹھے ہوئے تھے کہ نشے میں دھت ایک انگریز پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر یونہی خالی نظروں سے تکتا رہا پھر قومیت کی بنیاد پر ہمیں گالیاں دینے لگا اور ہمارے سامنے تھوک کر چلا گیا۔ میں خیر انتہائی افسردہ ہوا اور میری بیوی مجھ سے زیادہ کہنے لگی کہ میں نہ کہتی تھی کہ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے واپس چلے چلیں۔ ہم ابھی اپنی زبان میں یہی باتیں کر رہے تھے کہ قریب ہی کھڑا ایک انتہائی معزز انگریز ہمارے پاس آیا اور بڑی

معذرت کرنے لگا کہنے لگا، خدا کی قسم ہم ایسے لوگ نہیں ہیں جیسا یہ شرابی تھا، اور باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر اس شرابی کی حرکت پر معافی مانگنے لگا یہ تو خیر ایک واقعہ ہے اس طرح کے کئی واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ جن سے انگریزوں کی وسیع القلبی کا ثبوت ملتا ہے۔

س لندن میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

ج عامر: بیٹا لندن میں سب کچھ ہے بس لاہور نہیں ہے۔

س اچھا: لاہور کے متعلق آپ کافی رومانوی معلوم ہوتے ہیں؟

ج ہاں: بالکل لاہور سے مجھے عشق ہے۔ لاہور کا دل اور دامن بہت وسیع ہے۔ ہر نئے آنے والے کو جگہ دیتا ہے اور اس میں ایسا جادو ہے کہ ہر نئے آنے والے کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ لیکن یار یہ لاہور تو وہ لاہور ہے ہی نہیں جس میں ہم نے بچپن گزارہ ہے۔ شہر کی باہر والی فصیل کے ساتھ ساتھ نہر چلا کرتی تھی۔ دن بھر عورتیں نہر پر کپڑے دھوتی تھیں۔ ہم بھی نہر کے گرد باغات میں کھیلا کرتے تھے۔ اب تو نہ وہ نہر رہی نہ وہ باغات لیکن پھر بھی میں تو ہمیشہ یہی کہتا ہوں۔ جیوے شہر لاہور

س کیا لندن میں بھی ادبی بیٹھکیں اور مشاعرے ہوتے ہیں؟

ج مشاعرے کے بغیر تو اردو شاعری کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ مشاعرے کی حیثیت اردو شاعری کی روایت میں ریڑھ کی ہڈی سی ہے۔ لندن میں بھی ہم کوئی نہ کوئی محفل سجائے رکھتے ہیں۔ یہاں بھی کافی اچھے شاعر موجود ہیں۔

س ترقی پسند تحریک کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا، ترقی پسند تحریک کے کردار کے حوالے سے آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

ج ترقی پسند تحریک کے اردو ادب پر بہت سارے احسانات ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو جو شاعر اور ادیب دیئے آج بھی ان کے پائے کا کوئی شاعر یا ادیب موجود نہیں ہے۔ فیض، مجاز، ساحر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی اور کرشن چندران کے قد کا کوئی بھی

شاعر یا ادیب اس عہد نے پیدا نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو کئی نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

س جدید شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج شاعری تو بس شاعری ہوتی ہے اس میں جدید اور قدیم کی تو کوئی بھی قید نہیں ہے۔ ہم اسے مختلف شعراء کے عہدوں میں تو تقسیم کر سکتے ہیں لیکن جدید اور قدیم کا تصور غلط ہے بہر حال آج کل بھی چند شعراء اچھا کہہ رہے ہیں۔

س آپ کی شاعری پر موسیقی کے بڑے اثرات ہیں؟

ج اردو شاعری کی تو بنیاد ہی موسیقی پر ہے۔ بالخصوص غزل میں موسیقیت نہ ہو تو وہ بالکل بے مزہ لگتی ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ایک اچھا سازندہ ساز کی مدد سے بے وزن غزل کو وزن میں لا سکتا ہے۔

س آپ کے بقول پیپلز پارٹی کی سیاست بہتر ہے، بھٹو صاحب کے بارے میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟ شہرت بخاری: (بڑے دکھ بھرے جذباتی انداز میں) صاحبو: بھٹو جیسا لیڈر اس دھرتی نے پیدا ہی نہیں کیا۔ وہ تو اس دھرتی کا لعل تھا۔ بھٹو کی شہادت پر میں نے ایک سلام لکھا تھا۔

اے سپہر، وفا کے مہر مبیں
اے وقار زمین و اہل زمیں
ذوالفقار علی کی لاج ہے تو
اہل ایماں کے سر کا تاج ہے تو
کون سی ماں نے تجھ سا پوت جنا
موت بھی جس کو کر سکے نہ فنا
تجھ کو ڈھونڈیں مگر کہاں پائیں
بند ہیں راستے جدھر جائیں

یوں دھڑکنے سے رہ گیا ہے دل
سانس لینا بھی ہو گیا مشکل
اے غریبوں کے پاسبان سلام
بے زبانوں کے ترجمان سلام
اے میرے عہد کے حسین سلام
اے شہیدوں کے نور عین سلام

س بھٹو کو پھانسی دینے پر جن لوگوں نے خودسوزی کر لی ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج ایک دفعہ آپ کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فیض احمد فیض، ن۔م راشد پطرس بخاری، صوفی تبسم، وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے فارسی کا ایک شعر سنایا۔

سینہ صد چاک گزارند ، دل صد پارہ
ایں بے خبراں چاک دریدہ نہ گزارند

شعر سنتے ہی فضا میں خاموشی چھا گئی، تھوڑی دیر میں فیض صاحب رونے لگے، پھر پطرس بخاری نے رونا شروع کر دیا۔ صوفی تبسم، ن۔م راشد سبھی لوگوں کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ (بات کرتے ہوئے شہرت بخاری کی آنکھوں میں بھی پانی تھا توقف کے بعد) بات حقیقت ہے، کسی کے دل کا حال معلوم کیے بغیر ہم اسے کیسے غلط کہہ سکتے ہیں۔

س کیا مشقِ سخن اب بھی جاری ہے؟

شہرت بخاری: (مسکراتے ہوئے) شاعری تو سانسوں کے ساتھ ساتھ جاری ہے لیکن یہ شاعری بھی چشمے کی طرح ہوتی ہے۔ کبھی تو اتنے زوروں سے چلتا ہے کہ سیلاب ہی آ جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ بالکل ہی سوکھ جاتا ہے۔ ایک وقت تھا جب ایک دن میں سات سات آٹھ آٹھ غزلیں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ ایک کا مطلع کہا تو دوسری کا مقطع ایک وقت میں کئی

کئی غزلیں اب وہ بات تو نہیں رہی لیکن مشقِ سخن بہر حال جاری ہے۔

س موسم کون سا پسند ہے؟

ج سردیاں بہت اچھی لگتی ہیں لیکن صحراؤں میں میرے لیے ایک عجیب کشش ہے۔ شاید میرا خمیر صحراؤں سے اٹھا ہے اس لیے (سید ہونے کی وجہ سے) میں صحراؤں سے بہت مانوس ہوں۔ ریت کے ٹیلے، کھجوریں، اونٹ، گرمی کا موسم میرے جیسے کے لیے تو خوشگوار نہیں لیکن صحرا کی گرمی میری روح کے موافق ہے۔

س آپ کا تعلق کسی ادبی گروہ سے ہے؟

ج مجھے تو آج تک ادبی گروہ بندیوں کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ تعلق تو بہت بعد کی چیز ہے۔ میرا اگر کسی گروہ سے تعلق ہے تو وہ پیار کرنے والوں، وفا کرنے والوں اور ساتھ نبھانے والوں کا گروہ ہے۔

س لندن میں تنہائی محسوس نہیں ہوتی؟

ج میرا بیٹا ڈاکٹر علی جو بخاری، بیوی، بہو اور پوتے بھی میرے ساتھ رہتے ہیں ویسے بھی انگریزوں میں انسانی قدریں موجود ہیں۔ پچھلے دنوں ایک بس میں سفر کر رہا تھا کہ ڈرائیور نے یکدم بریک لگادی میں اپنے دھیان میں گم تھا اس وجہ سے سامنے سیٹ سے ٹکرا گیا لیکن بالکل محفوظ رہا۔ مسافروں نے بس رکوادی اور ایک ایک کر کے بس کے تمام مسافر میرے پاس آئے اور پوچھا، کیا آپ ٹھیک ہیں؟ بالکل ٹھیک ہیں؟ کئی ایک نے تو پھول تک تھمادیے۔ ایسے ماحول میں بھلا کیا تنہائی محسوس ہوگی۔

شہناز مزمل، ڈاکٹر

ڈاکٹر شہناز مزمل کے تعارف میں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ انہیں مادرِ دبستان لاہور کہا جاتا ہے۔ تمام زندگی شعر و ادب کی خدمت میں گزاری اور گزشتہ کئی دہائیوں سے ادب سرائے کے نام سے ایک ادبی تنظیم چلا رہی ہیں جو کہ پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کے درمیان باہمی ملاپ اور ملاقات کا سبب ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کی ترویج کا بھی انتہائی اہم ادارہ ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ارژنگ کے قارئین کے لیے گفتگو کا موقع انہوں نے دیا۔ یہاں یہ ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ یہ گفتگو ان سے عمرے کے سفر پر روانہ ہونے سے چند گھنٹے پہلے کی گئی۔

س جائے پیدائش انسان کی شخصیت کے بارے میں بہت سارے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئیں؟

ج میں فیصل آباد میں پیدا ہوئی تھی۔ اپریل کی ۱۰ تاریخ تھی۔

س آپ کا شمار ان اہل حرف میں ہوتا ہے جو روایتی تعلیم میں بھی نمایاں کامیابیاں سمیٹنے میں کامیاب رہے۔ اپنی تعلیمی زندگی پر ذرا روشنی ڈالئے؟

ج میں نے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا تھا، پھر اس کے بعد ہالینڈ سے ڈی ایچ ایم ایس (DHMS) کیا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ درسی تعلیم آپ کی علمی سمت کا تعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مگر اصل تعلیم آپ خود ہی مطالعے سے حاصل کرتے ہیں۔

س آپ کے اب تک بیس سے زائد شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ہمارے قارئین کی دلچسپی کے لیے آپ ان کے نام بتانا پسند فرمائیں گی؟

ج میرے اب تک اکیس شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں میرے نزدیک قابلِ فخر کام قرآن کریم کا منظوم ترجمہ ہے۔ دیگر شعری کتب میں ابتدائے عشق، عشق تماشہ، عشق مسافت، عشق مسلسل، عشق دادیوا، عشق دابھا نبھڑ، نورِ کل، انتہائے عشق، عشق کل، حادۂ عرفاں، بعد تیرے، قرضِ وفا، میرے خواب ادھورے ہیں، موم کے سائبان، جراتِ اظہار، جذب وحرف، پیامِ نو، شہناز مزمل کے منتخب اشعار، کھلتی کلیاں، مہکتے پھول، Ten poets of today۔

س آپ نے نثر کے میدان میں بھی بہت کام کیا ہے۔ اپنی نثری کتب کے بارے میں بتائیں گی؟

ج میری نثری کتب کی بات کریں تو علامہ اقبال کے حوالے سے میں نے کافی کام کیا ہے جو''کتابیاتِ اقبال'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ میرا سفرنامہ''دوستی کا سفر'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ میری کتاب عکسِ خیال کافی اہم ہے اور چونکہ آپ جانتے ہیں کہ میرا شعبہ لائبریریوں کے متعلق رہا ہے، اس حوالے سے''لائبریریوں کا شہر لاہور'' اور''فروغِ مطالعہ کے بنیادی کردار'' اہم کتب ہیں۔ بچوں کے لیے میں نے ''نماز'' کے نام سے کتاب تحریر کی ہے۔

س میں نے سنا ہے آپ براڈ کاسٹنگ کے شعبے سے بھی منسلک رہی ہیں؟

ج اس حوالے سے میں صرف اتنا بتا دیتی ہوں کہ ریڈیو پاکستان کے ملتان سنٹر سے پہلی نسوانی آواز میری نشر ہوئی تھی۔

س آپ نے پوری زندگی بطور ورکنگ وومن گزاری ہے اور اس دوران سخت محنت کی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم اہلِ سخن اور شعراء کرام کی شہرت پر جو کاہلی اور سستی کا میںہ داغ ہے، آپ نے وہ داغ بھی دھو دیا ہے۔ اپنی عملی زندگی کے بارے میں ذرا بتائیے؟

ج میں نے ۱۹۸۴ء میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کوپر روڈ کالج لاہور سے کیا اور دو سال وہاں نوکری کرنے کے بعد ماڈل ٹاؤن لائبریری کی چیف لائبریرین تعینات ہوگئی۔ تقریباً ۱۲ سال تک میں نے گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری میں یہ خدمات سرانجام دیں۔ پھر

۱۹۹۹ء میں بطور ریسرچ ایسوسی ایٹ (CRDC) میں دو سال لاہور سیکریٹریٹ میں شعبہ لائبریری کی بطور ڈائریکٹر کام کیا اور ۲۰۰۵ء سے اگلے چار سال قائداعظم لائبریری میں نوکری کرتی رہی ہوں۔

س فروغ ادب کے لیے خدمات سرانجام دینے پر آپ کو بہت سارے ایوارڈز، اسناد اور گولڈ میڈل بھی مل چکے ہیں۔ اس حوالے سے کچھ تفصیل بتائیے گا؟

ج میرے نزدیک جو سب سے اہم ایوارڈ اور قابلِ فخر اعزاز جو رب کائنات نے عطا فرمایا ہے، وہ قرآن پاک کا منظوم ترجمہ و مفہوم لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور الحمدللہ اس وقت میں پوری دنیا میں واحد خاتون ہوں جسے رب نے نہ صرف اس کام کے لیے چنا بلکہ ۵ سال میں ہی یہ کام مکمل کروایا جو کتابی شکل میں موجود ہے۔ بہت سی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے اس پر ریویو کر رہے ہیں۔

س آپ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بہت سارا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اس کی تفصیل بتانا پسند فرمائیں گی؟

ج میرے فن اور شخصیت کے حوالے سے محترمہ نعمانہ فاروق کی کتاب ''عکس خیال'' اہم ہے۔ علاوہ ازیں میاں وقارالاسلام نے ''مشل کلیات'' کے نام سے مجھ پر تحقیق سپرد قلم کی ہے۔ صائمہ جبیں مہک نے گزشتہ برس ''تلاشِ حق'' کے عنوان سے مجھ پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور پچھلے سال ہی دعا علی کی کتاب ''رمزِ دعا'' اور ''مشل دعا'' بھی شائع ہوئی ہیں۔

س ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو عمرے کی ادائیگی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اس لیے ہمیں آخر میں بس اپنی آئندہ آنے والی کتب کے بارے میں بتا دیجیے۔

ج میری آنے والی کتب میں ایک تو ''کلیات شہناز مزمل'' کا غزل والیم ہے اور دوسری کتاب ''کلیات شہناز مزمل'' نظم ہے۔ اس کے علاوہ کلیات عشق اور سعودی عرب حجاز مقدس کے حوالے سے سفرنامہ ''سفرِ عشق'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ کالموں کا مجموعہ ''اجلا کون، میلا کون'' کے نام سے جلد بازار میں آنے والا ہے۔ اس کے علاوہ میری کہانیوں کا مجموعہ بھی اشاعت کے آخری مراحل میں ہے جس کا عنوان ''بریف کیس'' ہے۔

طاہر نسیم

س آپ شاعر ہیں اور صحافی ہیں، عہد حاضر کے ادب اور ادبی صورتحال پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

ج اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایک محسوس کرنے اور جاننے والا تخلیق کار بنایا۔ عہد حاضر میں ادب اور ادبی صورتحال اتنی اچھی نہیں مگر مایوس بھی نہیں، میرے خیال میں ادب کو تعمیر ذات کے ساتھ ساتھ تعمیر ملت کا سبب بھی ہونا چاہئے جب تعمیر ملت کا خیال کریں گے تو ادبی صورتحال بھی بہتر ہوگی۔

س بڑھتی ہوئی میڈیائی یلغار ادب کے لئے معاون ثابت ہوا؟

ج بڑھتی ہوئی میڈیائی یلغار نے ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، بہت کم ایسا ہوا ہے کہ چینلز پر کوئی معیاری مشاعرہ یا ادبی ٹاک آتی ہو ورنہ تو بھانڈ ازم کو ادب کا لبادہ پہنایا جا رہا ہے۔

س نئی نسل میں ادبی رجحانات پیدا کرنے کے لئے کن کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

ج بہت اہم سوال ہے۔ ادب اور ادبی رجحانات جس تیزی سے نئی نسل میں ناپید ہو رہا ہے مجھے کبھی کبھی بہت پریشانی ہوتی ہے۔ میں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کا جائزہ لیا ہے وہ ویران ہو رہی ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں کا بھی یہی عالم ہے۔ لائبریری ادب کے فروغ کا بنیادی ذریعہ ہے۔ ہمیں ان میں یہ شوق پیدا کرنا ہوگا۔ اساتذہ کو اس سلسلے میں ذمہ دارانہ کردار ادا کرنا ہوگا۔

س ادبی گروہ بندیوں کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟

ج اختلاف انسانی سرشت کا حصہ ہے مگر یہ بہتری اور تعمیر کے لئے اچھا لگتا ہے مگر

جب ادب سے ہٹ کر ذاتی اختلاف کرنے لگتے ہیں تو خرابی شروع ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تخلیق ادب کی معراج اور منشاء انسانیت ہے اور اسی کو ہونا چاہئے۔ عہد گزشتہ میں نامور ادبی شخصیات کی گروہ بندیوں اور اختلافات کا مجموعی طور پر ادب اور ادب سے وابستہ لوگوں کو نقصان ہی ہوا ہے۔

س ادب اور ادیب کی بہتری میں حکومتی اقدامات سے مطمئن ہیں؟

ج حکومتی سطح پر بہت سے اقدامات کی ضرورت ہے جس طرح موجودہ حکومت اور خاص طور پر وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف تعلیمی شعبے کی ترقی کے لئے خصوصی توجہ کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ادب کے شعبے پر بھی توجہ دیں تو بہتری ہو سکتی ہے۔ صوبائی، ڈویژنل، ضلعی اور تحصیل کی سطح پر لٹریری کونسلیں تشکیل ہوں۔ وہ مشاعروں، مذاکروں، مباحثوں کا اہتمام کریں اور مجھے یقین ہے کہ عطاء الحق قاسمی صاحب کا رول اس سلسلے میں مشعل راہ ہے۔

س آپ نے مرتضیٰ برلاس کے ساتھ مل کر اردو کانفرنس کی، کیا اب بھی ایسی کانفرنسز کی ضرورت ہے۔

ج اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ہماری قومی اور واحد رابطے کی زبان ہے۔ اگر اسے اپنائیں گے تو ملک ترقی کرے گا چین اور جاپان کی ترقی کا راز تمام تعلیم ان کی اپنی زبانوں کی وجہ سے ہے۔ مرتضیٰ برلاس صاحب نے پوری زندگی اس کام کے لئے وقف کی انہوں نے خانیوال میں اردو کانفرنس کی سفارشات تیار کیں جو حکومتی حلقوں میں گئیں، آج بھی ایسی کانفرنسز کی ضرورت ہے اور مرتضیٰ برلاس صاحب، عطاء الحق قاسمی صاحب، امجد اسلام امجد صاحب اس سلسلے میں اہم اور موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

س جنوبی پنجاب کے ادبی منظر نامے پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

ج جنوبی پنجاب میں ادبی اور ادبی صورتحال کافی حوصلہ افزاء ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں کا کردار بھی نمایاں اور بہتر رہا ہے۔ عہد

حاضر میں جنوبی پنجاب میں خاص طور پر ملتان میں خالد مسعود خان، قمر رضا شہزاد، رضی الدین رضی، شاکر حسین شاکر شاعروں اور ادیبوں کو جوڑنے میں موثر کردار ادا کر رہے ہیں پھر عامر بن علی نے ضلع خانیوال میں ادبی چراغ کو روشن کیا ہوا ہے۔وہ گاہے بگاہے میاں چنوں میں آل پاکستان مشاعروں اور کانفرنسوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ملتان میں ٹی ہاؤس کا قیام بھی خوشگوار حیرت ہے۔عباس تابش بھی جنوبی پنجاب کا درخشندہ ستارہ ہے۔

س کوئی پیغام جو آپ قارئین کو دینا چاہیں؟

ج ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر میں یکتا ہیں جی، اگر ہم سب مل کر اپنی تخلیقات کے ذریعے بہتری اور تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو پھر نئی نسل کو کتاب سے جوڑ دیں۔ان کے اندر کتب بینی، ادب پروری کو پرو دیں تو شاید مستقبل میں ایک باادب سوسائٹی کا خواب پورا ہوتا دیکھ لیں......

عطاء الحق قاسمی

س آپ بیک وقت استاد، ڈرامہ نویس، سفرنامہ نگار، شاعر اور کالم نگار ہیں۔ آپ کے خیال میں آپ کی اصل پہچان کس حوالے سے ہے؟

ج میرا خیال ہے کہ شاعری کے علاوہ باقی جتنی اصناف میں لکھتا ہوں اس میں طنز و مزاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ میرے ٹی وی ڈرامے طنز و مزاح کی ذیل میں آتے ہیں۔ میرے کالموں میں فکاہیہ عنصر نمایاں ہے اسی طرح میرے سفرناموں میں بھی یہی فضا آتی ہے۔ چنانچہ میرے خیال میں میری پہچان طنز و مزاح کے حوالے سے بنتی ہے۔

س کالم نگاری کی طرف آپ کا رجحان حادثاتی تھا یا باقاعدہ آپ کے ذوق شوق کی علامت کے طور پر سامنے آیا؟

ج کالم نگاری کا آغاز میں نے فسٹ ایئر میں کیا جب ایم اے او کالج میں طالب علم تھا۔ یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے اور یوں اگر دیکھا جائے تو آج میری کالم نگاری کی عمر ۴۰ سال ہو چکی ہے۔ جس میں چونتیس سال میں نے صرف ،،نوائے وقت،، کے لئے کالم لکھا ہے۔ میں حادثاتی طور پر کالم نگار نہیں بنا بلکہ یہ تحفہ مجھے اپنے والد ماجد مولانا بہاؤالحق قاسمی کی طرف سے وراثت میں ملا۔ والد محترم ایک جید عالم دین ہونے کے علاوہ ایک پندرہ روزہ کے ایڈیٹر بھی تھے جس میں وہ خود فکاہیہ کالم بھی لکھتے۔ یوں یہ چیزیں میرے خون میں شامل ہیں۔

س نوائے وقت، کے ساتھ اس قدر شدید وابستگی کے پیچھے کیا کوئی نظریاتی وجہ ہے۔

ج شاید اس لیے کہ میری پہلی تقرری بطور سب ایڈیٹر نوائے وقت میں ہوئی وہاں سے میں نے باقاعدہ کالم نگاری کا آغاز کیا اور آج تک میں اسی اخبار سے وابستہ ہوں کیونکہ بقول میر:

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

مجھے دوسرے اخباروں سے بہت بڑی آفرز بھی موصول ہوئیں مگر میرا دل نہیں مانتا تھا کہ میں صرف دولت کی خاطر اپنا اخبار تبدیل کروں حالانکہ اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔مگر یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔

س بقول ظفر اقبال:

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پر ظفرؔ
آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے

اس شعر کے تناظر میں یہ بتایئے کہ ایک ادیب یا کالم نگار کو کس حد تک نظریاتی ہونا چاہیے؟

ج میں سمجھتا ہوں کہ ایک ادیب کی نظریاتی کمٹ منٹ معاشرے کے دیگر افراد سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہونی چاہیے۔بہت سے ادیب اور دانشور، فاٹا گروپ کے ارکان کی طرح ہر حکومت کی سیاسی اور نظریاتی بیل گاڑی میں جتے نظر آتے ہیں۔یہ ادب اور ادیب کی توہین ہے۔جو ادیب قاری کو مسرت کے ساتھ ساتھ اسکی ذہنی تربیت کا اہتمام نہیں کرتا وہ ادیب نہیں،، ماشیا،، ہے۔

س موجودہ مجموعی ملکی صورت حال کے حوالے سے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا دانشور طبقہ اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کر رہا ہے؟

ج ہمارا دانشور طبقہ بالکل اسی طرح آج بھی اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کر رہا ہے۔جس طرح اس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور ۱۹۴۷ء کی تحریک پاکستان میں عوام کی خواہشوں، ان کی منگوں اور ان کی آرزوؤں سے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔بہت کم دانشور ایسے ہیں جو اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑے رہنا جانتے ہیں ورنہ چھوٹے چھوٹے مفادات گھٹیا خواہشیں اور جھوٹی انا انہیں اس رستے پر لے جاتی ہیں جو ایک دانشور کا رستہ نہیں ہوتا۔

س آزادیٔ صحافت کے حوالے سے آپ موجودہ حکومت کے کردار کو کس حوالے سے دیکھتے ہیں؟

ج: مجھے موجودہ حکومت سے بنیادی اختلاف ہیں۔جن کا اظہار میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے آج تک پورے تواتر اور بلند آہنگی کے ساتھ کرتا چلا آ رہا ہوں لیکن میرے نزدیک، ڈیول، کو اس کا ڈیو، ضرور دینا چاہیے۔اس کے مطابق مجھے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں کہ اس حکومت نے پریس کو بہت حد تک آزادی دے رکھی ہے۔جس کی گواہی اخبارات کے صفحے بھی دیتے ہیں۔

س: بین الاقوامی مشاعروں میں آپ کو بطور شاعر دعوت دی جاتی ہے ۔جبکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اور جیسا کہ آپ نے اس گفتگو میں خود بھی اعتراف کیا ہے کہ آپ کی اصل شہرت اور مقام بحیثیت مزاح نگار ہے اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج: اس میں میرا نقطہ ءنظر یہ ہے کہ مزاح نگار کے طور پر پہچان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے یا دوسرے لوگوں نے بطور شاعر میری پہچان کو نظر انداز کر دیا ہے۔میں نے اندرون ملک اور بیرون ملک بے شمار مشاعرے پڑھے ہیں اور ہر مشاعرے میں میری شاعرانہ حیثیت کی بے پناہ پذیرائی ہوئی ہے جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں مجھ سے ملتی جلتی مثال منو بھائی کی بھی ہے جو ایک کالم نگار کے طور پر پہچانے جاتے ہیں مگر لوگ انہیں مشاعروں میں بطور شاعر بھی مدعو کرتے ہیں اور ان کا کلام ثابت کرتا ہے کہ وہ بہت عمدہ شاعر بھی ہیں۔ایک اور بات جو اس حوالے سے میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ منتظمین صرف ان شعراء کو اپنے مشاعروں میں مدعو کرتے ہیں جن کی عوام میں مانگ ہوتی ہے۔تاہم اس سے ان شعراء کا دل کھٹا نہیں ہونا چاہیے جنہیں مشاعروں میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔کیونکہ عوامی مقبولیت یا عدم مقبولیت کسی کے بڑا یا چھوٹا شاعر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

س: مشاعروں میں شرکت کے حوالے سے کسی ادبی پرچے کی ادارت یا ادبی ایڈیشن کی انچارج شپ کس حد تک معاون ہو سکتی ہے؟

ج: جہاں تک ادبی ایڈیشن کا معاملہ ہے۔اس کا بہتر جواب تو وہ دے سکتے ہیں جو کسی ادبی ایڈیشن کے انچارج ہیں مگر جہاں تک ادبی پرچے کا مدیر ہونے کا تعلق تو بے شمار ادبی پرچوں کے مدیر ایسے ہیں جو شاعر بھی ہیں مگر انہیں مشاعروں میں شرکت کا موقع نہیں ملتا ۔اس کی وجہ وہی ہے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مشاعرہ پڑھنا یا نہ پڑھنا کسی کے چھو

ٹے یا بڑے شاعر ہونے کی دلیل نہیں۔

س اپنے موجودہ مقام وحیثیت سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج آپ کو سن کر حیرت ہوگی زندگی میں کسی بھی مقصد کے لئے میں نے کبھی کوئی پلاننگ نہیں کی۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اس کی رحمت اور اپنے والدین کی دعاؤں کی بدولت ہوں۔ میں نوائے وقت میں سب ایڈیٹر بھی حادثاتی طور پر بنا کالج میں لیکچر شپ بھی حادثاتی طور پر ملی اور ناروے میں بطور سفیر میرا تقرر بھی میری طلب کے بغیر ہوا بلکہ میں نے انکار کیا مگر جس طرح میں زندگی کے دوسرے مواقع پر وہ کچھ بنتا چلا گیا جس کی میں نے خواہش نہیں کی تھی۔ یہاں بھی وہی معاملہ درپیش ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو سفارت کے عہدے سے استعفیٰ دیتے ہوئے مجھے رتی بھر ملال محسوس نہیں ہوا۔ میں آج بھی اتنا ہی مطمئن اور خوش ہوں جتنا ہمیشہ سے تھا۔

س تھائی لینڈ اور ناروے میں بطور سفیر کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟

ج جیسا کہ میں نے آپ کو ابھی یہ بتایا کہ اس عہد کے قبول کرنے کے سلسلے میں میرے کچھ تحفظات تھے مگر جب مجھے سوا دو سال ناروے اور تھائی لینڈ میں بطور سفیر کام کرنیکا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ اگر میں یہ عہدہ قبول نہ کرتا تو شاید ایک بہت بڑے تجربے سے محروم رہ جاتا۔ بطور سفیر مجھے اس شعبے میں جھانکنے کا موقع ملا جس کا موقع بطور ادیب نہیں مل سکتا تھا اور یوں میرا Vision پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہوا جو میرے تخلیقی کاموں میں ممد ومعاون ثابت ہوا۔

س بطور سفیر آپ جن تجربات ومشاہدات سے گزرے ان کو کتابی شکل دینے کا کوئی ارادہ ہے اور کب تک ہے؟

ج میرا ارادہ ہے کہ میں اپنے تجربات کتابی صورت میں بیان کروں مگر یہ ایک خاصا محنت طلب اور نازک کام ہے انشاءاللہ کسی مناسب موقع پر اپنے یہ تجربات احاطہ تحریر میں لاؤں گا۔

س کافی دیر ہوگئی ٹی وی پر آپ کا کوئی ڈرامہ دیکھنے میں نہیں آیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

ج میں اصل میں ڈرامہ اپنی خواہش سے کبھی نہیں لکھتا۔ میرے ڈرامے خواجہ اینڈ سن ، شب دیگ ، حویلی ، اپنے پرائے ، الیکشن الیکشن اور رشید اٹلی ٹی وی والوں کے بے پناہ اصرار کے تحت لکھے گئے۔ ان دنوں پرائیویٹ پروڈکشن والوں نے مجھ پر یلغار کی ہوئی ہے تاہم میں ابھی تک کسی کے قابو میں نہیں آیا ہو سکتا ہے آئندہ سال کوئی ڈرامہ لکھوں مگر میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

س کچھ خاندانی پس منظر، بچپن اور تعلیم وغیرہ کے بارے میں بتائیں؟

ج میں یکم فروری 1973 کو امرتسر میں پیدا ہوا۔ میری انتہائی خوش بختی ہے کہ میرے والد ماجد مولانا بہاء الحق قاسمی تھے جو ایک نامور عالم دین اور کئی کتب کے مصنف تھے۔ ان کی ایک اہم تصنیف ''تذکرۃ الاسلاف'' ہے جو ہمارے بزرگوں کے بارے میں ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے اسلاف کی تاریخ گزشتہ ایک ہزار برس پر محیط ہے دوسری اہم کتاب ہے ''اسلام اور اشتراکیت'' یہ اباجی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی چوہدری افضل حق کے ساتھ ایک علمی بحث پر مشتمل تھے۔ یہ مضامین بعدازاں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ والد محترم امرتسر ہی سے ایک پندرہ روزمجلہ ضیاء الاسلام بھی نکالتے تھے جس کے وہ خود مدیر بھی تھے اور اس میں ایک فکاہی کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ فکاہی کالم نگاری مجھے ورثے میں ملی ہے۔ میرے دادا مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی ایک مشہور عالم دین اور امرتسر کے مفتی تھے۔ ان کے شاگردوں میں بہت بڑی بڑی شخصیات شامل ہیں جن میں امیر شریعت سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری اور جامعہ اشرفیہ کے بانی مفتی محمد حسن نمایاں ہیں۔ میرے دادا کے والد اور ان کے والد اسی طرح ہمارے خاندان میں ایک ہزار سال تک کوئی بزرگ ایسا نہیں گزرا جس کی علمی و دینی خدمات تاریخ میں ریکارڈ نہ ہوئی ہوں۔ ہمارے آباؤ اجداد عرب سے آئے تھے اور ہم حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ وہ لوگ عرب سے آ کر ہندوستان میں آگرہ میں آباد ہوئے اور وہاں سے کشمیر چلے گئے۔ یہ کوئی آٹھ سو سال قبل کی بات ہے۔ علم کا چراغ انہوں نے ہمیشہ ہی روشن رکھا۔ ہمارے اسلاف کے شاگردوں میں حضرت مجدد الف ثانی

جیسی شخصیات بھی شامل ہیں۔ ہمارے خاندان کے بزرگوں میں دو افراد ایسے بھی ہیں جن کو دوسرے ممالک میں سفارت کاری کا شرف حاصل رہا۔ گویا سفارت کاری بھی مجھے ورثے میں ملی ہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے علم سے محبت عطا فرمائی۔ کشمیر میں آٹھ سو سال رہنے کے بعد میرے بزرگ امرتسر آ گئے۔ چنانچہ آپ یہ سمجھ لیں کہ پنجاب میں ہمارا خاندان گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے آباد ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میری پیدائش امرتسر کی ہے۔ جب پاکستان قائم ہوا تو ہم لوگ ہجرت کر کے وزیرآباد آ گئے۔ وزیرآباد آنے کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ وہاں میری نانی اماں رہائش پذیر تھیں۔ میں نے پرائمری تعلیم وزیرآباد سے حاصل کی اور میٹرک کرنے کے دوران ہم لوگ ماڈل ٹاؤن شفٹ ہو گئے۔ وزیرآباد میں ابا جی ایک سکول میں مدرس تھے۔ والد صاحب کے مرشد تھے مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ والے اور مفتی صاحب کے مرشد میرے دادا تھے۔ اس طرح میرے والد اور مفتی محمد حسن کے درمیان دہرا رشتہ قائم تھا۔ مفتی صاحب نے میرے والد صاحب کو حکم فرمایا کہ وہ جامعہ مسجد ماڈل ٹاؤن کی خطابت کے فرائض سنبھال لیں۔ والد محترم یہاں نہیں آنا چاہتے تھے لیکن چونکہ اُستاد کا حکم تھا اس لیے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ماڈل ٹاؤن آ گئے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ہم بھی یہاں شفٹ ہو گئے۔ اس لیے میٹرک میں نے ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن سے کیا۔ بی اے ایم اے او کالج لاہور اور ایم اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اورینٹل کالج سے حاصل کی۔ ماڈل ٹاؤن میں میرا حلقہ احباب طبقہ امراء کے آزاد خیال نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ جبکہ میرے گھر کا ماحول نہایت علمی اور دینی تھا۔ مزید یہ کہ گھر میں امارات کی بھی کوئی جھلک نہ تھی۔ چنانچہ یہ دو متضاد حالات تھے جن سے مجھے گزرنا پڑا لیکن اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ میں ملا بنا نہ مسٹر بلکہ میانہ روی اختیار کرتے ہوئے وہ بنا جو آج سب کے سامنے ہوں۔

س یہ جو آپ نے کہا کہ آپ کا حلقہ احباب ماڈل ٹاؤن کے آزاد خیال نوجوانوں پر مشتمل تھا تو یہ بتایئے کہ ان میں کون لوگ شامل تھے اور ان دنوں آپ کی کیا مصروفیات رہتی تھیں؟

ج: جی میرا تمام دوست طبقہ امراء سے تعلق رکھتا تھا جو بڑے آزاد خیال لوگ تھے اور انہی کے ساتھ میرا تمام وقت گزرتا تھا۔ ایک بات جو بہت اہم ہے وہ میں بتاتا چلوں گا کہ اگرچہ میرے تمام دوست بہت متمول گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن میری تربیت میں ہمارے خاندان کی علمی و دینی خدمات نے وہ فخر و غرور پیدا کر دیا تھا کہ اس افتخار نے کبھی بھی مجھے مادی آسائشوں سے مرعوب نہیں ہونے دیا۔ میں اپنے امیر دوستوں کے ساتھ رہتے ہوئے کبھی بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا اور اس کے باعث میری شخصیت کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچی۔ ان لوگوں کی کوٹھیاں، زرق برق لباس، کاریں اور دولت کی ریل پیل میرے لیے قطعی غیر اہم تھی۔ اگر میرے اندر یہ افتخار نہ ہوتا تو میری شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی۔ دوسری طرف میرے دوست بھی بہت اچھے تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے میری مالی کم مائیگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ یہ ایک غیور شخص ہے اس لیے ان کا طرز عمل بھی ہمیشہ مثبت رہا۔ ان دوستوں کے ساتھ گزرا ہوا وقت آج بھی سہانے خواب کی طرح یاد آتا ہے۔ ان دنوں ہم لوگ سارا دن گھومتے پھرتے تھے۔ سیر سپاٹے کرتے اور وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ کبھی موڈ آتا تو مری نکل جاتے۔ کبھی پشاور چلے جاتے۔ اس دور کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے میٹرک کیا تو والد محترم نے کہا کہ وہ مجھے دینی تعلیم کے لیے جامعہ اشرفیہ میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ میں تو ایسا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔ میں خود بھی دینی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن میٹرک کے بعد اس کا وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا جو آپ چاہتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ پہلے بی اے کر لوں ورنہ تو ملاؤں میں ایک اور ملا کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح بڑی مشکل سے میں نے والد صاحب کو راضی کیا وہ مجھے بی اے کر لینے دیں۔ جب میں نے بی اے کر لیا تو انہوں نے کہا کہ چلو جامعہ اشرفیہ۔ اب میں نے جامعہ اشرفیہ کا ماحول دیکھا ہوا تھا۔ وہاں لڑکوں نے ٹنڈیں کرائی ہوئی اور ٹخنوں سے اُونچے پاجامے پہنے، پاؤں سے ننگے برے حالوں میں پھرتے تھے۔ میرے ذہن میں اس طرح کا نقش ثبت ہوا تھا کہ میں وہاں جانے سے خوفزدہ تھا۔ اب کی بار والد صاحب کو منانا بہت مشکل تھا اس لیے میں نے والدہ

ماجدہ کی امداد بطور کمک حاصل کی۔ انہوں نے کہا کہ چلو تم ایم اے کرلو لیکن ایم اے کے بعد میں نے ضرور تمہیں وہاں داخل کرانا ہے۔ جب میں نے ایم اے کرلیا تو والد صاحب نے کہا کہ ایم اے کرنے کے بعد اب تمہارا جامعہ اشرفیہ جانا کچھ زیادہ مناسب نہیں اس لیے میں تمہیں مدینہ یونیورسٹی میں داخل کرادیتا ہوں۔ اب چونکہ میں کسی حد تک خودمختار ہو گیا تھا اس لیے میں وہاں بھی نہ گیا۔

س گویا آپ دینی تعلیم سے دور بھاگتے رہے؟

ج ایسی بات بھی نہیں۔ جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے تو آپ اس وقت بھی میری سٹڈی دیکھ رہے ہیں کہ اس میں کتنی زیادہ کتابیں ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میرے والد ماجد کے ذخیرہ کتب میں اس سے بھی زیادہ کتابیں تھیں اور ہر کتاب نہایت ہی اعلیٰ اور قیمتی اور دُنیا کے تمام مذاہب پر۔ میں نے آٹھویں جماعت سے ہی انکی لائبریری میں مطالعہ شروع کردیا تھا اور اس وقت تک میں گویا ان کی پوری لائبریری گھول کر پی چکا تھا۔ چنانچہ جہاں تک دینی علم اور معلومات کا تعلق تھا وہ مجھے خاصی حد تک حاصل تھی۔ اس کے علاوہ والد صاحب نے قرآن پاک کی تفسیر مجھے پڑھانا شروع کی تھی لیکن افسوس کہ میں نے چند پارے ہی پڑھے لیکن ان کا طریقہ تعلیم اس قدر آسان اور دلکش تھا کہ آج بھی قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھیں تو اس کی تفسیر نہ ہی سہی لیکن بڑی حد تک اس کا مفہوم میں آپ کو بتا سکتا ہوں لیکن میں ذرا ترجمہ کی مدد لے لوں تو بہت اچھی طرح اس کی تشریح کرسکتا ہوں۔

س ابھی آپ نے کہا کہ آپ نے والد صاحب کی پوری لائبریری پڑھ ڈالی تھی۔ جس میں تمام مذاہب پر کتب موجود تھیں تو یہ بتائیے کہ مذاہب کے تقابلی جائزے میں آپ نے کیا محسوس کیا یا اس مطالعے سے مختلف مذاہب عالم سے کیا اخذ کیا؟

ج جی اس میں ہندومت کی کتب بھی میں نے پڑھیں۔ انجیل کے مختلف Vision بھی میں نے پڑھے۔ اسلام کے مختلف مکاتب فکر کی کتب بھی پڑھنے کا موقع ملا جس میں غلام احمد پرویز، مولانا مودودی اور عبداللہ چکڑالوی جیسے علماء بھی شامل تھے تو ادیان کے مطالعے سے جس نتیجے پر پہنچا وہ ایک مثبت نتیجہ ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ تمام مذاہب

کی روح ایک ہی ہے اور سب کا بنیادی تصور بھی ایک ہی ہے کہ آپ جو فصل بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ اس کے علاوہ خدا کا تصور بھی تمام مذاہب میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ جو ہم ہندوؤں کو کہتے ہیں کہ وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو ٹھیک ہے وہ واقعی بتوں کی پوجا کرتے ہیں لیکن حتمی طور پر وہ خدا ہی کو مانتے ہیں یعنی بھگوان کو اور اس کی پوجا کرتے ہیں اور مورتی کے بارے میں ان کا نظریہ ہے کہ انہوں نے خدا ہی کی ایک تجسیمی شکل بنائی ہے تاکہ عبادت میں ارتکاز رہے۔ بنیادی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ دُنیا کے تمام مذاہب خیر کی طرف ہی لوگوں کو بلاتے ہیں۔ مختلف راستے ضرور ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔

س اب اس وسیع مطالعے کے بعد آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ مذہب اور فلسفے میں کیا تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے کو کہاں تک برداشت کرتے ہیں؟

ج میں نہیں سمجھتا کہ مذاہب، فلسفے اور سائنس کا آپس میں کوئی جوڑ یا مماثلت ہے۔ یہ جوڑ لگانا سہی نہیں۔ میں تو اس بات کے بھی بہت خلاف ہوں کہ لوگ قرآن مجید میں سے آج کے مادی علوم تلاش کرتے ہیں۔ سائنسی تھیوریوں کا سراغ لگاتے ہیں۔ ایٹم بم کا فارمولا قرآن میں تلاش کرتے ہیں۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ قرآن حکیم سائنس کی کتاب ہے نہ فلسفے کی۔ یہ تو آپ کے اندر کی دنیا آباد کرتا ہے۔ آپ کے اندر روشنی پیدا کرتا ہے۔ دیکھیں نا! سائنس کی تھیوریاں اور نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ آج آپ قرآن سے ایک چیز نکال لیتے ہیں کل کو وہ سائنسی نظریہ غلط ثابت ہو جاتا ہے تو کیا نعوذ باللہ قرآن کو غلط ثابت کریں یا اس میں ترمیم کریں گے۔ قرآن مذہبی کتاب ہے اور اس کو وہی رہنے دیں جو یہ ہے۔ ایک اور ظلم ہمارے ہاں ہوتا ہے اور وہ ہے طب نبویؐ کے نام پر۔ یہ بتائیں کہ آنحضورؐ کی بتائی ہوئی کوئی دوا اگر کسی مریض کو دی جائے اور اس کو افاقہ نہ ہو تو کیا یہ اچھی بات ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ اگر اس سے شفا ہو جاتی ہے تو کیا یہ عمل آنحضورؐ کے مرتبے میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ انہیں کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ نعوذ باللہ آپ انہیں حکمت کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے جو باتیں اپنے بڑے بوڑھوں سے سنیں کہ فلاں چیز کھانی چاہیے اور

فلاں نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے وہی انہوں نے لوگوں کو بتائیں۔ دوسری بات یہ کہ وہاں عرب میں دو تین چیزیں ہی زیادہ ہوتی تھیں مثلاً کھجور، زیتون اور انجیر وغیرہ انہی میں سے ہر مرض کا علاج تلاش کیا جاتا تھا اور بڑے بوڑھے یہی چیزیں کھانے کو کہتے تھے۔ سو یہی بات وہاں تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہاں ایک ڈاکٹر صاحب ہیں وہ طب نبویؐ کے نام پر ذیابیطس کے مریضوں کو کھجوریں کھلا رہے ہیں چاہے مریضوں کا شوگر لیول کنٹرول سے باہر ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مذہب کی Exploition ہے اور کچھ بھی نہیں۔

س قاسمی صاحب! وہ بات درمیان میں ہی رہ گئی کہ آپ کے ماڈل ٹاؤن والے دوست کون تھے اور اب یہ کہاں ہیں؟

ج یہ بڑی دلچسپ بات ہے اور اتفاق ایسا بنا کہ ان سب دوستوں کا یہ پروگرام بن گیا کہ امریکا جایا جائے۔ ان سب کے پاس تو وسائل تھے اس لیے انہوں نے مجھے کہا کہ تم بھی چلو۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں بھی چلتا ہوں۔ یہ لوگ ایک ایک کر کے امریکا چلے گئے۔ اس زمانے میں ویزہ بھی آسانی سے مل جاتا تھا۔ یہ بات ہے 60 کے عشرے کی۔ اب پیچھے میں اکیلا رہ گیا۔ میں ابا جی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ مان ہی نہیں رہے تھے۔ کیونکہ ان کو مجھ سے بے پناہ محبت تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی محبت شاید ہی کسی کو ہوگی۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ آٹھویں جماعت تک وہ مجھے خود نہلاتے تھے۔ چنانچہ وہ مجھے جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ مجھے بھی ان سے بہت محبت تھی لیکن میں امریکہ بھی جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی اس محبت کو Exploit کیا اور بالآخر ان کو قائل کر ہی لیا۔ اب پیسوں کا مسئلہ تھا۔ ہمارے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ میرے پاس ایک 50cc موٹر سائیکل تھی۔ وہ موٹر سائیکل 1500 روپے میں اپنے دوست چوہدری صفدر کو بیچی۔ اس طرح میں نے کچھ رقم ادھار لی۔ کچھ پیسے والد صاحب سے لیے اور کسی نہ کسی طرح سات ہزار روپے جمع کر لیے اور امریکہ کے لیے بائی روڈ چل پڑا۔ لاہور سے بائی روڈ پشاور، پشاور سے پی آئی اے کے ذریعے کابل اور کابل سے یورپ تک بائی روڈ۔ یہ میرا بہت دلچسپ سفر تھا جو میں نے اپنے سفرنامہ ''شوقِ آوارگی'' میں بیان کیا۔ یورپ

سے بائی ایئر میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں میرے یہ سارے دوست تھے جو یہاں سے گئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی وہاں کام کیے تھے جو یہاں سے امریکہ جانے والے لوگ شروع میں کرتے ہیں۔ اتنی چھوٹی موٹی ملازمتیں حالانکہ یہ لوگ اچھے خاصے امیر گھرانوں کے تھے۔ میں نے بھی چھوٹی موٹی ملازمتوں سے آغاز کیا اور سال ڈیڑھ سال میں ایک اچھی جگہ ملازمت حاصل کر لی۔ یہ 1970ء کی بات ہے۔ وہاں ایک ہوٹل تھا Ramad Inn مجھے اس ہوٹل میں فوڈ اینڈ بیوریج منیجر کی ملازمت مل گئی۔ یہ ایک وائٹ کالر ملازمت تھی جس کے پیسے بھی معقول ملتے تھے لیکن صورت حال یہ ہوئی کہ ادھر سے مجھے والد محترم کے خط آتے رہتے تھے کہ واپس آ ؤ۔ میں ان کے خط کئی کئی روز نہیں کھولتا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے کیا لکھا ہوگا اور خط پڑھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال ایک روز میں نے فیصلہ کر لیا مجھے اس معاشرے میں نہیں رہنا۔ میرے دوستوں نے مجھے منع کیا لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔ اس لیے میں نے ٹکٹ کٹائی اور یورپ تک بائی ایئر آیا اور یورپ سے بائی روڈ پاکستان۔ میں بغیر اطلاع کے اپنے گھر پہنچا اور جب ابا جی نے اچانک مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر آنے والی خوشی کی لہر میری زندگی کا حاصل ہے۔ اس طرح میں تقریباً ڈیڑھ پونے دو سال بعد واپس گھر آ گیا۔ آپ نے دوستوں کا پوچھا ہے تو بتائے دیتا ہوں کہ وہ سب مختلف عادات اور کردار کے لوگ تھے۔ وہ سب دوست وہیں رہ گئے۔ ان میں سے صرف دو ایسے تھے جو بہت عرصہ بعد واپس آئے۔ ایک منیر احمد شاہ تھے ان کا پس منظر بھی بہت مذہبی تھا۔ اس نے وہاں ایک لڑکی سے شادی کی جو نسلاً ڈچ تھی اور نام تھا اس کا ''خرید''۔ اس سے ایک بیٹا بھی ہے ان کا۔ یہ کوئی سولہ سترہ برس وہاں گزار کر واپس آیا تھا۔ آج کل لاہور ہی میں ہے اور اپنا بزنس کر رہا ہے۔ یہ دوست ایچی سن کالج سے پڑھا ہوا ہے۔ دوسرا دوست جو واپس آیا وہ ہے مسعود علی خان۔ یہ میرا سب سے عزیز دوست ہے۔ ان میں سے ایک سب سے دلچسپ دوست تھا۔ اس کی زندگی کی بجائے خود ایک افسانہ ہے۔ اس کا نام خالدی تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور یہ لوگ ماڈل ٹاؤن کے اے بلاک میں رہائش پذیر تھے۔ اس کی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور والدہ

کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بڑی وسیع کوٹھی میں وہ اور اس کے بوڑھے والد رہتے تھے۔ یہ اپنے والدین کا بڑا لاڈلا تھا۔ اس لاڈ پیار کی وجہ سے اس میں ذرا Abnormality سی آ گئی تھی۔ مثال کے طور پر اگر اس کا موڈ بنا کہ اس نے تصویریں بنانا ہیں تو وہ کئی کئی مہینوں تک تصویریں ہی بناتا چلا جاتا تھا۔ اگر کبھی دل چاہا کہ گلاس اُلٹا کر اس پر روحیں بلانا ہیں تو سارا دن اور ساری رات یہ ہی کام ہوتا رہا ہے۔ اگر کتابوں کا شوق چڑھ آیا تو کئی کئی ماہ تک صرف مطالعہ ہی کرتا رہا ہے۔ اس حد تک کہ باتھ روم میں بھی مطالعہ کے لیے کتاب ساتھ لے جاتا تھا۔ بجلی چلی جائے تو موم بتی جلا کر مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ یہ دوست بھی وہیں تھا۔ میں نے امریکہ پہنچ کر سب سے پہلے خالدی کا پوچھا تو دوستوں نے بتایا کہ وہ بھی یہیں ہے اور اس نے شادی کر لی ہے ایک امریکی لڑکی کے ساتھ۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے ملواؤ تو میرا دوست مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔ جب ہم اس کے فلیٹ پر پہنچے تو کال بیل دی لیکن جواب ندارد۔ البتہ اندر سے کچھ چیزیں وغیرہ گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر بیل دی لیکن کوئی نہ آیا البتہ آوازیں آتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد دروازہ کھلا تو خالدی سامنے کھڑا تھا لیکن بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ۔ اتنے عرصے بعد مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے۔ اتنے میں اندر سے ایک بیلن اُڑتا ہوا نظر آیا اور اس کے سر پر لگا۔ اس نے پھر دروازہ بند کر لیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اس کا اپنی بیوی سے جھگڑا چل رہا ہے۔ میرے دوسرے دوست نے کہا کہ میں اس لیے آنا نہیں چاہتا تھا لیکن تمہاری وجہ سے آنا پڑا ہے۔ یہ تماشا تو روز ہوتا ہے۔ خیر اگلے دن خالدی کا فون آیا اور اس نے کہا کہ تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ چنانچہ وہ آیا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ وہ مجھے بالکل اسی طرح ملا جس طرح ہم لاہور میں تھے۔ اسی پیار اور محبت کے ساتھ۔ اس کی بیوی بار بار پرس سے آئینہ نکالتی اور کہتی Khalid! How I look likes? وہ بھی فوراً جواب دیتا Honey! You are pretty تھوڑی دیر بعد وہ پھر آئینہ دیکھ کر پوچھتی Tell me, How I look like! وہ پھر کہتا You are pretty. I love you کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر ایک ڈرائیون سینما میں لے گئے۔ وہاں

میں فلم دیکھتا رہا ان دونوں کے درمیان یہ ہی چلتا رہا کہ ?How I look like وہ پھر کہتا You are pretty. You are lovely میں بھی صرف سکرین پر تصویریں دیکھتا رہا لیکن میرے کانوں میں آوازیں صرف یہ ہی آ رہی تھیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لڑکی ابنارمل ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی زیادہ ابنارمل ہو گئی۔ چنانچہ خالدی نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور دوسری شادی کر لی۔ وہاں بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا اور شادی ناکام ہو گئی۔ پھر اس نے تیسری شادی کی ایک چینی لڑکی کے ساتھ۔ وہ لڑکی اسے ساتھ لے کر ہانگ کانگ آ گئی۔ جب میں تھائی لینڈ میں سفیر تھا تو ایک روز ہمارے ایک مشترکہ دوست مالک کا امریکہ سے فون آیا۔ اس نے بتایا کہ خالدی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیسے تو اس نے بتایا کہ پہلے اس کو فالج ہوا۔ ایک روز پہلے اس کی بیوی اس کے کمرے میں گئی تو اس کا سر کمپیوٹر ٹیبل پر لٹکا ہوا تھا اور روح پرواز کر چکی تھی۔ مجھے سخت صدمہ ہوا۔ یہ میرے ان دوستوں میں سے تھا جن کے ساتھ ہم نے بہت اچھا وقت گزارا تھا اور میں اسے کبھی بھول نہیں سکتا۔

س آپ نے اورینٹل کالج سے ایم اے کیا۔ یہ کب کی بات ہے؟

ج میں نے داخلہ لیا تھا 1964ء میں اور دو سال بعد ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

س ان دنوں آپ کے اساتذہ کون تھے اور اس وقت میں اور آج کے حالات میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج ان دنوں جب لوگ ایم اے اُردو کرتے تھے۔ وہ واقعی ایم اے کرتے تھے۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی اور مضمون میں داخلہ نہیں ملا تو اُردو میں داخلہ لے لیا۔ ان لوگوں کا مقصد واقعی اُردو میں ایم اے کرنا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں جس اُستاد نے مجھے نہایت متاثر کیا اور میں سمجھتا تھا ان جیسا اُستاد شاید اور کوئی نہیں ان کا نام تھا ڈاکٹر سیّد عبداللہ۔ وہ ایک گھنٹے کا لیکچر دیتے تھے اور لان میں ٹینٹ لگا کر سوڈیڑھ سو لڑکے لڑکیاں ان کا لیکچر سنتے تھے۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج میں کلاس رومز میں بھی پردہ لگا ہوتا تھا اور لڑکے ایک طرف اور لڑکیاں دوسری طرف بیٹھتے تھے اور آپس میں بات کرنے کی سخت پابندی ہوتی تھی۔

ہمارے ایک اُستاد تھے جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا وہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھے لیکن اُنہیں اپنی عمر کم کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے کسی لڑکے کو ڈانٹتے تو کہا کرتے شرم کرو یہاں میری بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ حالانکہ یہ لڑکیاں عمر میں ان کی پوتیوں کے برابر تھیں لیکن وہ انہیں بہنیں ہی کہا کرتے تھے۔ایک دن انہوں نے کسی کو یہی کہا کہ یہاں میری بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں تو پچھلے بنچوں سے کسی لڑکے نے کہا ''سر! اگر آپ کی بہنیں ہیں تو ہماری تو پھوپھیاں ہوئیں۔'' اس بات پر زبردست قہقہہ پڑا۔اس کے بعد پروفیسر صاحب نے یہ کہنا چھوڑ دیا۔ان کے علاوہ میرے اساتذہ میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار شامل تھے۔ یہ سب بہت قابل شخصیات ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے علاوہ ایک اور اُستاد جس نے مجھے متاثر کیا وہ تھے سیّد وقار عظیم۔ وہ واقعی ایک عظیم آدمی تھے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ تدریس ایک بڑا فن ہے۔اس فن پر سیّد عبداللہ اور سیّد وقار عظیم کو جو دسترس حاصل تھی۔ وہ میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو بھی نہایت آسان زبان میں بیان کر دیتے تھے اور ہم لوگ جو اس وقت طالب علم تھے ان کی یہ باتیں بہت آسانی سے سمجھ آ جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ ہمارے ایک اور اُستاد بھی تھے جن کا کمال یہ تھا کہ وہ آسان ترین مضمون کو بھی مشکل ترین انداز اور زبان میں بیان کر دیتے تھے۔ان کا نام لینا اب مناسب نہیں۔ خواجہ ذکریا صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ میں ان کا شاگرد ہی نہیں دوست بھی ہوں۔

س: آپ نے صحافت کا آغاز سفر امریکا کے بعد کیا؟

ج: جی نہیں۔ میں امریکا جانے سے قبل بلکہ اپنے دورِ طالب علمی ہی میں نوائے وقت میں کام کر چکا تھا۔ان دنوں میں تعلیمی صفحہ کیا کرتا تھا۔ 1967ء میں میں نے نوائے وقت میں بحیثیت سب ایڈیٹر ملازمت کر لی۔ اسی دوران میں نے پروفیسر کرامت حسین جعفری پرنسپل ایم اے او کالج کا انٹرویو کیا۔ دورانِ انٹرویو انہوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟ میں نے کہا جی عطاء الحق قاسمی۔ انہوں نے کہا کہ بہاؤ الحق قاسمی تمہارے کیا

لگتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ وہ میرے والد ہیں۔ اس پر انہوں نے اُٹھ کر مجھے گلے سے لگایا اور کہا کہ تم تو میرے بھتیجے ہوئے۔ میں تمہارے والد کے ساتھ ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھتا تھا۔ انہوں نے استفسار کیا کہ تم ''ایجوکیشن'' میں آنا چاہتے ہو یعنی ایم اے او کالج میں۔ مجھے شروع ہی سے تدریس سے لگاؤ تھا۔ میں نے کہا کہ آنا تو چاہتا ہوں لیکن میرا امریکا جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ واپسی کب ہوگی؟ تو میں نے جواب دیا کہ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس پر وہ بولے اچھا جب بھی واپس آؤ گے تو یہاں تمہارے لیے سیٹ خالی ہوگی۔ اس سے آپ دیکھیں کہ کیسے کیسے شفیق اُستاد ہوا کرتے تھے ان دنوں۔ میں دو سال بعد واپس آیا تو واقعی انہوں نے میرے لیے سیٹ رکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے ایم اے او کالج سے وابستگی اختیار کر لی۔ ابھی تین ماہ پہلے میں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا تو مجھے ایک شکستہ حال قبر نظر آئی جو مکمل طور پر زمین میں دھنس چکی تھی۔ میں نے کتبہ پڑھا تو اس پر لکھا تھا ''پروفیسر کرامت حسین جعفری'' میرے دل کو دھچکا لگا۔ ہمارے ملک کا اتنا بڑا نام جس کی تعلیم کے میدان میں بے شمار خدمات اور قبر اس حال میں۔ میں نے گورکن سے پوچھا کہ اس قبر پر کوئی نہیں آتا؟ اُس نے بتایا کہ کبھی کسی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ چنانچہ میں نے اپنے محسن کی قبر کو دوبارہ درست کرایا۔ اب یہ قبر بڑی اچھی حالت میں ہے۔ جعفری صاحب کا احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ خدا ان کے درجات بلند کرے۔

س آپ نے ایم اے او کالج کب جوائن کیا اور پھر وہی بات کہ اس وقت کے اور آج کے ایم اے او کالج میں کیا فرق ہے؟

ج میں ایم اے او کالج سے وابستہ ہوا 1971ء کے آخر میں۔ باقی فرق کوئی زیادہ نہیں پڑا۔ اس وقت لڑکوں کے نیفے میں چاقو ہوتے تھے اور اب پستول ہوتے ہیں۔ اب میں آپ کو دو باتیں بتاتا ہوں۔ ان سے آپ اندازہ لگائیں۔ ایک مذاق کی بات ہے اور دوسری سنجیدہ۔ ایک مرتبہ مجھے اعجاز بٹالوی صاحب کا رُقعہ ملا۔ انہوں نے ایک لڑکے کے داخلے کی سفارش کی تھی۔ ان کا یہ رقعہ بڑا دلچسپ تھا۔ اُنہوں نے لکھا تھا ''قاسمی صاحب!

حامل رُقعہ ہذا کا خیال ہے کہ انسان کو علم ضرور حاصل کرنا چاہیے خواہ اس کے لیے ایم اے او کالج ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ یہ تو ہوگئی مذاق کی بات لیکن اس سے قطع نظر ایم اے او کالج کی تعلیم کے میدان میں بہت خدمات ہیں۔ اس کالج نے تھرڈ ڈویژن حاصل کرنے والے ان طالب علموں کو اپنے دامن میں جگہ دی جن کو اور کوئی کالج قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور ان میں سے بہت سے لڑکے ایسے ہیں جنہوں نے آگے چل کر اپنا اور کالج کا نام روشن کیا۔ جہاں تک ایم اے او کالج کے نتائج کا تعلق ہے تو میں نے ایک بار کہا کہ ایک بار گورنمنٹ کالج کے طلباء کو یہاں بھیج دیں اور یہاں کے طلباء کو وہاں بھیج کر نتائج کا موازنہ کریں تو پتہ چل جائے گا کہ کون سا کالج بہتر ہے۔ ہمارا تعلیمی عملہ بہت اچھا ہے لیکن ہم نے ہمیشہ کم نمبروں والے طلباء کو داخلہ دیا۔ اصل میں کالج میں یہ خرابی ہے کہ اس کا محل وقوع بہت غلط ہے۔ یہ کالج عین اس سڑک پر واقع ہے جو سیکرٹریٹ کو جاتی ہے۔ لڑکا کلاس روم سے باہر قدم رکھتا ہے تو روڈ پر ہوتا ہے۔ کلاس رومز بالکل سڑک کے ساتھ ہیں۔ جب میں وہاں پڑھتا تھا تو ٹریفک کے شور کے باعث پڑھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہاں یہی صورت حال ہے۔

س آپ نے ایم اے او کالج کب چھوڑا بحیثیت اُستاد؟

ج ناروے سے واپسی پر میری ٹرانسفر ایف سی کالج ہوئی تو میرا اور ایم اے او کالج کا ساتھ ختم ہوا ہے۔ سفارت کے دوران میں ڈیپوٹیشن پر تھا۔ اس کے علاوہ میں نے تدریس چھوڑی نہ نوائے وقت چھوڑا۔ یہ دونوں میری زندگی کے بڑے Passion ہیں۔

س فکاہی تحریر کا عنصر تو آپ کو وراثت میں ملا ہے لیکن ڈرامہ نگاری کی طرف آپ کیسے مائل ہوئے؟

ج دیکھئے دو چیزیں اہم ہوتی ہیں انسان میں۔ ایک تو وہ جو جینز میں آئے اور دوسری جو ماحول سے ملے۔ علم تو میری جینز میں تھا ہی۔ اس سے تو مفر ممکن ہی نہیں۔ دوسرا ہے ماحول۔ ہمارے گھر کا ماحول بھی اسی قسم کا تھا مثلاً ابا جی جب بھی شہر سے باہر جاتے تو پوچھتے کہ تمہارے لیے کیا لاؤں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا شوق ہوتا ہے جو اس کے فطری رجحان کی

عکاسی کرتا ہے۔ میرا فطری رجحان شعروادب کی طرف ہی تھا۔ اس لیے میں ان سے کہا کرتا تھا کہ وہ میرے لیے کہانیوں کی کتابیں لائیں۔ ایک چیز تو تھی یہ اور دوسری بات یہ کہ میں نے آٹھویں جماعت ہی سے ادب میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس کے علاوہ بھی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ میں بیٹھے بیٹھے میز یا کسی اور چیز پر طبلہ بجایا کرتا تھا۔ گویا ردھم سے آشنائی تھی۔ یہ بھی شاعری سے لگاؤ کا اظہار تھا۔ چنانچہ میں سکول کے بینڈ میں ڈرم بجایا کرتا تھا۔ جب ابا جی کو یہ بات پتہ چلی تو مجھے بینڈ چھوڑنا پڑا۔ ویسے اب بھی میں میوزک کی کوئی بیٹ بجالیتا ہوں۔ یہ چیزیں فطرتاً میرے مزاج کا حصہ ہیں۔ سکول میں ناصر زیدی میرا کلاس فیلو تھا اور ہمارے فارسی کے اُستاد تھے مسٹر اختر حسین تاباں۔ وہ ہمیں مخاطب کر کے کہا کرتے تھے ''لکھ لو میری بات یہ ریوڑیاں بیچا کرو گے تم لوگ۔ کرو گے کچھ نہیں کیونکہ تم لوگوں کے لچھن ہی ایسے ہیں۔'' صد افسوس! کہ اُستاد محترم کی یہ بات سچ ثابت نہ ہوئی۔ ورنہ لچھن ہمارے ایسے ہی تھے۔ سکول اور کالج میں دلچسپ بات یہ ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں زیادہ حصہ نثر کا ہے۔ جب کہ اس کا آغاز میں نے شاعری سے کیا تھا اور شاعری بھی مزاحیہ۔ گویا مزاح میری ادب دوستی کی بنیاد ہے۔ ویسے ایک سخت دینی گھرانے کا فرد ہونے کے ناتے یہ بات میرے لیے بھی حیران کن ہے لیکن یہ ایک فطری رجحان ہے۔ کالج کے زمانے میں بھی میں نے دوستوں کی ہجو لکھی۔ میرا پہلا کالم جو ہفت روزہ شہاب میں چھپا میں نے فرسٹ ایئر میں لکھا تھا۔ ایم اے تک میں ہجو یہ شاعری کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ نثر بھی لکھی لیکن ذرا کم۔ بعد میں میری شاعری سنجیدہ ہوتی گئی اور نثر کا رجحان بڑھتا گیا۔

س پاک ٹی ہاؤس نصف صدی سے زائد عرصے سے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی بیٹھک کا کام دے رہا ہے۔ کیا آپ کا بھی اس سے کوئی تعلق رہا ہے؟

ج جی ہاں میں بہت عرصے تک ٹی ہاؤس جاتا رہا ہوں۔ بعد میں بھٹو صاحب کے دور میں ٹی ہاؤس دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں میں بھی وہ تحمل اور بات کہنے اور سننے کا وہ حوصلہ اور برداشت نہیں رہی جو ان میں ہونی چاہیے تھی۔ جب میں وہاں جایا کرتا تھا تو بڑے لوگ وہاں آیا کرتے تھے

جن میں انجم رومانی، شہرت بخاری، انتظار حسین اور اعجاز بٹالوی جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ ہمیں بھی بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا لیکن ایک بات میں بہت شدت سے محسوس کرتا تھا کہ جو گفتگو میں حلقہ ارباب ذوق میں ایک سال قبل سنتا رہا تھا وہی ایک سال بعد بھی ہو رہی تھی۔ بعد میں حلقے بھی دو بن گئے ایک ادبی اور ایک سیاسی۔ ادبی کہتے تھے کہ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور سیاسی کہتے تھے کہ سیاست ہی سب کچھ ہے۔ میرے نزدیک دونوں ہی غلطی پر تھے کہ ان دونوں کو ایک ہی توازن میں ہونا چاہیے۔ ادب اور سیاست الگ نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط ہیں۔ چنانچہ 77ء کے بعد جانا کم ہو گیا۔

س ہمارے ہاں ادبی گروہ بندی میں بھی دو گروپ ہیں یعنی قاسمی گروپ اور وزیر آغا گروپ آپ ان میں سے کس سے متاثر ہیں؟

ج دیکھیں بظاہر تو بات کسی اور طرح لگتی ہے لیکن اندر سے ٹٹولیں تو ممکن ہے کہ وہ آدمی اس طرح کا نہ ہو جس طرح کا وہ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نہیں سمجھتا کہ میں کبھی غیر نظریاتی گروہ کا حصہ بنا ہوں۔ میری بڑی عجیب طرح کی گروہ بندی ہے یعنی میں بیک وقت احمد ندیم قاسمی جو ترقی پسند ہیں اور صحافت میں جناب مجید نظامی جو ایک دوسرے دھارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجیب الرحمٰن شامی جو اپنا ایک الگ اندازِ فکر رکھتے ہیں۔ نعیم صدیقی جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں، سے تعلق رکھتا ہوں اور میرا واحد نقطہ جو میرے پیش نظر رہا ہے وہ ہے پاکستان اور پاکستانیت۔ میرے نزدیک احمد ندیم قاسمی ایک اعلیٰ درجے کے روشن خیال، ترقی پسند اور پاکستان سے محبت رکھنے والے شخص ہیں۔ اسی طرح صحافت میں ان لوگوں سے متاثر ہوں جو پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں چاہے وہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے۔ میرے نزدیک دایاں بازو اور بایاں بازو بے معنی بات ہے۔ میرے سامنے دو ہی باتیں ہوتی ہیں Pro Pakistan یا Anti Pakistan میرا وزن ہمیشہ اس پلڑے میں ہوتا ہے جو Pro Pakistan ہے یا میں سمجھتا ہوں کہ وہ پاکستان کا حامی ہے، مخالف نہیں۔

س قاسمی صاحب! میرا سوال اپنی جگہ بدستور موجود ہے۔

ج میں نے عرض کیا نا کہ میں ادبی گروہ بندی کو مانتا نہیں۔ اگر میں ایسی گروہ بندی میں شامل ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے علمی مرتبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دوں جو میں نے آج تک نہیں کیا۔ میں ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا ایک بلند مرتبہ نقاد ہیں اور بہت بڑے Scholar ہیں۔ البتہ بحیثیت مجموعی جس میں ترقی پسندی کے لیے ان کا جیل جانا، ان کا ایک بلند پایا شاعر ہونا، ایک بہت بڑا افسانہ نگار ہونا، امروز کا ایڈیٹر ہونا اور نئی نسلوں کے بہت سے لوگوں کو پروان چڑھایا ہے۔ اس لحاظ سے قاسمی صاحب کی شخصیت اتنی بڑی بن جاتی ہے کہ ان کا کسی سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

س آج کل شاعری میں کچھ نئے تجربات کیے جا رہے ہیں جیسے آزاد اور مکالماتی غزل وغیرہ آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ج دیکھیے جو گروہ بند لوگ ہوتے ہیں وہ اس طرح کی آراء کو جو آپ علمی طور پر دیتے ہیں زندگی موت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ میں اس طرح کے بکھیڑوں میں نہیں پڑتا۔ اصل میں ہمارے ہاں اصل تحقیقی لوگ کم ہو گئے ہیں اور اپنے لکھے ہوئے لفظ کی پائیداری پر یقین نہیں۔ اس لیے یہ لوگ تاریخ ادب میں خود کو کسی نہ کسی حیثیت میں زندہ رکھنے کے لیے ایسے سہارے تلاش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ایسے علمی تجربات ہونے چاہئیں لیکن ان کو زندگی موت کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔

س آپ کے اسفار کا آغاز تو امریکہ کے سفر سے ہوا لیکن سفرنامہ نگاری کا آغاز کب ہوا؟

ج اسی سفر امریکہ سے واپسی کے فوراً بعد سفرنامہ نگاری کا آغاز بھی ہو گیا۔ میں نے نوائے وقت میں پہلا سفرنامہ لکھنا شروع کیا لیکن دو چار قسطوں کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ اخبار اس کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ اگرچہ ان دنوں لکھنے کی بھی بڑی آزادی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ اخبار کے لیے ایک بوجھل چیز ہے اس لیے اس کو بند کر دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے ایک بھرپور قسط لکھی اور احمد ندیم قاسمی کو دے آیا۔ اس وقت میرے ان سے کوئی مراسم نہیں تھے۔ اس بات سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ کس طرح

انہوں نے نئے لوگوں کو تیار کیا۔ یہ قسط دینے کے بعد میں بھول گیا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ جا کر ان سے پوچھتا دوست ذکر کرتے تو اُن سے پوچھتا کہ آپ نے کہاں پڑھا تو وہ بتاتے کہ قاسمی صاحب نے سنایا ہے۔ جب ان سے ملنے جاؤ وہ تمہارا سفر نامہ کھول کر بیٹھے ہوتے ہیں اور تمہارے جملے سنا سنا کر خود بھی محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتے ہیں۔ اس پر مجھے حوصلہ ہوا اور ان سے ملنے چلا گیا۔ وہ سراپا تحسین تھے۔ انہوں نے یہ سفر نامہ قسط وار فنون میں شائع کر دیا۔ میں بڑا سست آدمی ہوں۔ جب میں لکھنے سے تھک جاتا تو ان سے کہتا کہ اب بس کریں میں اور قسط نہیں دے سکتا تو وہ کہتے کہ اچھا اس بار فنون شائع نہیں کریں گے۔ اسی سے اندازہ لگائیں کہ انہوں نے نئے لکھنے والوں کو کس طرح حوصلہ دیا اور ان کو نکھارا ہے۔ انہی دنوں مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ ''نکلے تیری تلاش میں'' سیارہ ڈائجسٹ میں چھپ رہا تھا اور میرا شوق آوارگی فنون میں چھپ رہا تھا لیکن کتابی صورت میں یہ سفر نامہ بہت بعد میں آیا۔ اصل میں جب میں نے دیکھا کہ قاسمی کسی صورت بھی مجھے چھوڑنے والے نہیں اور میں لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا اس لیے میں نے ان سے جھوٹ بولا کہ قاسمی صاحب اب تو صرف چند ابواب باقی ہیں۔ اگر میں نے یہ بھی فنون میں دے دیے تو پھر کتاب نہیں بکے گی۔ اس پر انہوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ اس کے بعد میں سات برس تک اسے نہ لکھ سکا۔ پھر یہ ہوا کہ جو سفر بعد میں کیے ان کے سفر نامے پہلے آ گئے اور جو سفر سب سے پہلے کیا تھا اس کا سفر نامہ بہت بعد میں آیا۔ ان سفر ناموں میں آسٹریلیا کا سفر ''دُنیا خوبصورت ہے'' یورپ کا ''گوروں کے دیس میں'' پھر بھارت کا ''دلی دور است'' وغیرہ آئے۔ ذاتی طور پر مجھے ''شوقِ آوارگی'' سب سے زیادہ پسند ہے۔

س گویا پہلے پیار کی طرح پہلا سفر ہی سب سے زیادہ پسند ہے؟

ج بالکل یہی بات ہے۔ میرا پہلا سفر نامہ پہلا پیار ہی تو ہے۔

س نثر نگاری میں آپ نے سفر نامہ لکھا۔ کالم نگاری کی۔ ڈرامہ نگاری میں نام کمایا لیکن کبھی افسانہ کی طرف توجہ نہیں دی۔ کیوں؟

ج میں نے اپنا افسانہ کبھی کسی ادبی پرچہ میں نہیں چھپوایا لیکن ہوتا یہ آیا ہے کہ میرے

بے شمار نقادوں نے میری توجہ اس طرف دلائی کہ تم بنیادی طور پر افسانہ نگار ہو۔ کیونکہ تمہارے بہت زیادہ کالم ایسے ہیں کہ جنہیں شارٹ سٹوریز یا افسانے شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میرا ایک کالم ہے "طوطے ہی طوطے" پھر ایک اور کالم ہے "الہ دین کے جن کا زوال" یہ ایک ایسے کالم ہیں جنہیں لوگ افسانے کہتے ہیں لیکن میں انہیں کالم کہتا ہوں۔ چونکہ انہیں اخبار میں چھپنا ہوتا تھا اس لیے میں نے جو کچھ بھی لکھا ہوتا تھا اسے کالم کا عنوان دے کر بھجوا دیتا تھا۔ حالانکہ وہ کالم کے ذیل میں آتے تھے بلکہ خالص افسانے تھے۔ اسی طرح میرا ایک کالم چھپا ہے وہ درحقیقت دو سو فیصد افسانہ یعنی شارٹ سٹوری ہے۔ اس کا نام "شینڈ لیئر" یعنی فانوس۔ اگر میں اسے کبھی بھی ادبی پرچے میں بھیج دوں تو وہ افسانے کے طور پر چھاپ لے گا لیکن میں انہیں کالم کی جگہ چھپواتا ہوں تاکہ لاکھوں لوگ اسے پڑھیں۔ یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے چند افسانے لکھ رکھے ہوئے ہیں جو باقاعدہ طویل افسانے ہیں۔ میں نے ان کو رکھ چھوڑا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ان کو دوبارہ دیکھوں گا۔ اگر پسند آئے تو ٹھیک ورنہ پھاڑ کر پھینک دوں گا۔

س صحافت میں کالم نگاری کے علاوہ آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

ج میں نے 67ء میں نوائے وقت میں کام شروع کیا۔ میں اس میں سب ایڈیٹر بھی رہا۔ اس کے علاوہ میں نے سنڈے میگزین میں فیچر بھی لکھے۔ جیسے ریاض بٹالوی صاحب "مشرق" میں فیچر لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح میں "نوائے وقت" میں فیچر لکھتا تھا۔ انہی دنوں میں نے ایک بار ہیجڑوں پر ایک فیچر لکھا تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا۔

س قاسمی صاحب! اب آتے ہیں آپ کے ایک اور مورچے کی طرف یعنی سفارت کی طرف۔ یہ بتایئے کہ آپ کب سے کب تک سفیر کے طور پر فرائض سرانجام دیتے رہے؟

ج اس کا عرصہ بنتا ہے دو سال۔ 1997ء سے 1999 تک۔ جانے کی تاریخ تو ٹھیک سے یاد نہیں لیکن غالباً جون یا جولائی 97ء اور واپس آیا ہوں 28 اکتوبر 99ء کو۔

س کن کن ممالک میں؟

ج پہلے ناروے اور پھر تھائی لینڈ۔ تقریباً دو سال ناروے میں اور پھر تین ماہ تھائی لینڈ میں۔

علی محمد خاں، ڈاکٹر

ڈاکٹر علی محمد خاں کے فن اور شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ ممتاز ماہر تعلیم، معروف مصنف، نامور محقق، انہیں عہد حاضر کا سب سے بڑا خاکہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔ تخلیق اور تحقیق کا ایسا خوبصورت امتزاج بہت کم اہل قلم کو نصیب ہوتا ہے۔ جیسا آپ کے ہاں پایا جاتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے درس و تدریس سے منسلک ہیں۔ چھتیس (۳۶) کتابوں کے مصنف ہیں۔ میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میں نے اپنی ایف ایس سی کے دنوں میں ڈاکٹر علی محمد خاں کے ساتھ کالج میگزین ''دبستان'' کے سب ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب شعبہ اردو کے سربراہ ہونے کے علاوہ کالج میگزین کے چیف ایڈیٹر بھی تھے۔ حرف سے شناسائی میں ڈاکٹر صاحب نے میرے جیسے بہت سے طالب علموں کی رہنمائی کی ہے۔ کئی نسلوں نے آپ سے کسب فیض کیا ہے۔ روایت کے مطابق آپ کے شاگردوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ آج کل بھی ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو سے بطور پروفیسر منسلک ہیں اور پوری توانائی سے علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ شعبہ اردو کے چیئرمین کا عہدہ انہوں نے بوجوہ خود چھوڑ دیا تھا۔

س بات ابتدا سے شروع کرتے ہیں۔ یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ لکھنا چاہیے؟

ج پرانی بات ہے۔ کیا بتاؤں کہ میں پنڈی بھٹیاں سکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ میں نے ۱۹۶۲ء میں بغیر تیاری کے ایم اے کا امتحان دے دیا۔ بغیر پڑھے سیکنڈ ڈویژن آ گئی۔ جس سے مجھے غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ میں بڑا لائق فائق ہوں۔ بس وہیں سے لکھنے لکھانے کا سلسلہ چل نکلا۔ پی ایچ ڈی پر مجھے عمر فیضی نے اُکسایا اور استاد محترم سجاد باقر رضوی کے

اصرار اور شاگردی سے یہ ممکن ہوسکا۔

س آپ کی تربیت میں زیادہ عمل دخل کس کا ہے؟

ج میرے خیال میں بڑے بھائی جمال محمد خان کا میری تعلیم و تربیت میں سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ وہ مجھ سے سولہ سال بڑے ہیں۔ جس سال میں پیدا ہوا، اس سال انہوں نے حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت (ہریانہ) سے انٹرنس کیا تھا۔ بڑے بھائی کے علاوہ عمر فیضی اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا مجھ پر بڑا اثر رہا۔

س گویا آپ پانی پت (انڈیا) سے ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں؟ اپنے بچپن کے حالات کے بارے میں اختصار سے آگاہ فرمایئے۔

ج میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں میری تاریخ ولادت ۵ ستمبر ۱۸۴۲ء درج ہے۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے وقت میری عمر چھ سال بنتی ہے۔ مگر ماں جی کہا کرتی تھیں کہ میں ۵ بھادوں بروز پیر پیدا ہوا تھا اور جب بٹوارا ہوا تو میں چار سال کا تھا۔ اس طرح تقویم کے قاعدے سے میری تاریخ ولادت ۲۲ اگست ۱۹۴۳ء بنتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔ میری ولادت پانی پت، ہریانہ (انڈیا) میں ہوئی تھی۔ ہجرت کر کے پاکستان کیسے پہنچے، یہ ایک لرزہ خیز مگر مبنی بر حقیقت داستان ہے جسے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جب ہم پانی پت سے لٹے پٹے، خراب حال بادامی باغ (لاہور) کے رفیوجی کیمپ میں پہنچے تو سترہ دن تک حواس باختہ وہیں پڑے رہے۔ سخت سردیاں تھیں، مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ میں اپنی ماں کے ہمراہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پڑے ہوئے پتھر کے کوئلے چنا کرتا تھا۔ شام تک سات آٹھ سیر کوئلے اکٹھے ہوجاتے جن میں سے تھوڑے بہت تو ہم کیمپ میں آگ تاپنے کے لیے رکھ لیتے اور زیادہ مقدار میں بیچ دیتے۔ جس سے سات آٹھ آنے روز مل جاتے۔ کیمپ میں یونہی گزر بسر ہو رہی تھی کہ پھر کسی کے مشورے سے کیمپ کو خیر آباد کہہ دیا اور قسمت آزمائی کے لیے پھرتے پھراتے ڈسکہ کے نواحی گاؤں میتراں والی پہنچے اور وہیں مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ یہ ڈسکہ سے بجانب مغرب اپر چناب کی ذیلی نہر نوکھر برانچ کے کنارے آباد ہے۔ یہاں کی فضا بڑی خوشگوار اور زمین بڑی زرخیز ہے۔ ابتدائی تعلیم کے

حصول کے زمانے میں میں اپنے ہم جماعتوں کو سرکنڈے اور نرسل کی قلمیں بنا بنا کر اور معمولی اُجرت پر ان کی کتابوں کی جلد بندی کر کے دیا کرتا تھا۔ میں نے پہلے گاؤں کے پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر ۱۹۵۸ء میں اسلامیہ ہائی اسکول میتراں والی سے میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا۔ میں نے پرائمری، مڈل اور میٹرک میں وظیفہ حاصل کیا۔

س دورِ حاضر میں اردو ہمارے لیے کس حد تک ضروری ہے؟

ج آج کے ترقی یافتہ دور میں اُردو ہمارے لیے از حد ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حلقہ اثر کے اعتبار سے اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو (Unesco) کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی کل چھ ارب آبادی میں سے کم و بیش ایک چوتھائی لوگ اسے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ بڑی زبردست زبان ہے۔ اس میں سائنس کے تمام مضامین کی تعلیم باآسانی دی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے دس سال قبل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں تمام سائنسی مضامین بشمول علم طبقات الارض (Geology) اور سمندری علوم (Oceanography) اردو میں دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین جنہوں نے پاکستان میں یورینیم کی افزودگی کا پودا لگایا تھا وہیں کے گریجوایٹ تھے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں ضرورت کے تحت اردو کی تدریس کے شعبے قائم ہیں اور وہاں اردو میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ آج پاکستان بنے ہوئے ۶۵ سال ہونے کو آئے ہیں۔ مگر پاکستان کی قومی زبان ہونے کے باوجود پاکستان میں اردو کو عملاً وہ درجہ حاصل نہیں ہوا جو اُسے ملنا چاہیے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان دولخت ہوا تو قومی زبان کی افادیت کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء کے آرٹیکل ۲۵۱ کے تحت طے پایا کہ ۱۵ سال کے اندر اردو کو قومی زبان قرار دے کر اسے دفتری زبان کے طور پر نافذ کیا جائے۔ مگر ۳۹ سال گزرنے کے باوجود اردو کو پاکستان میں دفتری زبان کے طور پر نافذ نہیں کیا گیا جو کہ آئین کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

س قومی یک جہتی کے لیے قومی زبان کا کردار کتنا اہم ہوتا ہے؟ اردو زبان اس ضمن

میں کیا خدمات سرانجام دے رہی ہے؟

ج اُردو ہماری لنگوا فرانکا (Lingua Franca) ہے۔یعنی پاکستان کے ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔اس زبان نے غیر مرئی طور پر (Invisibily) عوام کو آپس میں منسلک کر رکھا ہے۔قومی وحدت اور یک جہتی کو مستحکم کرنے میں یہی زبان بنیادی کردار ادا کر رہی ہے۔آپ پاکستان کے دور دراز علاقوں میں تشریف لے جائیں۔آپ کو وہاں کے لوگوں سے ابلاغ (Communication) میں محض اردو کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔اردو پاکستان میں کوچہ و بازار اور کاروباری زبان ہے۔البتہ ابھی تک یہ سرکاری زبان نہیں بن سکی۔اگر اربابِ اقتدار فی الواقع ملک کو مضبوط اور مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں انہیں جلد یا بدیر اسے سرکاری اور دفتری زبان بھی بنانا ہوگا۔ورنہ ملک کی وحدت، اتحاد اور یکجہتی کو خطرات لاحق رہیں گے۔

اردو اخبارات، اردو شاعری، اردو فلمیں، اردو ڈرامے قومی یک جہتی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔الیکٹرانک میڈیا یا مختلف چینلز کا ذریعہ ابلاغ اردو ہے۔اردو عوام میں دوریوں کو دور کر رہی ہے اور قربتیں بڑھا رہی ہے۔اساتذہ، علماء، ٹی وی اور ریڈیو کے میزبان اردو کے ذریعے ہی لوگوں کے دلوں اور دماغوں تک رسائی حاصل کر رہے ہیں۔اردو میں لکھے گئے قومی نغمے اور ملی ترانے ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں ملی وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے ہیں۔میں سمجھتا ہوں ہر حوالے اور ہر زاویے سے اردو ہی قومی یک جہتی پیدا کرنے والا سب سے بڑا عامل ہے۔

س آپ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی نصابی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں کب سے کام کر رہے ہیں؟ اور کیا آپ شروع سے لے کر اب تک بنائے جانے والے میٹرک اور انٹرلیول کے اردو نصاب سے مطمئن ہیں؟

ج میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور کی اردو لازمی کی گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کی کتاب کے سلسلے میں ۱۹۹۲ء سے کام کر رہا ہوں۔۱۹۹۲ء سے پہلے انٹرمیڈیٹ کی سطح پر جو کتاب پڑھائی جاتی تھی اس کے مولفین میں ایک نام پروفیسر عمر فیضی کا تھا۔فیضی

صاحب نے اپنے حصے کا کام میری معاونت سے کیا تھا۔ اس زمانے میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں اردو کے ماہر مضمون سید سجاد رضوی تھے جو ہفت زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عالم و فاضل شخص تھے اور فیضی صاحب کے پرانے دوست تھے۔ جب اردو کا کورس بدلنے لگا تو فیضی صاحب نے نئے کورس کی تیاری کے سلسلے میں بوجہ معذرت کر لی اور اپنی جگہ میرے نام کی سفارش کر دی۔ اس طرح میں بھی ۱۹۹۳ء میں سے پڑھائی جانے والی کتاب کے مولفین میں شامل ہو گیا۔ دیگر ناموں میں ڈاکٹر انور محمود، پروفیسر امجد اسلام امجد اور ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا کے نام اہم ہیں۔ ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا مذکورہ کتاب کی مدیرہ بھی تھیں۔ ورکنگ ٹیچر ہونے کے ناتے اور دوستوں کے اصرار پر اس کتاب کی تمام مشقیں میں نے بنائی تھیں اور اسی کتاب کے لیے نصاب کے تقاضوں کے تحت ''ماحولیاتی آلودگی'' کے عنوان سے بڑی محنت سے ایک مضمون بھی لکھا۔ یہ کتاب ۲۰۰۳ء تک چلی۔ اگرچہ اس کتاب پر کچھ اعتراض بھی ہوئے مگر بالعموم اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ۲۰۰۴ء میں پھر کورس بدل گیا اور موجودہ کورس آ گیا۔ میں دمِ تحریر دسویں جماعت کی اردو لازمی ''بہارِ اُردو'' کا مدیر اور بارہویں جماعت کی اردو لازمی کی ''سرمایہ اردو'' کا مؤلف ہوں۔ علاوہ ازیں دسویں اور بارہویں جماعتوں کی اردو اختیاری کی کتابوں کا مدیر ہوں۔ اگر آپ تعلّی پر محمول نہ کریں تو عرض کروں کہ ''بہارِ اُردو'' اور ''سرمایہ اردو'' کی مشقیں بنانے کا تقریباً تمام کام میں نے سرانجام دیا تھا۔

اب رہی یہ بات کہ کیا میں شروع سے لے کر اب تک بنائے جانے والے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ لیول کے اردو کے نصاب سے مطمئن ہوں تو میرا جواب اثبات میں ہے۔ دراصل ہم جو نصاب تیار کرتے ہیں وہ قومی نصاب کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں تیار کردہ نصاب کے عین مطابق ہوتا ہے۔ پہلے کتاب صوبائی سطح کی ریویو کمیٹی دیکھتی ہے اور پھر اسے قومی ریویو کمیٹی وزارت تعلیم اسلام آباد کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں موثر و معتبر ماہرین مضمون شامل ہوتے ہیں۔ کسی بھی مضمون کی کمزور کتاب ان مرحلوں سے با آسانی نہیں گزر سکتی۔ میں اپنی تیار کردہ کتاب خوشی خوشی پڑھاتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا

ہوں کہ میں قوم کے نونہالوں کے لیے نصاب تیار کرنے والوں میں شامل ہوں۔

س آپ کا ادبی ذوق اتنا اعلیٰ ہے۔ کبھی شعر کہنے کا خیال نہیں آیا؟

ج ہاں شعر مجھے اچھے لگتے ہیں۔ ایک زمانے میں میں نے شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ ایک چھوٹی سی بیاض تیار ہو گئی تھی۔ پھر میں نے اپنے شعروں کا میر تقی میر، غالب اور مولانا حالی کی شاعری سے تقابل کیا۔ مجھے اپنے شعر مولانا حالی کے مقابلے میں جو کہ میری طرح پانی پت سے تعلق رکھتے تھے اور دیگر استاد شعراء جن کو میں پسند کرتا تھا، بڑے پھس پھسے لگے۔ میں نے خود اپنی شاعری کے دیانت دارانہ تجزیے کے بعد شاعری کو خیر آباد کہہ دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرا شعبہ نثر ہے۔

س کتابیں کس قسم کی پڑھنا پسند کرتے ہیں؟

ج مشتاق یوسفی اور انتظار حسین مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ ناول مجھ سے نہیں پڑھے جاتے اور ضخیم ناول بالکل بھی نہیں پڑھ سکتا۔ ''علی پور کا ایلی'' میں نے بیچ میں ہی چھوڑ دیا تھا اور ''راجہ گدھ'' جو کہ بانو قدسیہ کا شاہکار ناول ہے اس میں بھی بس ورق گردانی ہی کی ہے۔ تنقید اور تاریخ میرے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ تاریخ میں ایم اے کرنے کے علاوہ میری اس میں دلچسپی کا سبب پانی پت سے تعلق بھی ہے۔ ہمارے گاؤں کا نام راجہ داہر کے نام پر تھا اور پھر وہاں ابراہیم لودھی اور بابر کی یادگاروں کے علاوہ تاریخ کے بہت سے حوالے پانی پت سے نسبت رکھتے ہیں۔

س غیر ادبی مصروفیات کون سی ہیں؟

ج سیر و سیاحت، میں نے پاکستان کا کونا کونا چھان مارا ہے۔ اس کے علاوہ تہران گیا، کئی دفعہ سعودی عرب، انگلینڈ، آسٹریلیا، آئرلینڈ ایک ہفتہ رہ کر آیا ہوں۔ پھر سکاٹ لینڈ۔ جب بھی موقع ملتا ہے ہم دونوں میاں بیوی سیر کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ اب آسٹریلیا کا پروگرام ہے۔

عباس تابش

ہر تہذیب کا سب سے توانا اور موثر مظہر اس تہذیب کا ادب ہوتا ہے۔ پاکستانی تہذیب اپنی قدامت کے حوالے سے اور پاکستانی ادب اس قدامت کا مظہر ہونے کے ناطے، ایک عظیم تر ماضی کا امین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم تر حال کا بھی حامل ہے۔ پاکستانی ادب بہت سی روایاتِ فکر و فن کے تسلسل کا منظر نامہ ہے۔ عباس تابش پاکستانی ادباء کی اس نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر ہیں جس نے نہ صرف یہ کہ پاکستانی ادب کی آفاق گیر روایات کو اپنی روح میں سمویا بلکہ اپنی جراتِ مندانہ ہنر مندی کا بدن بھی عطاء کیا۔ یہ تمہیدی الفاظ خالد احمد کے ہیں کہ عباس تابش اپنی ہنر مندی کے حوالے سے اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم عصروں سے منسلک ہوتے ہوئے بھی منفرد نظر آتا ہے۔ آنکھ بدن کا چراغ ہے اور عباس تابش پاکستانی ادب کے ہرے بھرے بدن کا تازگی آفرین چراغ ہونے کے ناتے اس جسد کا نور ہے۔ جنوبی پنجاب کی تحصیل میلسی میں ۱۹۶۱ء میں پیدا ہونے والے اس خوش فکر شاعر نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا اور آج کل لاہور میں ہی تدریس کے شعبے سے منسلک ہیں۔ اب تک ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ارژنگ کے قارئین ان سے ہونے والی گفتگو کو اُمید ہے ضرور پسند فرمائیں گے۔

س شروع سے بات کی شروعات کرتے ہیں۔ شعری سفر کا آغاز کب اور کیسے کیا؟

ج شاعری کا آغاز ۱۹۷۵ء میں کیا۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے ایک اُستاد کا تبادلہ ہوا تو مجھے پوچھا گیا کہ آپ نے کچھ کہنا ہے تو میں نے کہا کہ میں نظم پڑھوں گا۔ جسے نظم سمجھ رہا تھا وہ نظم نہیں تھی نثر تھی۔ ایک دن میں اپنے گھر بیٹھا تھا۔

ہمارے گھر کے قریب ہی ایک بلدیہ کا باغ ہے، وہاں سے کوئی آواز آرہی تھی، عموماً لوگوں کے بات کرنے کی آواز ہوتی ہے لیکن وہ آواز کافی مختلف تھی تو میں نے والد صاحب سے اجازت لی اور وہاں چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک صاحب کچھ پڑھ رہے ہیں اور باقی واہ واہ کر رہے ہیں۔ میں سنتا رہا اور سوچا کہ یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں۔ ایک وجہ تو یہ بنی، دوسرا یہ کہ ہمارے والد صاحب پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن انہیں شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ سورۃ یوسف کی تفسیر جو مولوی عبدالستار اور مولوی غلام رسول نے لکھی ہے۔ وہ رات کو ان کتابوں میں سے اشعار سنا کرتے تھے، اس کے بعد انہوں نے مجھے بانگ درا لے کے دی تو اس کے بھی کچھ شعر یاد کیے۔ ہمارے سکول میں بیت بازی کا سلسلہ ہوتا تھا تو میں اس میں حصہ لیتا تھا تو ان سب عوامل کے ملاپ سے میرا مزاج بن گیا کہ شاید میں شاعر بن سکتا ہوں۔ میں میٹرک میں تھا تو والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ غربت تو گھر میں پہلے ہی تھی جو والد صاحب کے انتقال کے بعد شدید ہوگئی۔ ہم چار بہن بھائی تھے اور والدہ محنت کر کے ہمیں پالتی تھیں۔ والدہ نے کہا کہ تعلیم نہیں چھوڑنی لیکن وہ میری شاعری کے خلاف تھیں۔ وہ سوچتی تھیں کہ شاعر بیکار ہوتے ہیں اور اگر میرا بیٹا اس کام میں پڑ گیا تو پڑھے گا نہیں۔ جب ہم رات کو صحن میں سوئے ہوتے تھے تو میں چاندنی میں انتظار کرتا تھا کہ سب سو جائیں تو میں اٹھ کر شعر لکھوں، ادھر میں کاغذ قلم نکالتا اور ادھر ان کی آنکھ کھل جاتی تو گھر میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی کہ جہاں میں چھپ کر شعر کہوں اور پتہ نہ چلے۔ انہیں دنوں ۱۹۷۸ء میں میں نے ''ماہ نو'' کو غزل بھیجی۔ ماہ نو کی ایڈیٹر کشور ناہید تھیں۔ لوگ کافی ڈرتے تھے کہ کلام نہیں چھاپتیں، لیکن میں نے غزل بھیج دی۔ جب وہ میگزین ملا تو اس میں وہ غزل چھپی ہوئی تھی۔ میں بڑا خوش ہوا۔ کچھ دن بعد مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۲۹ روپے کا ایک منی آرڈر آیا۔ میں گھر گیا تو ہمارے گھر میں بڑے دنوں بعد گوشت پکا ہوا تھا۔ ماں نے یہ تو نہیں بتایا لیکن مجھ سے پوچھا کہ شاعری سے کوئی پیسے بھی ملتے ہیں، میں نے کہا ماں شاعری سے تو لوگوں نے کاریں کوٹھیاں بنالی ہیں۔ میں نے سوچا کہ ماحول بن رہا ہے تو شاید مجھے اجازت مل جائے۔ تو

انہوں نے بتایا کہ تو جس رسالے کا بتا رہا تھا اس کے ۲۹ روپے آئے ہیں، میں تجھے شاعری کی اجازت دیتی ہوں۔ وہ پہلا دن تھا جب ماں نے مجھے دعا اور شاعری کی اجازت دی۔ اس کے بعد کا سارا سفر ان کی دعا کے طفیل ہے۔

س آپ کی شاعری میں دشت، شجر اور پرندے کے استعارے بہت نمایاں ہیں۔ اس کا پس منظر کیا ہے؟

ج اس کا تعلق بھی میرے والد صاحب سے ہے۔ وہ چڑیوں کو باجرہ ڈالتے تھے۔ روزانہ کی بنیاد پر یہ میری ذمہ داری ہوتی تھی۔ جس دن میں بھول جاتا اس دن اتنی سرزنش کرتے تھے کہ آج بھی یاد کرتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں۔ تو یوں پرندوں سے میرا تعلق بن گیا۔ ایک اور شاعر جس نے مجھے متاثر کیا وہ ہے شکیب جلالی، ان کے ہاں بھی پرندہ آیا۔ پرندوں کے بارے میں نے پڑھا بھی اور انہیں بسر بھی کیا۔ پرندہ غیب کی آواز ہے یگانہ نے اسے ''معنی بے لفظ'' کہا ہے۔ مجھے اس سے بہتر ترغیب آج تک نہیں ملی۔ میں نے ایک واقعہ پڑھا امام رضا کے پاس ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور چڑیوں کا ایک غول آ کر شور کرنے لگا۔ آپ نے سنا اور اس آدمی سے کہا کہ وہاں درخت پر ایک سانپ چڑھ رہا ہے جو ان کے گھونسلے میں جا کر ان کے بچوں کو کھانے لگا ہے۔ جاؤ اس سانپ کو مارو اور ان کے بچوں کو محفوظ بناؤ۔ تو وہ چڑیاں امام کے پاس شکایت لے کر آئی تھیں۔ امام اور پیغمبر پرندوں کی آواز اور زبان کو سمجھتے ہیں۔ مجھے یہ بھی ایک دلچسپی ہوئی اور دشت اور پرندے اکٹھے کیسے ہوئے۔ میں کیونکہ میلسی کا رہنے والا ہوں اور چولستان وہاں سے آگے شروع ہوتا ہے۔ نسل در نسل مہاجر کے اندر سے مہاجرت کا احساس نہیں نکالا جا سکتا اور پرندے کے اندر سے بھی نہیں نکالا جا سکتا۔ اب بھی جب وہاں سخت موسم آتا ہے تو لاکھوں پرندے نامعلوم منزل کی طرف بڑھتے ہیں اور یہ سوچ کر بڑھتے ہیں کہ ہم اپنے گھر کی طرف جا رہے ہیں اور جب یہاں آتے ہیں تو شدید گرمی ہوتی ہے۔ تو وہ مر جاتے ہیں۔ تو یہ بات تھی جس نے میرے اندر دشت پرندے اور پھر شجر کو آپس میں جوڑ دیا۔ ہم سب بڑے درویشی دعوے دار ہیں

لیکن دیکھیں تو درخت دھوپ میں جلتا ہے اور دوسروں کو پھل اور چھاؤں دیتا ہے۔ کوئی آ جائے تو یہ نہیں کہتا کہ یہ چھاؤں تیرے لیے ہے اور تیرے لیے نہیں۔ ہمارا ایک بچھڑ جائے تو ہم بے حال ہو جاتے ہیں۔ اس کے لاکھوں پتے بکھر جاتے ہیں۔ وہ ٹنڈ منڈ کھڑا رہتا ہے۔ اس کی زبان سے اُف تک نہیں نکلتا۔

س ہیمنگ وے کے خیال میں آپ صرف اس وقت اچھا لکھ سکتے ہیں جب محبت میں مبتلا ہوں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ج میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ محبت میں مبتلا ہونے کا فیصلہ کون کرے گا۔ اس حوالے سے میرا اپنا نظریہ ہے کہ ابتدا میں ایک اُنس ہوتا ہے۔ جب تھوڑی سی شدت آتی ہے تو پیار بن جاتا ہے اور تھوڑا آگے جاتے ہیں تو محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ محبت کا معاملہ سب وہم کی پیداوار ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ بڑی شدت سے محبت کر رہے ہوتے ہیں اور جب بریک اپ ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ خودکشی کر لیں گے لیکن چار دن بعد نئی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک وہم ختم ہوا تو دوسرے نے جنم لیا لیکن اگر کسی نے وہم پر اعتبار کر لیا تو وہ عشق میں مبتلا ہو گیا۔ تو اس وہم پر اعتبار کا نتیجہ چند دن میں نہیں پتہ چلے گا۔ کچھ لوگ ساری زندگی اکٹھے گزار دیتے ہیں اور پھر پتہ چلتا ہے کہ ہم تو عشق کرتے ہیں۔ فرض کریں مجھے تخلیقی عمل میں ایک نیا تجربہ ہوتا ہے تو اس کی کیا گارنٹی ہے کہ میں اسے ابھی لکھ سکوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بیس برس بعد لکھا جائے۔ میں بوڑھا ہوں اور محبت کا شعر کہوں یہ تو ایسا شعر کہنے کی عمر نہیں۔ وہ شاید میرا بیس بائیس سال پرانا تجربہ ہو اور وہ لمحہ میرے اندر ٹھہرا ہوا تھا جو اَب میچور ہو کر سامنے آیا۔

س کیا آپ ہم عصروں یا دوسرے لکھاریوں کے ساتھ کوئی مقابلہ محسوس کرتے ہیں؟

ج میں نے ان سے کبھی مقابلہ سمجھا ہی نہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ میرے برابر کے نہیں ہیں۔ میں سب کو بڑا سمجھتا ہوں۔ میں کسی چیز کی خواہش نہیں کرتا، کئی دوست کہتے ہیں آپ کو فلاں جگہ لگوا دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میری منزل یہ نہیں ہے۔ میں تو ابھی منزل کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اور منزل ابھی آگے بھاگ رہی ہے اور میری منزل شعر

کہنا ہے۔ میری تو دعا ہے کہ میں شعر کہتا رہوں اور اللہ مجھے تروتازہ رکھے۔ مقابلہ بے وقوف کرتے ہیں۔

س کیا ادبی گروہ بندیاں ہوتی ہیں؟

ج گروہ بندیاں کیا ہوتی ہیں۔ چار لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں اور جوان سے نہیں کرتے وہ کہتے ہیں یہ ایک گروہ ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ گروہ آپ کے خلاف ہے تو اس کو آپ اپنی طاقت بناؤ۔ میرا خیال ہے کہ میں نے خود اپنا اتنا خیال نہیں رکھا، جتنا مخالفین نے رکھا ہے۔ مجھے بہت وقت دیتے ہیں اور میں ان کا بہت شکر گزار رہوں۔

س آپ ایک نئے شاعر کو دانشورانہ تربیت کے لیے کیا مشورہ دیں گے؟

ج مشورہ نہیں گزارش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں شعراء غزل پر محنت کرتے تھے۔ اس لیے کہ فنون کو غزل دینی ہوتی تھی۔ غزل اچھی نہیں ہوگی تو قاسمی صاحب نہیں چھاپتے تھے۔ فنون تین ماہ بعد آئے یا چھ ماہ بعد، کوشش ہوتی تھی کہ انہیں غزل دیں۔ اب معاملہ فیس بک نے بہتر بھی کر دیا ہے اور خراب بھی۔ خراب یوں کہ بہت اچھے شاعر جو محنت کرتے تھے انہوں نے محنت چھوڑ دی ہے۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ کاتا اور لے بھاگی۔ ادھر غزل لکھی اور ادھر لگا دی اور پانچ، چھ سو کمنٹ بھی آ جاتے ہیں اور وہ بھی یوں جیسے شادیوں میں نیوندرا دیا جاتا ہے۔ اس طرح کام خراب ہوا۔ پہلے مایوسی یہ تھی کہ آواز دنیا تک نہیں جاتی اس لیے ہمیں کوئی بلاتا نہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ آواز سوچنے سے پہلے پہنچ جاتی ہے اور اب بھی اگر نہیں بلایا جا رہا تو مایوسی زیادہ ہوگئی ہے۔ نئی نسل اس طرف راغب ہو رہی ہے کہ باہر جانے والے ہمارا نام کٹوا دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نام کوئی نہیں کٹوا سکتا۔ اللہ پر یقین ہو تو کوئی کسی کا راستہ نہیں روک سکتا۔ آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں امریکہ کے ٹور پر تھا۔ ثمینہ راجہ میرے بارے میں کوئی مضمون لکھ رہی تھیں کہ وہ شاعر نہیں ہے، چور ہے وغیرہ۔ مجھے لوگ بتاتے تو میں کہتا کوئی بات نہیں۔ میں جب یہاں آیا تو ایک مشاعرے میں میرے ایک دوست کے ساتھ یہی باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں میں تو منہ پر بات کروں گی۔ میں نے کہا آپ جو کہہ رہی ہیں درست کہہ رہی

ہیں۔ میں کوئی شاعروار نہیں ہوں اور آپ بہت بڑی شاعرہ ہیں۔ اب وہ دنیا میں نہیں ہیں لیکن میں اب بھی کہتا ہوں کہ وہ بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ تو کہتی ہیں کہ میں اس طرح آپ کو شاعر تھوڑی مان لوں گی۔ تو میں نے کہا میں اس لیے تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس مٹی ہے۔ آپ کے پاس سونا ہے۔ اللہ میری مٹی کو سونے کے بھاؤ بیچتا ہے اور آپ کا سونا مٹی کے بھاؤ نہیں بکتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

س مشاعرے بالخصوص بیرون ملک مشاعرے کو ادبی سرگرمی کے طور پر کتنا اہم سمجھتے ہیں؟

ج دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو مشاعرے میں نہیں جاتے۔ وہ مشاعرے کو برا کہتے ہیں۔ جنہیں بلایا جاتا ہے وہ کہتے ہیں یہ اچھا ہے، جو مخالف ہیں انہیں بھی اگر بلایا جائے تو فوراً پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے نام ہیں اور کالموں میں لکھتے ہیں کہ مشاعرہ تو برباد ہو گیا، خراب ہو گیا اور جب بلایا جاتا ہے تو پہلے پوچھتے ہیں کہ کتنے پیسے دیں گے۔ مشاعرے نے اردو زبان کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ بمبئی کی فلمی دنیا نے اور مشاعرے نے زبان کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ پھر یہ آڈیو ویڈیو سلسلہ ایسا ہے کہ اس کے ذریعے لوگ کہیں نہ کہیں شاعری سے جڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً میری کتاب کے کئی ایڈیشن چھپے لیکن پھر بھی کتنی تعداد ہوگی لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میرا ایک ویڈیو کلپ اڑھائی تین لاکھ لوگوں نے دیکھا ہے۔ تو سرشاری ہوتی ہے۔ میری رسائی کہاں تک ہے۔ اگر میر و غالب کے دور میں یوٹیوب ہوتی تو ہم آج دیکھ سکتے کہ میر صاحب کیسے شعر پڑھتے تھے۔ کیسے بیٹھتے تھے، آنے والے زمانوں میں کوئی تو ہوگا جو آج کے کسی شاعر کے بارے میں کہے گا کہ اس نام کا ایک شاعر تھا۔ یوٹیوب پر دیکھیں گے تو اس کے مشاعرے آ جائیں گے۔ جو کہتے ہیں مشاعرے کو خراب کر دیا گیا۔ ان کے لیے مشورہ ہے کہ اس کا حصہ بنیں اور اسے ٹھیک کر دیں۔ مشاعروں میں ضرور جائیں لیکن شاعری اپنے لیے کریں۔ سٹیج سے نیچے عوام کی سطح پر نہیں اترنا چاہیے بلکہ عوام کو اوپر اپنی سطح پر لانا چاہیے۔ اس میں وقت لگتا ہے لیکن لوگ آ جاتے ہیں۔

عطا محمد خاں، کیپٹن

س کب اور کیسے خیال آیا کہ لکھنا چاہئے؟

ج شعر کہنے میں میرے بڑے بھائی راؤ اختر علی خان (مرحوم) کا بڑا حصہ تھا۔ وہ اکثر شعر کا پہلا مصرعہ پڑھتے اور دوسرا سننے کی فرمائش کرتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ طبیعت اس طرف راغب ہوئی اور مسلسل اس بات کی تحریک ہوئی کہ شعر کہے جائیں۔ اس کے علاوہ گھر کا ماحول بھی ادبی تھا۔ گھر کی فضا میں اکثر اوقات اشعار اور مصرعے گونجتے رہتے تھے۔ ان کے بعد راؤ افتخار خان بھائی جو اس وقت میرے کافی قریب ہیں اور زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں ڈین فیکلٹی آف ایگریکلچر ہیں۔ ان کے شعری اور ادبی ذوق نے بہت متاثر کیا۔ صحیح معنوں میں سکول کے زمانے کے استاد ماسٹر غلام محمد وہ شخصیت ہیں جنہوں نے میرے شعری ذوق کی آبیاری کی۔ وہ خود بھی اچھے شاعر ہیں اور غالب کے رنگ میں غزلیں کہتے ہیں۔ ماسٹر صاحب کے ساتھ ہی ادبی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ انہی محفلوں کی وجہ سے شعر کہنے کا شوق مزید بڑھا۔ شروع میں ابتداء کے طور پر اصلاح بھی ماسٹر صاحب سے ہی لی۔

س ابتدائی زندگی کب اور کہاں کیسے گزری؟

ج 13 اکتوبر 1958ء کو عارف والا کے ایک راجپوت خاندان میں پیدا ہوا۔ والد صاحب راؤ انور علی خان محکمہ مالیات میں ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ علاقے کے ایک بااثر زمیندار بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں عام زمینداروں کے برعکس توازن اور اعتدال بہت تھا۔ والدہ بھارت کے صوبہ اتر پردیش سے ہجرت کر کے آئی تھیں۔ والدہ صاحبہ نے شروع ہی سے خوش اخلاقی اور خدا خوفی کا درس دیا۔ والد صاحب جہاں دیدہ اور سنجیدہ مزاج

بزرگ تھے۔ان کا کہنا تھا کہ اولاد کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی غذا کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔وہ اکثر گھر میں کہا کرتے تھے ''اچھا کھاؤ لیکن سادہ پہنو۔'' میرے والد میری آئیڈیل شخصیت تھے۔اگرچہ بچپن ہی سے خوش مزاج اور ماحول کو خوش گوار بنا کر رکھنے والا انسان ہوں لیکن والد کے سامنے ہمیشہ سنجیدہ رہتا تھا۔بچپن عارف والا کی گلیوں میں گزرا۔آج بھی بچپن کی یادیں صفحہ ذہن پر نقش ہیں۔عارف والا شہر اپنی ریتلی زمین اور خربوزے کے کھیتوں کے باعث پنجاب بھر میں مشہور ہے۔اسی ماحول میں بچپن اور لڑکپن گزارا۔والد صاحب صبح کی نماز کے بعد جب سیر پر جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ ان کی انگلی پکڑ کر ہرے بھرے کھیتوں میں نکلتا۔فطرت کے اس رومان پرور ماحول نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فطرت پسندی اور ماحول کی شفافیت نے میرے شاعرانہ مزاج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اپنے سکول کے زمانے کے دو استادوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ایک قاضی عبدالرحمٰن تھے جنہیں فارسی اور اردو پر خاصا عبور تھا۔ ان کی طبیعت رعب دبدبے والی تھی اور انہیں دیکھ کر ریاض خیر آبادی کا شعر یاد آتا تھا۔

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

انہوں نے ہی مجھے اردو کے ابتدائی عروض سکھائے۔دوسرے استاد ماسٹر غلام محمد صاحب تھے جن کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔پھر زندگی کے دوسرے موڑ میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے زراعت میں بی ایس سی کی ڈگری لی۔پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔مجھے شیلے اور ایلیٹ بہت پسند تھے۔

س پہلے فوج اور بعد ازاں سول بیوروکریسی ایسے عالم میں شاعری سے رغبت اور ذریعہ اظہار بنانا منفرد بات لگتی ہے یہ متضاد شعبہ جات، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج فوج اور سول بیوروکریسی نے زندگی میں نظم وضبط پیدا کرنے کا ہنر سکھایا ہے۔ شاعری سے رغبت اور اسے ذریعہ اظہار بنانا میرے اندر کے عطاء کی مجبوری تھی۔ذریعہ معاش کچھ بھی ہو مجھے شاعر ہی بننا تھا اور میں شاعر ہی بنا ہوں۔گھر کا ماحول، سکول کا زمانہ،

انگریزی ادب کا مطالعہ، ان سارے عوامل نے مجھ پر فطرت کے کئی بھید افشاء کیے ہیں۔ مثلاً دیوان غالب کئی بار پڑھا ہے اور ہر دفعہ اس میں نئی لذت اور نیا کیف پایا ہے۔ بعض اوقات تو اشعار کی نئی نئی تشریحات کھلتی ہیں۔ میر اور غالب کا عاشق ہوں، اقبال کا بھی اچھا خاصا مطالعہ کیا ہے۔ کلیات اقبال ایسی چیز نہیں کہ ایک مرتبہ پڑھ کر پھر طاق پر رکھ دی جائے۔ بلکہ یہ کتاب بار بار اور مسلسل مطالعے کے لائق ہے۔ فیض، ممتاز مفتی، مشتاق احمد یوسفی اور عطاء الحق قاسمی کو بہت پڑھا ہے۔ احمد فراز سے بہت دوستی اور تعلق خاطر رہا۔ اپنی پہلی کتاب ''سرِ زنداں'' کے کئی شعروں میں فراز کے توجہ دلانے پر ترمیم کی۔ فراز کے انتقال پر کچھ شعر بھی کہے تھے۔

زمین زادہ فلک کے سفر پہ جا نکلا
وہ ایک شعر فراز ہنر پہ جا نکلا

س اب تک کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج اب تک تین شعری مجموعے ''سرِ زنداں'' ''بساطِ خواب'' اور ''تکون'' شائع ہو چکے ہیں۔

س آپ دانش ور ہیں، بیوروکریٹ ہیں اور تخلیق کار بھی ہیں۔ آپ کے خیال میں پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کون سا ہے اور اس کا حل کیا ہے؟

ج پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ قومی یکجہتی ہے، کیا ہم ایک قوم بن سکے ہیں یا کوئی حادثہ یا واقعہ یا جنگ ہی ہمیں ایک ہجوم سے ایک قوم کی شکل دے سکتی ہے، ہاں جہاں تک ادبی مسائل کا ذکر ہے تو راستے کی رکاوٹیں ہیں۔ یہاں ذہین بہت ہیں ان کے اظہار کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ تخلیق کار بہت ہیں ان کا ہنر اجاگر ہونے میں رکاوٹیں ہیں۔ دینے والے ہاتھ بہت ہیں لیکن لینے والے ہاتھوں کے راستے میں رکاوٹیں ہیں۔ پاکستان اس اعتبار سے بہت خوش قسمت ہے کہ یہاں رفاہ عامہ، فلاح یا عام لفظوں میں خیرات کرنے کا جذبہ رکھنے والے بہت ہیں لیکن ان کی خیرات صحیح طریقے سے صحیح حقدار تک پہنچ نہیں پاتی۔

س چاند کو دیکھ کر کس کا خیال آتا ہے؟

ج چاند کو دیکھ کر چاندنی میں نہائے ہوئے ماحول کا حسن یاد آتا ہے۔ دو ہی تو چیزیں ہیں جو فطرت کے حسن کو نکھارتی ہیں۔ ایک چاند کی چاندنی اور دوسری چیز ہے صبح کا منظر۔ جوش صاحب نے کہا تھا۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

س کیا آپ اپنی شاعری کو وہ وقت دے پائے ہیں جس کی وہ متقاضی تھی؟

ج شاعری میری محبت ہے اور محبت لمحاتی احساس کا نام نہیں ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو عمر بھر لہو اور روح میں رچا بسا رہتا ہے۔

س آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

ج ارسطو نے شاعری کو تزکیہ نفس کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ ورڈزورتھ نے شاعری کو تمام علوم کی خوشبو کہا ہے۔ آرنلڈ نے شاعری کو زندگی کا ترجمان قرار دیا ہے۔ بہت سے آئمہ، اولیاء، صلحاء، علماء، فلسفیوں، منطقیوں اور عروضیوں نے شاعری کی ہے۔ وجہ یہی کہ شاعری ہر ذوق سلیم رکھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں حسیاسیت فکر کا جوہر ہے۔ آپ جب گرد و پیش کی دنیا اور خارجی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ یا پھر آپ کے اندر کی حسیاسیت حصار کر توڑ کر باہر نکلتی ہے تو وہ شعر کا روپ دھار لیتی ہے۔ نظریہ فن میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں۔ مثلاً روایت سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت، ان دیکھے حسن کی جستجو، تخیل کی فراوانی، وفور جذبات، انفرادیت، آزادی خیال، حسن سے تابہ حقدار لطف اٹھانے میں آسودگی یا نا آسودگی کا احساس، رنگوں سے مہکتا ہوا ماحول، ہجرت، یہ سب کچھ آپ کے فن کو نکھارتے ہیں۔

س شاعری کے علاوہ اگر کسی اور صنف میں لکھتے تو وہ کون سی ہوتی؟

ج شاعری کے علاوہ اگر کسی اور صنف میں لکھتا تو وہ بھی شاعری ہی ہوتی۔

س کیا پاکستانی ادب ہماری تہذیب، ثقافت اور معاشرت کا ترجمان ہے؟

ج پاکستانی ادب یقیناً ہماری تہذیب، ثقافت اور معاشرے کا ترجمان ہے۔ ہماری

شاعری، نثری ادب (خصوصاً ناول، افسانے اور ڈرامے) ہماری اپنی ہی دھرتی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہمارا شاعر اور ادیب اس دھرتی سے جڑا ہوا ہے کٹا ہوا نہیں۔

س سرکاری سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں کی اہمیت اور مقاصد کیا ہیں؟

ج سرکاری سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں کی بہت اہمیت ہے۔ پہلے نواب، روساء اور امراء شعری محفلیں منعقد کرا کے شاعروں کی مالی اعانت یا سرپرستی کرتے تھے چونکہ یہ ایک مہنگا سودا ہے اس لئے اس کے انعقاد اور فروغ کے لئے سرکاری سرپرستی ازحد ضروری ہے۔ مشاعرہ ایک تہذیبی روایت ہے اور اس روایت کو زندہ رہنا چاہئے۔ جب آپ بڑے اور اچھے شاعروں کو سنتے ہیں تو وہ لمحے آپ کی زندگی کے یادگار لمحوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے کسی بھی عام شخص کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ فرداً فرداً شاعروں سے مل سکے۔ لیکن محفل مشاعرہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس سے ہر ادبی ذوق رکھنے والے عام شخص استفادہ کرسکتا ہے۔

س کیا آپ ادب میں تنقید کی اہمیت کے قائل ہیں؟

ج تنقید نکھارتی ہے۔ اسی لئے ہر عہد میں ادبی تنقید کے نئے معیار اور زاویے تراشے جاتے ہیں۔

س اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ قارئین سے شیئر کیجئے۔

ج واقعہ تو ایک لمبی کہانی ہے مگر مختصراً یہ کہ مجھے 1994ء میں کچھ دہشت گرد اغوا کر کے افغانستان لے گئے اور تقریباً پانچ ماہ ان کی سخت ترین قید میں رہا۔ اس دوران جو زندگی اور موت سے متعلق دریچے وا ہوئے وہ میں نے ''سرِ زنداں'' میں رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی دوران مجھے ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' کا مفہوم بھی سمجھ میں آیا۔

س قارئین کے لئے کوئی پیغام؟

ج پیغام صرف اور صرف یہ ہے کہ برداشت اور تحمل کا مادہ پیدا کریں اور دوسروں کو آسانیاں تقسیم کریں۔

غلام حسین ساجد

س سب سے پہلے اپنے ادبی و سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے؟

ج میرا تعلق میاں چنوں کی نواحی آبادی ''بستی کبیر ستپال'' سے ہے۔ میں ستپال ہوں جو سیال راجپوتوں کی ایک شاخ ہے اور گنجی بار کے اس حصے میں صدیوں سے آباد ہے۔ خانقاہی تاریخ سے متعلق لوگ جانتے ہیں کہ خود حضرت میاں چنوں کی نسبت اسی قبیلے سے ہے۔ یہ لوگ زمیندار اور زراعت سے متعلق ہیں اور تعلیم و تعلم سے انہیں کبھی علاقہ نہیں رہا۔ ان کے مزاج پر قبائلی روایت کا غلبہ تھا اور ہے۔ میں مذکورہ بستی میں یکم دسمبر 1951ء کو مہر سجاول کے گھر پیدا ہوا۔ میری ماں کی خواہش اپنی اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی تھی۔ سو میں نے نواحی گاؤں جراحی اور پکا حاجی مجید میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایم سی ہائی سکول میاں چنوں سے میٹرک، گورنمنٹ کالج ساہیوال سے انٹر، اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے ڈگری اور یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے پنجابی اور اردو کیے۔ ادبی پس منظر کی حیثیت خود ملکفی ہے۔ ادبی ذوق کی بنیاد مطالعہ تھی اور رہنما ادبی کتب۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج عملی زندگی کا آغاز لاہور سے اپریل 1978ء میں ہوا۔ جب میں پنجاب پبلک سروس کمیشن سے ریسرچ ایسوسی ایٹ منتخب ہونے کے بعد مرکز تحقیق و ترقی نصاب میں تعینات کیا گیا۔ یہاں معروف نقاد اور شاعر صدیق کلیم جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہے تھے، ڈائریکٹر تھے۔ میرے مشفق و مہربان رہنما ہوئے اور مجھے عالمی ادب کے مطالعے کی راہ پر لگایا۔ اس سے کئی برس پہلے میں جناب محمد سلیم الرحمن، انجم حسین سید، جناب

علی عباس جلال پوری، جناب احمد ندیم قاسمی اور کئی اور معروف لکھنے والوں کے حلقہ ارادت میں داخل ہو چکا تھا۔ سولا ہور میں تعیناتی نے میرے ذوق ادب کو مہمیز کیا۔

س ادب سے شوق کی ابتدا؟

ج اس کے لئے کسی خاص عمر یا مدت کا تعین کرنا مشکل ہے۔ میں ابھی تیسری جماعت میں تھا کہ میرے باپ کے رسوخ کے باعث مجھے سکول میں موجود کتابوں کے مقفل صندوق کو کھلوانے کی سہولت مل گئی تھی۔ پھر شہر آنے پر آنہ لائبریریوں سے کتابیں لے کر پڑھنے اور خود خرید کر پڑھنے میں بھی کوئی دقت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک میں نسیم حجازی، صادق حسین سردھنوی اور رئیس احمد جعفری سے آغاز کر کے کرشن چندر، منٹو اور بیدی تک پہنچ گیا تھا۔ شاعری کا مطالعہ کالج میں آنے کے بعد آغاز کیا۔ مگر اپنا پہلا شعر غالباً میں نے تیرہ برس کی عمر میں کہا تھا اور اسے صحن کی کچی زمین پر اپنی انگلی سے نقش کیا تھا۔ کیوں کہ وہ رات تھی اور مدھم چاندنی میں بس مجھے یہی قرطاس دستیاب تھا۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج میں اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں میں ایک جیسی سہولت سے لکھتا ہوں۔ اردو کے نو (''موسم'' ''عناصر'' ''کتاب صبح'' ''آئندہ'' ''معاملہ'' ''روداد'' ''نیند میں چلتے ہوئے'' ''چہار دریا'' اور ''اعادہ'' پنجابی کے ساتھ ''دنیا پھرے غمازی'' ''پانی رمز بھرے'' ''بیلے وچ چڑیاں'' ''سرسوتی توں راوی تائیں بانے'' ''کسے سفنے دے نال'' اور ''مونجھ وسارے محل'' شعری مجموعوں کے علاوہ ''مہاندر'' (خاکے) ''نیندر بھنی رات'' (کہانیاں) اور تائید (تنقید) میری طبع زاد کتابیں ہیں۔ چار مرتب کتابیں ''نئی پاکستانی نظم، نئے دستخط'' (دہلی، بھارت / لاہور پاکستان) اور ''اردو شاعری کلاسیکی عہد میں'' ''اردو ادب بیسویں صدی میں'' ان کے علاوہ ہیں اور الحمد اللہ تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں، شاعر بھی۔ شاعری زیادہ مرغوب یا نثر؟

ج عامر صاحب! نثر ہو یا نظم یہ دونوں اظہار کے وسیلے ہیں اور موضوع ہی اپنے لئے

ہیئت اور اظہار کے سانچے کا انتخاب کرتا ہے۔ میرے نزدیک لکھنے والوں کی حیثیت معمول سے زیادہ کی نہیں۔ غزل، نظم، افسانہ یا کوئی اور صنف محض موضوع کو ایک بصری جامہ دینے کا وسیلہ ہے۔ اس لئے مجھے نثر اور نظم یکساں مرغوب ہیں کہ میرے کل کا اظہار کسی ایک اظہاری سانچے پر قانع ہو کر تکمیل پا ہی نہیں سکتا۔ بس میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ نثر ہو یا نظم، اسے زیادہ سے زیادہ بلیغ اور بامعنی بنا سکوں اور اپنے باطنی احساس کو ضعف پہنچائے بغیر قاری تک منتقل کر سکوں۔

س الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟ آپ کی رائے؟

ج یہ دوری عارضی اور غیر حقیقی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ترقی پسند ممالک میں کتاب کے سلسلے میں الیکٹرانک میڈیا پر انحصار کم ہو رہا ہے اور اگر نہ بھی ہو تو اس سے ادب کے قاری میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ کیوں کہ میڈیا کی اس نوع کی رسائی آپ کی خلوت میں آپ کے حجرے اور آرام گاہ کی تاریکی تک ہونے پر بھی، کتاب کی ضرورت، اس کی افادیت، ہمہ گیری اور قرب اور دوری میں کسی مصنوعی وسیلے سے آزاد رفاقت کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہے گی۔

س آپ نے کبھی اپنی ادبی پروجیکشن کے لئے کچھ نہیں کیا۔ الیکٹرانک میڈیا کے مشاعرے ہوں یا بین الاقوامی مشاعرے۔ آپ مدعو ہونے کے باوجود شریک نہیں ہوتے۔ اس بے نیازی کی وجہ؟

ج صاحب اس میں زیادہ ہاتھ میری کاہلی کا ہے، جو اب آہستہ آہستہ "سو کالڈ بے نیازی" بن گئی ہے۔ یوں بھی میں مشاعرے کا آدمی نہیں اور ادب کے معاملے میں خوشامد اور رواداری سے کام لینا بھی میرے بس سے باہر ہے۔ سو اپنے حال میں مست رہنے میں عافیت جانتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ آخری فیصلہ کام اور آپ کی تخلیق کے معیار پر منحصر ہے۔ ہزاروں معروف اور محبوب لکھنے والے آج ذہن پر زور دے کر بھی یاد نہیں آتے کہ ان

کے کام کی نوعیت ہنگامی اور عارضی تھی۔ میرے خیال میں لکھنے والے کو اپنی ذات اور تخلیقی بصیرت پر اعتماد کرنا چاہئے اور میں ایسا ہی کچھ کرنے کی سعی کرتا ہوں۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیقیت کی کئی پرتیں ہیں۔ یہ مستقبل بینی بھی ہے اور گزرے وقت کے اسرار کی طلسمی بازیافت بھی۔ زندگی اور وقت کی بوقلمونی کا اظہار بھی اور وجود اور لاوجود کی حقانیت کا ظہور بھی۔ یہ موجود اور غیر موجود کے ہونے اور اس سے تعلق اور عدم تعلق کی شگفت بھی ہے اور فکر اور خیال کی ندرت کا مرکزہ بھی اور ایک اچھے تخلیق کار کا کام اس شعلہ مستعجل کو اس کی تمام تر صباحت کے ساتھ دوام دینا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر بڑے اور اچھے تخلیق کار کے یہاں وقت ایک حرکی قوت بن کر ظاہر ہوتا ہے اور تجربہ ایک مثالی منظر بن کر ٹھہر نہیں جاتا بلکہ ہمیشہ فعال اور تازہ رہتا ہے۔ سو میرے نزدیک ایک اچھا تخلیق کار وہ ہے جو اپنی تخلیق میں دوامی جہت پیدا کرنے پر قاصر ہو اور اس کی تخلیق زمانی شکنجے سے آزاد اور خودرو ہو۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج ایسے کسی لمحے کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ پہلے شعر کی تخلیق کا لمحہ، پہلی کتاب کی اشاعت، پہلی تخلیق کی اشاعت، پہلے بچے کی پیدائش، اپنے بیٹے کے یہاں پہلی اولاد کی پیدائش، پہلے وصل اور پہلے ہجر کی آزمائش۔ غرض سینکڑوں لمحے ہیں جو اہم بھی ہیں اور یادگار بھی۔ یوں کہئے کہ مجموعی طور پر میں آسودگی اور شکر سے بھرا ہوا آدمی ہوں اور اس پر خالق کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جارہا ہے۔ کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج مشاعروں کی تہذیب کے بارے میں اقبال نے کم و بیش ایک صدی پیشتر فرمایا تھا ''اردو شاعری کو جو نقصان مشاعروں نے پہنچایا ہے کسی اور نے نہیں پہنچایا'' اور اس کی توضیح یہ ہے کہ مشاعرہ میں سنائی جانے والی شاعری مشاعرے کے سامعین کے ذوق کی تسکین اور

فہم کی سطح سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ آج کے عہد میں یہ سطح اور بھی نیچے آ گئی ہے اور اس کا سبب مشاعروں کے منتظمین ہیں جو ذوقِ شعری کی پرداخت سے زیادہ سامعین کی انٹرٹینمنٹ کو اہم جاننے لگے ہیں اور بدذوقی اور پھکڑپن کی سطح پر کی جانے والی شاعری کو مشاعرے کی کامیابی کا سبب جاننے لگے ہیں۔ آج سے نصف صدی قبل مشاعرے میں مزاحیہ کلام کا سنایا جانا بدذوقی کی علامت تھا اور الگ مزاحیہ مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے۔ مگر اب انہیں مشاعرے کی کامیابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ ''ابا، ڈبا اور ببا'' کی سطح کا پھکڑپن ہی کیوں نہ ہو۔ ذاتی طور پر میں مشاعرے کے کلچر ہی کا قائل نہیں اور آج کل برپا ہونے والے مشاعروں کو محض ایک ''ثقافتی شو'' جانتا ہوں۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ہوتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

ج دونوں سے۔ ادب کسی نہ کسی سطح پر اپنے عہد اور سماج سے جڑا ہوتا ہے۔ میں نے اکادمی ادبیات پاکستان کے ایک مذاکرے میں ''پاکستانی ادب'' کی تعریف کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ ''پاکستانی ادب وہ ہے جو کسی بھی زبان میں پاکستان کی حدود میں لکھا جا رہا ہے اس لئے کہ لکھنے کی تحریک باطنی ہو تب بھی اس کی نسبت بیرون سے ہوتی ہے اور اس مٹی اور معاشرے سے، جس پر اور جس میں آپ موجود ہیں۔ یہ ادب زمینی رشتوں کی دین ہے۔ مگر آپ اظہار کے لمحے سے اس رشتے سے آزاد یا ماورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دائمی حقیقتوں کا ظہور ہمیشہ زمینی صداقتوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ سو بڑے ادب میں ظاہر اور باطن کا ادغام لازمی ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج بہت اہم اور کارگر۔ بشرطیکہ سوشل میڈیا ادب کے فروغ میں واقعی اپنا کردار سنجیدگی سے ادا کرے۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنی رسائی اور اثر کے لحاظ سے سوشل میڈیا کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور یہ ادب کی ترویج میں بے حد معاون اور فعال کردار ادا کر سکتا ہے۔ مگر اس کے

لئے ہمیں اپنی فکر اور ترجیحات کو بدلنا ہوگا اور یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم اپنے معاشرے کو کس سمت میں لے جانا چاہتے ہیں اور اس تبدیلی میں ادب کا کردار کیا ہونا چاہئے؟

س: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج: بڑی حد تک...... ادیب کی انفرادیت، اس کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے تخلیقی اظہار سے ظہور کرتی ہے۔ اس لئے تخلیق کسی بھی شخص کی ذات کا آئینہ ہوتی ہے۔ خصوصی شعری روایت میں ندرت کا بیج ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہی پھوٹتا ہے۔

س: کیا کھویا، کیا پایا؟

ج: کسی شاعر نے کہا تھا:

قطرہ دریا ہے، اگر اپنی حقیقت سمجھے
کھوئے جاتے ہیں جو ہم آپ کو پا جاتے ہیں

میں نے بھی اپنے آپ کو کھو کر اپنے آپ کو پایا اور اس پر اپنے خالق کا بے حد شکر گزار ہوں۔

فرحت پروین

س سب سے پہلے اپنے سوانحی وادبی پس منظر سے آگاہی دیجئے؟

ج بات تو تھوڑی عجیب ہے مگر مجھے کبھی بھی آباؤ اجداد کے دولت وثروت کے قصوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ ابا جی کبھی ذکر کرتے تو میں منہ چڑھی تو تھی ہی۔ صاف کہہ دیتی ''ابا جی مجھے پدرم سلطان بود سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' اب سوچتی ہوں تو دکھ ہوتا ہے کہ یہ تو گستاخی اور دل شکنی تھی۔ نوعمری میں اپنی شخصیت کا کچھ زیادہ ہی احساس ہوتا ہے۔ طارق بٹ نے کیا خوب کہا ہے

اپنے ماضی کا کوئی نقش سنبھالے رکھنا
کون تھے کیا تھے بتانا کہیں پڑ جاتا ہے

سوائے چند لائنوں میں سمیٹنے کی کوشش کروں گی۔ میرے خیال کے مطابق اگر کسی قلمکار کے سوانحی پس منظر میں شعروادب کی کوئی وراثت نہیں تو وہ اتنا اہم نہیں۔ مگر آپ کا کہنا ہے کہ قارئین کو اس میں دلچسپی ہوتی ہے۔ سو میرے آباؤ اجداد سرائے نورنگ ضلع بنوں سے تعلق رکھتے تھے۔ گھر میں بول چال کی زبان پشتو تھی۔ ہمارے پردادا خان بہادر سلطان محمود خان رئیس اور جاگیردار تھے جن کی حویلی پر سواری کے لئے گھوڑوں کے علاوہ ہاتھی بھی جھومتے تھے۔

پھر ہمارے دادا خدا بخش خان اپنے دور پار کے رشتہ داروں کو ملنے بھکر آئے جو اس وقت ایک پسماندہ قصبہ تھا۔ یہاں ایک چھوٹی ذات کی لڑکی کے حسن کی چکا چوند نے دیوانہ کردیا۔ جانتے تھے نہ والد سے اجازت ملے گی اور نہ منگیتر کے خاندان والے زندہ چھوڑیں

گے۔ سو اس سے شادی رچا کر بھکر میں ہی مستقل اقامت پذیر ہو گئے کہ واپسی کے راستے انہوں نے خود ہی بند کر دیئے تھے۔ پولیس میں ملازمت کر لی۔ تھانیدار ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھکر سے پہلی ٹرانسپورٹ کمپنی کی داغ بیل ڈالی۔ ''خان ٹرانسپورٹ کے نام سے'' دادا کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اباجی سب سے چھوٹے تھے۔ یوں تو میں نے اباجی کو علاوہ ڈائری لکھنے کے کچھ خاص لکھتے نہیں دیکھا۔ مگر کسی بچے کی پیدائش، سالگرہ اور شادی کے موقعے پر منظوم مبارک باد لکھتے تھے۔ گلا بھی خوب پایا تھا جب ترنم سے پڑھتے تو رنگ جما دیتے۔ ایک دو موقعوں پر ترنم سے ایک دو غزلیں بھی سنائیں خدا جانے ان کی اپنی تھیں یا کسی کی۔

ننھیال کا گھرانا بہت پڑھا لکھا اور معزز تھا۔ پاس پڑوس کی بچیاں نانی سے قرآن پاک پڑھنے آتیں۔ دونوں ٹائم بہت بڑا اسکول لگتا۔ یہ لوگ ترقی یافتہ ذہن رکھتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر اور سرجن بھی تھے۔ خود میرے نانا بہت مشہور دندان ساز تھے، خواتین بھی پڑھی لکھی تھیں۔ بھکر میں لڑکیوں کا پہلا سکول میرے نانا نے اپنے گھر کے ایک حصے میں بنایا تھا جس میں ان کی گھر کی خواتین باضابطہ سکول چلاتی تھیں۔ گھر کی فضا مکمل دینی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ استاد خانہ تھا پورے قصبے میں بہت عزت تھی۔ نانی تو گویا وہاں کی جج تھیں۔ سارے جھگڑے ان کے گھر چکتے تھے اور کوئی ان کے فیصلوں سے انحراف نہیں کرتا تھا۔ ان سب مشاغل کے علاوہ میں نے کسی کو شعر و ادب کی کتابیں پڑھتے نہیں دیکھا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ توبتہ النصوح، قصہ چہار درویش، باغ و بہار، قصہ گل بکاؤلی، داستان امیر حمزہ اور گل پہ صنوبر چہ کرد جیسی کتابیں نانی کی قرآن شریف والی الماری سے ملیں۔ کوئی تو پڑھتا ہوگا۔ کبھی۔

س ادب سے شوق کی ابتدا؟

ج یہ تو طے ہے کہ مجھے ادب سے لگاؤ ماحول یا وراثت سے نہیں ملا۔ یہ تو قسام ازل نے یوم الست ہی میرے خمیر میں گوندھ دیا تھا۔ میرا بچپن تو لاہور ہی میں گزرا۔ پھر بوجوہ جب میں پانچوں جماعت میں پڑھتی تھی، ہم بھکر منتقل ہو گئے۔ جس کا خسارہ سب سے زیادہ مجھے ہوا کہ مجھے میری طلب اور پیاس کی نسبت بہت کم کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ سو میں نے

اچھا برا جو ملا کچھ نہ چھوڑا۔ سکول کی لائبریری میں کتابیں بہت زیادہ نہیں تھیں۔ چھوٹا اور پسماندہ شہر تھا شاید اس لئے۔ پہلے تو لائبریرین مجھے کتابیں دینے پر راضی نہ تھی لیکن جب میں پڑھ کر جلدی جلدی لوٹانے لگی تو پھر وہ دینے لگ گئی۔ سچ پوچھیں تو مجھے کورس کی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر ذہن اچھا تھا۔ کلاس میں پوری توجہ سے ٹیچر کا پڑھایا ہوا سن اور سمجھ لیتی۔ یہی میرے لئے کافی ہو جاتا۔ ہوم ورک کبھی نہیں کرتی تھی کہ وہ وقت مجھے غیر نصابی کتابیں پڑھنے کے لئے درکار ہوتا تھا۔ سو سارا سال ٹیچر کی ڈانٹ چکنے گھڑے کی طرح سن لیتی۔ مگر ہمیشہ فرسٹ آتی۔ جتنا بھی پڑھا اعزاز کے ساتھ پانچویں کلاس سے وظیفہ ملا اور بی اے تک یہ سلسلہ بغیر کسی لمبی چوڑی مشقت کے چلتا رہا۔ ہاں ایم اے میں یہ اعزاز قائم نہ رکھ پائی کہ اب زندگی میں بہت مسائل تھے۔ گھر بار، بال بچے وغیرہ تو بات ہو رہی تھی میرے ادب کے شوق کی ابتدا کی۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ یہ میری مٹی میں گندھا ہوا تھا۔ مطالعے نے اسے صیقل کیا اور کتابیں میری زندگی کی ساتھی بن گئیں۔ البتہ مجھے کچھ لکھنے کی تحریک محسوس نہ ہوئی۔ ہاں کلاس میں میرے مضامین سب سے اچھے ہوتے تھے۔ سکول کے فنکشنز میں ایک دو مزاحیہ قوالیاں بھی لکھیں۔ شہر سے باہر ڈبیٹ پر جانے والی لڑکیوں کو تقاریر ہمیشہ میں لکھ کر دیتی تھی۔ ایک دو بار ٹیچرز پر بھی مرزا رفیع سودا کی طرز پر نظمیں بھی کہیں اور اپنی کلاس کو سنا کر داد پائی۔

خود میں بہت شرمیلی تھی۔ سو نہ مباحثوں میں حصہ لیا اور نہ ڈراموں میں جس پر کئی بار ٹیچرز کی شدید ناراضگی اور سزا بھی برداشت کی مگر اپنے خول سے باہر نہ آئی۔

پڑھنے کا مجھے بے انتہا شوق ہے۔ اب جبکہ میں کئی کتابوں کی مصنفہ ہوں اگر مجھ سے کہا جائے کہ پڑھنے اور لکھنے میں سے ایک چیز چن لو تو میں ایک سیکنڈ بھی سوچے بغیر مطالعہ چنوں گی۔

میری اپنی ایک دنیا ہے جس کے آفاق بہت وسیع ہیں۔

تھوڑے سے دیوانے ہیں ہم، لوگ بھی سچ ہی کہتے ہیں
دل میں ہمارے اک دنیا ہے جس کے اندر رہتے ہیں

تو کم لفظوں میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ میں ایک خودرو پودا ہوں جس کی آبیاری قدرت کرتی رہی اور یہ پودا بڑھتا پھیلتا رہا اور جب یہ پودا گھنگھنا کر خوب پھل پھول گیا تو ایک صاحب نظر باغبان کی اس پر نظر پڑی۔ اس نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ صاحب نظر پارکھ باغبان احمد ندیم قاسمی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے۔

اردو کی محبت تو میرے خون میں گردش کرتی تھی۔ امریکہ کے دوران قیام اپنے بچوں کی وجہ سے کالجوں یونیورسٹیوں سے رابطہ رہتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا کہ نئی نسل کے لوگ صرف انگلش بولتے تھے۔ گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی۔ لگتا تھا کہ وہ اردو کو اور اپنی مادری زبانوں کو بھی مکمل طور پر بھلا دیں گے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا تھا اور پھر میں نے صرف افسوس کرنے کے بجائے عملی طور پر کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ میں اب کوئی شرمیلی لڑکی نہیں چار بچوں کی ماں تھی۔ کتابوں کی سنگت نے مجھے اعتماد کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ میں نے طالب علموں کو ترغیب دلانے کے لئے ابتدا یونیورسٹی میں ورائٹی پروگراموں سے کی جو اردو میں ہوتے تھے اور پھر "فیض نائٹ" جیسا دھانسو پروگرام کیا کہ امریکن پروفیسروں نے بھی شرکت کی اور ہماری شاعری سے متعارف ہو کر بڑی حیرت سے یہ الفاظ کہے کہ ہمیں ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے ملک، تمہاری زبان میں بھی اس معیار کی شاعری موجود ہے اور پھر یہ پروگرام یو این کے کلچرل پروگرام کے لئے منتخب کیا گیا۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ امریکن پروفیسروں کو اتنی اچھی طرح اردو شاعری کیسے سمجھ میں آ گئی تو میں بتاتی چلوں کہ ہم نے ان نظموں کا انتخاب کیا جن کے انگلش تراجم موجود تھے۔ ایک پاکستانی لڑکا اردو میں نظم پڑھتا تھا پھر سپاٹ لائٹ سٹیج پر پہلے سے موجود امریکن لڑکے پر چلی جاتی اور وہ اسی نظم کی انگلش ٹرانسلیشن پڑھ دیتا۔ شاعری پڑھنے والے سب لڑکے لڑکیوں کو شلوار قمیض میں نے مہیا کی تھیں۔ اتنے پیارے لگ رہے تھے کہ کیا بتاؤں۔ پھر اسی طرح مشاعرے بھی ہوئے اور آخر کار میں نے اردو سوسائٹی بنانے کی ٹھان لی۔ اس کی پہلی میٹنگ اپنے گھر رکھی۔ اچھے اچھے کھانوں کا لالچ دے کر کہا کہ کچھ لکھ کر بھی لانا۔ کچھ بھی جیسے آج کیا کیا؟ تا کہ وہ لکھنا بھی نہ بھولیں۔ لاڈلے منہ چڑھے بچے تھے

بولے۔ ''آپ بھی لکھ رکھئے گا آنٹی''

اس وقت تک میں مصنفہ نہیں تھی۔

خیر وہ آئے کھانا بھی ہوا، میٹنگ بھی...... سب نے اپنا اپنا لکھا سنایا۔ اب میری باری تھی۔ میں گھر کے کاموں میں مصروف ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں لکھ سکی تھی۔ ان کو ترغیب دلانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ وہ بضد تھے کہ میں اپنا لکھا سناؤں اور پھر میں نے ایک کاپی اٹھا کر اسے کھول کر زبانی ہی وہ واقعہ سنا دیا جو دو دن پہلے میرے گھر پر ہوا تھا۔ بچوں نے ایئرگن سے ایک ''سکنک'' کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ سکنک مرا تو نہیں بھاگ گیا مگر ایسی ناقابل بیان یادداشت چھوڑ گیا کہ بیان سے باہر ہے۔ دوسرے دن میں نے اس واقعے کو لکھ لیا۔ جب اسے پڑھا تو لگا کہ اس تحریر میں جان ہے۔ پاکستان فون کر کے پوچھا کہ پاکستان میں سب سے اچھا ادبی پرچہ کون سا ہے؟ تو جواب ملا ''فنون'' جسے احمد ندیم قاسمی نکالتے ہیں مگر وہ صرف اے کلاس رائٹر کو چھاپتے ہیں۔

لاکھ لاپرواہی ہو مگر کچھ نہ کچھ خود آگہی تو ہوتی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ''میں نے صرف پرچے کا نام پوچھا ہے وہ کون سی کلاس کو چھاپتے ہیں یہ نہیں پوچھا'' اور فون بند کر دیا۔ پھر میں نے اپنی وہی پہلی تحریر احمد ندیم قاسمی کو بھیج دی۔ چار لائنوں کے نوٹ کے ساتھ کہ ''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے یا میں اپنا وقت ضائع نہ کروں۔''

جواب میں ان کا چار صفحے کا خط آیا۔ جس میں انہوں نے بہت تعریفوں کے بعد لکھا کہ یہ افسانہ تو عالمی مقابلے میں رکھنے کے قابل ہے۔

جب میں پاکستان پہنچی تو میرا پہلا افسانہ ''سکنک'' کے نام سے فنون کی زینت بن چکا تھا اور جناب احمد ندیم قاسمی ''ادب دوست'' میں میرے فن کی تعریف میں مضمون بھی لکھ چکے تھے۔ اگر وہ صاحب نظر سچا پارکھ میری حقیر کاوش کو وقار نہ بخشتا تو آج میں افسانہ نگار نہ ہوتی۔ میری زندگی کے ہر لمحے پر ان کا قرض ہے۔

گرینڈ انٹری کا تو ذکر ہو گیا۔ اب تصانیف کا بتا دوں۔

اب تک میری جو کتابیں آچکی ہیں۔ان میں پانچ افسانوں کی ہیں کیونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔ 1: منجمد 2: ریستوران کی کھڑکی سے 3: کانچ کی چٹان 4: صندل کا جنگل 5: بزم شیشہ گراں 6: (عالمی ادب سے کلاسیکس کے تراجم) خواب زمستاں اور ایک امریکن مصنفہ کا ناول سائنس فکشن 7: دی گور 8: (نظموں کا ایک مجموعہ) گفتم۔کل آٹھ کتابیں ہیں۔

اور ایک طویل تاخیر کے بعد اب ایک ساتھ تین کتابیں آ رہی ہیں۔ان میں ایک غزلوں کا مجموعہ، ایک افسانوں کا اور ایک فری تھاٹس کا۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں شاعرہ بھی۔شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نہیں؟

ج میرے خیال میں شاعری اظہار کا سب سے خوبصورت ذریعہ ہے۔شاعر ایک شعر میں جو بات کہہ جاتا ہے۔نثر میں اس کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔اختصار کا یہ حسن اس کی تاخیر اور معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

جہاں تک میرا معاملہ ہے وہ یہ ہے کہ افسانہ میں لکھتی ہوں اور شاعری مجھ سے سرزد ہو جاتی ہے۔اکثر دفعتاً آن وارد ہوتی ہے۔غالباً لاشعور میں بھٹکتے ہوئے خیالات صورت پذیر ہو کر قلم کی نوک پر آ جاتے ہیں۔

ویسے تو افسانوں کا بھی یہی قصہ ہے۔میرا کہنا ہے کہ کہانیاں میں نہیں لکھتی۔کہانیاں خود کو مجھ سے لکھواتی ہیں۔وہ اپنا اسلوب لفظیات اور موضوع سب کچھ خود لے کر آتی ہیں اور سامنے بیٹھ کر لکھوا لیتی ہے۔یہ اور بات ہے کہ میرے قلم تک پہنچنے سے پہلے میرے ذہن میں شعور، لاشعور اور خارجی واقعات کے ساتھ مل کر کئی کئی دن تک محفلیں سجاتی اور صلاح مشورے کرتی رہتی ہیں اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ڈھیروں ڈھیر رنگ برنگی کہانیوں کے گرد مڑھا ہوا خول ہوں اور اگر میرے اندر سے ساری کہانیاں نکال لی جائیں تو میں piniyata پنیاٹا کی طرح صرف ایک کھڑکھڑاتا خول رہ جاؤں گی۔

پڑھنے کا مجھے ہوکا ہے۔امریکہ کے مستقل قیام کے دنوں میں ساتھ لے کر گئی ہوئی

کتابیں کم پڑ جاتیں تو میں نے انگلش لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا۔ یوں تو وہ جرمن فرنچ اور دوسری زبانوں کا ہوتا تھا مگر میں ان سب کی انگلش ٹرانسلیشن ہی پڑھتی تھی۔ کچھ کہانیاں مجھے بے انتہا پسند آئیں تو میں نے ان کا اردو ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ میرا دل چاہتا تھا کہ یہ نفیس ادب پاکستان میں بھی لوگ پڑھیں۔ ان کلاسیکس شارٹ سٹوریز کے تراجم ''خواب زمستان'' کے نام سے چھپے اور ایک امریکن رائٹر کا سائنس فکشن بھی ترجمہ کیا۔

اور اب میں اردو ادب میں ایک نئی صنف کو متعارف کرانے والی ہوں۔ پچیس برس پہلے کے ڈیپریشن کی کیفیت میں لکھے ہوئے ان فری تھاٹس یا خیال کی آزاد رو کو میں نے چھپوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ سوچا اتنی ساری کاپیاں بھری پڑی ہیں کچھ غزلیں بھی منتخب کر کے چھپوالوں اور نظموں کا مجموعہ تو آ ہی چکا ہے۔

س الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے؟

ج بے شک الیکٹرانک میڈیا پر بھی بہت کچھ جاننے اور پڑھنے کو مل جاتا ہے اور یہ ایک اضافی سہولت ہے۔ مگر مجھے اس سے اختلاف ہے کہ اس کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک جہاں الیکٹرانک میڈیا اپنے عروج پر ہے وہاں کتابوں سے وابستگی کا یہ عالم ہے کہ ایئر پورٹ لاؤنج میں لوکل ٹرین میں اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں کتابیں ہوتی ہیں۔ طویل سفروں میں تو اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ چھپے ہوئے لفظ کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ فرعونوں کے زمانے کا ایک درخت کے تنے پر لکھا ہوا قول ہے جو زبانیں ڈی کوڈ ہونے کے بعد پڑھا گیا اور جو آج تک موجود ہے۔ جس پر لکھا ہوا ہے کہ ''اگر آپ کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہیں اور آپ پر سایہ نہیں ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ وقت اب آپ کا نہیں رہا۔'' ابھی ہم الیکٹرانک میڈیا کے عبوری دور میں ہیں سو زیادہ متاثر اور مشتاق ہیں۔ جب اس کے عادی ہو جائیں گے تو کتاب کی قدر و قیمت کے پھر سے قائل ہو جائیں گے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیق ایک الوہی صفت ہے اور خالق کائنات اپنی عنایت خاص سے کچھ لوگوں کو

اس صنف سے متصف کر دیتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا شخص عالم ہو سکتا ہے، کالم نگار اور صحافی ہو سکتا ہے مگر تخلیق کار نہیں، مصنف نہیں۔

ایک اچھا تخلیق کار وہ ہوتا ہے جو اپنے اندر کی تحریک کے ساتھ مطالعہ اور مشاہدہ بھی شامل کرتا ہے، اس چیز کا انتخاب کرتا ہے وہ اس کے نقطہ نظر سے مماثل ہوں۔ ایک ہی واقعہ اگر ایک صحافی، ایک کالم نگار اور ایک مصنف دیکھ رہے ہوں تو تینوں اپنے اپنے انداز اور اپنی فکر کے مطابق قلمبند کریں گے جو ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے:

تخلیقیت کی صفت مصنف کو ان سب سے ممتاز کرتی ہے۔ اب یہاں ایک اور بات بھی ہے کہ اس الوہی صفت کو کون کتنا صیقل کرتا ہے۔ کون اسے مطالعے سے دقیع بناتا ہے، کون اپنے زاویہ نگاہ کو اس طرح احاطہ تحریر میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اس کی بات نہ صرف لوگوں کے دلوں میں اتر جائے بلکہ فکر کے نئے باب بھی وا کرے اور اس کی تو کوئی حد ہی نہیں۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیق سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟۔

ج الاسکا کے کروز میں جب ہم گلیشیئر کے اوپر ہیلی کاپٹر کے ذریعے اترے۔ وہ ایک طلسماتی لمحہ تھا۔ جب میں اپنے وجود سے نکل کر فضا کے تحیر میں گم تھی۔ تلوؤں میں کیل لگے بھاری بوٹوں کو دھیرے دھیرے قدم جما کر چلتے ہوئے اپنے بدن کے اندر میں نہیں تھی۔ نیلا آسمان، ہلکی نیلی برف اور فضا میں تیرتا ہوا ایک ترار، ایک جادو۔ لگتا تھا مادی زندگی مادی دنیا کا تعلق کسی اور جہان سے ہے۔ بس ایک سکون کا احساس تھا۔ سرگوشیاں کرتی خاموشی تھی جو میری روح سے ہم کلام تھی۔ کیا راز بے پایاں راز و نیاز ہوئے ان کے درمیان، گرم کپڑوں میں لپٹا بھاری بوٹ پہنے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا میرا مادی وجود اس سے بالکل بے خبر تھا۔ کب اور کس طرح میں واپس ہیلی کاپٹر کے اندر پہنچی۔ کب لینڈ کیا کچھ احساس نہیں۔ جب مجھ سے جوتے واپس کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو میں اس دنیا میں واپس لوٹ آئی۔ ایک دکھ سا تھا کہ پھر وہی دنیا......!!

میرے خیال میں یہ آسودہ ترین وقت تھا۔ دونوں سطحوں پر تھا۔ تخلیق بھی اور زندگی کی بھی۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جارہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج اگرچہ یہ ایک متنازعہ سوال ہے مگر میں اس کا جواب دوں گی۔ اس میں تو زیادہ سوچنے والی بات ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے آرگنائزرز جو یہ محفلیں برپا کرتے ہیں تو شرکاء کو اکثر ان کے ادبی یعنی شعری قد کاٹھ کے مطابق مدعو کرنے کے بجائے ذاتی پسند ناپسند اور سفارشوں کی بنا پر ہوتا ہے، کیونکہ بالمشافہ پبلک کے سامنے آنے اور شہرت پانے کا سب سے موثر طریقہ ہے۔ سو معیار تو وہ نہیں رہتا جو کہ شعر وسخن کی تہذیب لئے ہو۔ اگر اس پر توجہ دی جائے تو معیاری مشاعرے ہو سکتے ہیں اور خوب سے خوب تر کہنے کی تحریک ہو سکتی ہے۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے۔ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج معاشرے اور اندرون دونوں سے، جیسے دائیں اور بائیں ہاتھ کی مشترکہ حرکت سے کوئی فعل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بالکل ویسے ہی معاشرے کی ابتری یا بہتری کی وجہ سے جو حالات وواقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ تخلیق کار کے باطن کو تحریک دیتے ہیں۔ عموماً معاشی ناہمواریاں، ناانصافیاں، ظلم وجبر، مظلوم ومقہور طبقے کی تکالیف ومصیبتیں تخلیق کار کے حساس دل کو بے چین کر دیتی ہیں اور اس کا قلم یہ سب کچھ سامنے لانے اور مراعات یافتہ طبقے کو آئینہ دکھانے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔

اصلی، حقیقی تخلیق کار حساس، نرم دل اور حق کا حمایتی ہوتا ہے اور دنیا میں جو تبدیلی اس کے امکان میں ہوتی ہے، لانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے لئے اس کا سب سے موثر ہتھیار اس کا قلم ہوتا ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتی ہیں؟

ج اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ سوشل میڈیا والے اچھی بری ہر چیز کو شائع اور مشتہر کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ نہ محقق اور نہ نقاد اور ہر وہ شخص جس کی کوئی چیز ایک دوبار سوشل میڈیا پر آجاتی ہے خود کو بڑا قلمکار سمجھنے لگ جاتا ہے اور کچھ مزید سیکھنے اور محنت کرنے کی کوشش ترک کر دیتا ہے۔

س ذاتی تجربات ومشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج دیکھا جائے تو بنیادتو ذاتی تجربات اور مشاہدات ہی ہوتے ہیں جو اس کے قلم کو رواں رکھتے ہیں۔ ایک خاص انداز، سوچ اور زاویہ عطا کرتے ہیں۔ اس کے ذہن کو وسعت عطا کرتے ہیں۔ خوشی اور غم کو زندگی کے دوزخ میں ہی، مگر دوسروں کے دکھ کو اپنا سمجھنے کا سلیقہ تب ہی عطا ہوتا ہے جب کوئی خود اس میں گزرتا ہے۔ وہی اس کی تپش کو جان سکتا ہے جو اس آگ میں جل چکا ہو۔

س کیا کھویا، کیا پایا؟

ج آپ کو حیرت تو ضرور ہوگی جب میں یہ کہوں گی کہ میں نے کچھ نہیں کھویا صرف پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سوز و گداز کی دولت عطا کرنے اور احساس کے نفیس جذبے سے اپنی تخلیق کا مقصد جاننے کا اعزاز بخشا ہے تو یہ پانا ہی ہے نا!

دولت درد پا کے میں خود ہوں گداز دل ملا
ایسا کبھی نہ آئے دن آنکھ مری نہ نم رہے

جیسا جاوید اختر نے کہا ہے۔

غم ہوتے ہیں جہاں ذہانت ہوتی ہے
دنیا میں ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے

سو...........

اپنی نظروں میں بھی ہم کچھ معتبر تب سے ہوئے
غم کی خلعت جب ملی اور درد سرمایا ہوا

گل نوخیز اختر

س آپ شاعری کرتے ہیں، صحافت کے شعبے سے ایک طویل عرصے سے منسلک ہیں اور پاکستان کے مقبول ترین ومصروف ترین مزاح نگاروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر کونسا ذریعہ اظہار زیادہ پسند ہے؟

ج مجھے کالم نگاری زیادہ پسند ہے کیونکہ یہاں میں اپنی بات آسانی سے کہہ سکتا ہوں، شاعری دو لائنوں میں پورا اظہار مانگتی ہے، صحافتی بیان بالکل روکھا ہوتا ہے جبکہ میری رائے میں ہلکا پھلکا انداز آپ کی بات کو زیادہ موثر طریقے سے آگے پہنچا سکتا ہے۔

س تحریر کو ذریعہ اظہار بنانے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج جب پڑھنا آ گیا تو لکھنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا۔ بچوں کی کہانی پڑھ پڑھ کر خود بھی امنگ اٹھی کہ میں بھی ایسا ہی کچھ لکھوں جسے دوسرے پڑھیں۔ 1986ء میں امروز ''بچوں کی دنیا'' میں پہلی تحریر شائع ہوئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ ہتھیار اٹھائے بغیر بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ میں نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی لہٰذا قلم کی بیساکھی نے مجھے آگے چلانے میں بڑا سہارا دیا۔

س بچپن کہاں اور کیسا گزرا؟

ج پیدائش بھی ملتان میں ہوئی اور بچپن بھی ملتان ہی میں گزرا۔ ملتان میرے دل میں بستا ہے، یہاں میں نے بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھا۔ اس دور میں بچوں کے صفحات میں کہانیاں لکھنے والے رائٹرز کی اکثریت آج منجھے ہوئے لکھاریوں میں تبدیل ہو چکی ہے اور یہ سارے میرے وہی دوست ہیں جن کے ساتھ ہم کہانیوں کے مقابلے کیا کرتے تھے۔

س اہل قلم کو بنانے میں گردوپیش کے ماحول کا کہاں تک اثر ہوتا ہے؟ آپ کا ابتدائی ادبی وصحافتی سفر کیسا رہا؟

ج میرا نہیں خیال کہ ماحول کوئی اثر کرتا ہے، مثلاً میرے گھر کا ماحول پڑھا لکھا تھا لیکن اس کے باوجود لٹریچر کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا تھا، مجھے یاد ہے بچپن میں اس بات پر مار پڑتی تھی کہ میں ناول کیوں پڑھ رہا ہوں یا پاکٹ منی سے کہانیوں کی کوئی کتاب کیوں خریدی ہے۔ لیکن ہاں...... اگر آپ کے اندر جنون ہے تو آپ اپنا ماحول خود پیدا کر لیتے ہیں، سو میں نے بھی اپنے ہم مزاج لوگوں کو ڈھونڈ لیا جو لکھنے پڑھنے سے عشق کرتے تھے۔ ابتدائی طور پر میں نے صحافتی سفر کا آغاز ملتان کے لوکل روزنامہ ''سنگ میل'' سے کیا۔ اس دوران اردو اکیڈمی کے اجلاسوں میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، پھر ''کہکشاں'' کے نام سے اپنا میگزین نکالا جس میں پہلی بار ''ادبی اخبار'' کا آئیڈیا پیش کیا۔ اس کا ایک صفحہ ایسا تھا جہاں ادبی خبریں اخباری انداز میں شائع کی جاتی تھیں۔ یہی انداز آگے چل کر ''احساسِ نو'' اور ''مکمل'' ادبی اخبار کی شکل میں لاہور میں سامنے آیا۔

س میں مزاح نگار نہ ہوتا تو یقیناً کوئی قاتل ہوتا۔ بچپن کی محرومیوں کا احساس انسان کو مار دیتا ہے، مجھے کہانیاں اچھی لگتی تھیں، شاعری پسند تھی اور میوزک سے عشق تھا...... لیکن ہمارے گھر میں یہ تینوں چیزیں ''غیر قانونی'' سمجھی جاتی تھیں۔ میرے اندر شروع سے ہی شرارتی پن تھا جس کا اظہار زمانہ طالب علمی میں ہر روز ہوتا تھا۔ یہی شرارتی پن میری محرومیوں پر حاوی ہوتا رہا اور پھر مزاح نگار نے میرے اندر کی آگ کو رفتہ رفتہ ٹھنڈا کر دیا۔ اب میں خود بھی خوش رہتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ میری تحریر سے دوسرے بھی خوش رہیں۔

س اب تک آپ کی کون کون سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں؟

ج NO خبریاں، آنکھیں غزل ہیں آپ کی۔ ڈونٹ وری، شرارتی، رائٹرز ڈائریکٹری، ٹائیں ٹائیں فش، چھارجی اور طلسمہ۔

س آپ نے اردو زبان میں پہلا مکمل مزاحیہ ناول تحریر کیا، کیسا تجربہ رہا؟

ج یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا، مجھے اکثر دوست کہتے تھے کہ تمہارا کالم پڑھ کر ہم ہنستے ہیں لیکن یہ ہنسی تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو جاتی ہے کیونکہ کالم ختم ہو جاتا ہے۔ تب میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ ایک باقاعدہ مزاحیہ ناول تحریر کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے ڈھیر سارا وقت درکار تھا۔ ایسے میں ایک دوست حسن علی نے تجویز پیش کی کہ آپ ہماری ویب سائٹ ''اردوستان'' پر یہ ناول قسطوں میں سٹارٹ کریں۔ یہ آئیڈیا مجھے اچھا لگا اور یوں تین سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے یہ ناول مکمل ہو گیا۔ لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے اتنی پذیرائی ملے گی۔ آج بھی یہ ناول میری ویب سائٹ www.nokhaiz.com پر کتابوں کے سیکشن میں آن لائن موجود ہے اور احباب اسے انتہائی محبت سے پڑھتے ہیں اور اپنی مسکراہٹوں سے نوازتے ہیں۔

س لوگ کہتے ہیں کہ ناکام عشق آدمی کو شاعر بنا ڈالتا ہے، آپ کیا سمجھتے ہیں؟ آپ کی شاعری کی وجہ بھی تو کوئی ناکام رومانوی واردات نہیں؟

ج رومانی وارداتیں تو میری زندگی میں بھری پڑی ہیں لیکن کسی عشق نے مجھے شاعر نہیں بنایا کہ شاعری کے بعد مجھے عشق کا حوصلہ پیدا ہوا۔ میں سمجھتا ہوں ناکام عشق کے بعد انسان شاعر نہیں بندے کا پتر بن جاتا ہے، ناکام عشق کے بعد کی شاعری بھی اکثر ناکام ہی ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی محبوب کی یاد میں تڑپنا اور سسکنا شاعر کا پسندیدہ موضوع ہے۔

س آپ کی ادبی وصحافتی زندگی ہمارے سامنے ہے، ایک کمٹمنٹ کے ساتھ آپ اس میدان میں آئے اور اپنے شوق کو کامیاب طریقے سے وسیلہ روزگار بنانے میں کامیاب رہے۔ اس شعبے میں نوواردان کے لئے کوئی مشورہ یا پیغام دیں گے؟

ج لکھنے لکھانے کو وسیلہ روزگار بنانا بہت مشکل اور کٹھن فیصلہ تھا، خصوصاً اس دور میں جب شاعروں ادیبوں کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے گھروں کے چولہے عموماً ٹھنڈے ہی رہتے ہیں لیکن میرے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی۔ تین چار ملازمتیں کرنے کے بعد

احساس ہو گیا تھا کہ عنقریب تخلیقی طور پر اپاہج ہو جاؤں گا، لہٰذا سب کچھ چھوڑ کر لکھنے لکھانے کا کام شروع کر دیا۔ ابتدائی طور پر یہ دن بہت کڑے تھے لیکن اب یہ حالت ہے کہ فل ٹائم صرف یہی کام کرتا ہوں۔ نئے آنے والوں سے یہی گزارش کروں گا کہ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کو ترجیح دیں، اچھی چیز پڑھنے سے اچھی چیز لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں مطالعے کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ پڑھتے کم اور لکھتے زیادہ جا رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہم مزاح کے عہد یوسفی میں زندہ ہیں، کیا آپ بھی مشتاق یوسفی کو عہد حاضر کا سب سے بڑا مزاح نگار سمجھتے ہیں؟ مزاح نگاری میں کن لوگوں نے متاثر کیا؟

ج: اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم مزاح کے عہد یوسفی میں زندہ ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہم "سلسلہ قاسمیہ" کے پیروکار ہیں، میں مزاح میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو اپنا پیر و مرشد مانتا ہوں۔ قاسمی صاحب کی محبت کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے رہتے ہیں اور خصوصاً مزاح نگاری کے حوالے سے تو یوسفی صاحب کے بعد قاسمی صاحب سے بڑا کوئی نام نہیں۔ ان کے بعد کے ناموں میں یونس بٹ صاحب نہایت اہم ہیں۔ اشفاق احمد ورک انتہائی چلبلہ فقرہ چست کرتے ہیں، وقار احمد صاحب کا اپنا ایک منفرد انداز ہے، یاسر پیرزادہ بڑا شاندار لکھتے ہیں، حسین احمد شیرازی صاحب بڑا شستہ مزاح لکھتے ہیں۔ نئے مزاح نگاروں میں ناصر ملک صاحب انتہائی زندہ جملہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ علی رضا، حافظ مظفر محسن اور شوکت علی مظفر صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ابرار ندیم صاحب اگرچہ مزاح کم لکھتے ہیں لیکن جس دن وہ اس میدان میں سنجیدہ ہوئے، بہت شہرت پائیں گے۔

س: کیا آج کا ادیب اپنی سماجی و معاشی ذمہ داری نبھا رہا ہے؟

ج: ادیب بیچارے نے کیا سماجی اور معاشی ذمہ داری نبھانی ہے، 99 فیصد ادیب اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی نہ کسی غیر ادبی نوکری کے محتاج ہیں، سماجی طور پر وہ اپنی تحریروں سے بہت کچھ بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن معاشی طور پر ان کی

بدحالی آج بھی قائم ہے۔ پرائیویٹ چینلز آنے سے میرے جیسے کم تر ادیبوں کو کچھ معاشی استحکام ضرور ملا ہے لیکن جینوئن ادیب آج بھی روٹی روزی کے لئے پریشان ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ ہمارے ہاں بیشتر ادیب کمرشل ازم کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ کمرشل رائٹنگ کو گناہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک شاعر ادیب اگر جنرل سٹور کا مالک ہے تو وہ وہاں آنے والے گاہک کو شاعری یا افسانہ سنا کر ٹوتھ پیسٹ نہیں بیچتا...... کمرشل ازم بھی جنرل سٹور ہے، اسے جنرل سٹور کی طرح ہی ٹریٹ کرنا پڑتا ہے۔

س ادب میں ترقی پسند تحریک یا کسی بھی تحریک کو کیسے دیکھتے ہیں؟ اہل قلم کو سیاسی ہونا چاہئے؟

ج یہ تحریکیں بہت پرانی ہو چکیں، اب کوئی شاعر ادیب نہ چاہنے کے باوجود بھی ترقی پسندی سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ ہر دور اپنے زمانے کی بات مانگتا ہے۔ روایت سے پہلے بھی کوئی روایت دم توڑ چکی ہوتی ہے لہٰذا روایت ہمی نے بنانی ہوتی ہے۔ جہاں تک اہل قلم کے سیاسی ہونے کی بات ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایک لحاظ سے یہ بہت ضروری بھی ہو جاتا ہے کیونکہ سیاست زمانہ حال سے تعلق رکھتی ہے اور زمانہ حال سے کٹ کر کوئی تخلیق اپنا مقام نہیں بنا سکتی۔

س موسیقی آپ کو بہت پسند ہے، کیسی موسیقی پسند ہے؟ کون سے گلوکار زیادہ پسند ہیں؟

ج مجھے موسیقی سے عشق ہے، ہر قسم کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہوں، نصیبو لعل، شکیرا، مہدی حسن، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، محمد جمن، طفیل نیازی، ابرار الحق، عاطف اسلم، یو یونی سنگھ، میکا سنگھ، ثریا گوشال، لتا، نور جہاں، رفیع صاحب، مکیش، کشور کمار...... سبھی کی آواز کا لطف لیتا ہوں۔

منیر نیازی

س شعر کس لیے کہتے ہیں؟

ج کچھ پتہ نہیں ہے کہ شعر کس لیے اور کیوں کہتا ہوں۔

س ہمارے ہاں ناقدین کے کردار سے مطمئن ہیں؟

ج میرے خیال میں ہمارے ہاں ناقدین مکمل طور پر علم سے بے بہرہ ہیں۔ انہیں اپنے فن تنقید کی الف ب سے بھی واقفیت نہیں ہے پچھلے باون سالوں میں اور ینٹکل کالج میں جو تنقیدی رویے پڑھائے جا رہے ہیں یہ اب تک ان سے باہر نہیں نکلے جب کہ اس دوران دنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔ تنقید تخلیقی جوہر مانگتی ہے لیکن ہمارے ہاں کوئی خاص تخلیقی جوہر والا نقاد پیدا نہیں ہوا۔ کسی شخص نے تنقید کا نیا معیار قائم نہیں کیا۔ نقاد طے شدہ اصولوں سے باہر ہو تو اس کو رد کر دیتے ہیں۔ مغرب میں بھی تنقید ہوتی ہے لیکن ان کا مقصد تخلیق کے حسن و قبیح پر بحث کرنا اور مرکزی خیال کو ڈسکس کرنا ہوتا ہے جو کہ اصلاح و تخلیقی کام ہے۔ ہمارا نقاد یہیں پر غلط ہے۔ یہاں دوسرے لوازمات کو پرکھا جاتا ہے حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ دیکھا جائے کہ شاعر نے کون سا نیا خیال پیش کیا ہے اس کی یہ تخلیق تخیلاتی جمود کو توڑنے میں کامیاب ہوئی ہے یا نہیں۔ ہمارا نقاد ہائیکو، ماہیا، غزل اور نظم کو ایک معیار پر پرکھتا ہے اور یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا کہ شاعر نے خیال پر کس حد تک زور دیا ہے۔ لیکن ہمارے نقاد کو یہ زحمت کرنا ہوگی اور گہرائی میں جانا ہوگا۔ تعصب کے بغیر بے لاگ فنی تنقید کرنا ہوگی کیونکہ

تنقید مداری کا کھیل نہیں ہے۔

س ناقدین کے رائے میں آپ نظم کے شاعر ہیں۔ آپ اس رائے سے متفق ہیں؟

ج میں شعر کہتے وقت شعوری کاوش نہیں کرتا اور نہ کوئی خاکہ ترتیب دیتا ہوں کہ مجھے غزل کہنی ہے یا نظم۔ اس میں یوں ہوتا ہے کہ مجھے انسپریشن (Inspiration) ہوتی ہے اور میں لکھتا ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ میں جو لکھنے جا رہا ہوں وہ حکمرانوں کے جبر کے بارے میں ہو یا اس میں غربت و امارات کے ٹکراؤ کا ذکر ہو۔ میں آزاد ہوں۔ مجھے جو چیز انسپائر کرتی ہے اسی کے بارے میں لکھتا ہوں میں پابند ہو کر نہیں لکھ سکتا۔ فیض صاحب ترقی پسند دور کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی تخلیقات پر سوشلزم کا سایہ محسوس کیا جا سکتا ہے کیونکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو لکھنے کے دوران ان کا فرض یاد رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انجمن ترقی پسند کے مقاصد کو اپنی تخلیقات کے ذریعے آگے بڑھایا۔

س تو اس لحاظ سے کیا تمام ترقی پسند شعراء کا کلام توارد کے زمرے میں آتا ہے؟

ج توارد چوری کے زمرے میں آتا ہے۔ میں ترقی پسند شعراء کے کلام کو سرقہ اور توارد کے زمرے میں نہیں لاتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ موضوعاتی شاعری اس ذیل میں نہیں آتی جو گہری شاعری ہوتی ہے جب کہ ترقی پسندوں کی تمام تر شاعری موضوعاتی ہے۔ شاعری میں ہم نامعلوم سے کوئی چیز معلوم میں لاتے ہیں۔ ہیگل، مارکس وغیرہ کے فلسفے کی بنیادیں بھی اس شاعری کی مرہون منت ہیں جو کہ ڈوب کر کی گئی ہے۔

س آپ نے اپنے پنجابی کلام کے اردو تراجم بھی لکھے ہیں۔ کیا یہ شعوری کوشش نہیں؟

ج جی ہاں میں نے اپنے پنجابی کلام کے اردو تراجم کیے ہیں۔ یہ شاعری میں خود پر طاری جمود کو توڑنے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ میں ان تراجم سے انصاف نہیں کر سکا۔ میرے کچھ نظموں کے تراجم دوسرے شعراء نے بھی کیے ہیں کئی جگہ یہ تراجم مجھ سے بہتر ہیں۔

س آپ نے نثر میں دو مختصر پنجابی ڈرامے بھی لکھے جو کافی سراہے گئے۔ باقاعدہ کبھی ڈرامہ لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

ج اپنے بچپن میں بزرگوں سے سنے قصوں میں سے دو کو میں نے ڈرامے کی صورت نثر میں لکھا جسے کافی سراہا بھی گیا۔ ان قصوں کو میں نے منظوم بیان کرنے کے بجائے نثر میں اس لیے لکھا کیونکہ میرا خیال ہے اگر میں انہیں شعر میں بیان کرتا تو وہ مصنوعی لگتے۔ جہاں تک باقاعدہ ڈرامہ نہ لکھنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہ کہوں گا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ جب میں لکھنے بیٹھنے لگتا ہوں مجھے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کیا لکھ رہا ہوں۔ بس ایسی ہی کسی کیفیت میں مجھ سے وہ ڈرامے لکھے گئے۔ دوسرا ویسے بھی مجھے عام کام پسند نہیں جب کہ ڈرامہ ایک عام صنف ہوگئی ہے۔ جس کو دیکھو ڈرامہ لکھ رہا ہے۔

س آپ کے خیال میں ادبی اخبارات، رسائل، اور ادبی ایڈیشن ادب کی کس حد تک خدمت کر رہے ہیں؟

ج ادب کی خدمت تو ایک طرف الٹا یہ سراسر پراگندگی پھیلا رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ کہ ادبی ایڈیشنوں و رسائل کے انچارج وہ لوگ بن گئے ہیں جو ذہنی اور شعری سطح پر نا لائق اور نکمے ہیں۔ ہاں البتہ اگر میرٹ پر ان ادبی ایڈیشنوں کے انچارج مقرر کیے جائیں تو صورتحال بہتر ہو سکتی ہے۔ مگر ایک تخلیقی ذہن کا آدمی ان جھنجھٹوں میں نہیں پڑے گا۔

س اپنے اب تک کے کام سے مطمئن ہیں؟

ج میں قسمت، مقدر اور مقسوم کا قائل ہوں۔ میرے حالات نے مجھے شاعر بنا دیا۔ میں ہشیار پور کا مہاجر ہوں۔ میں نے منٹگمری (ساہیوال) میں بکسٹال بنایا، سات رنگ کے نام سے مجلّہ نکالا، ارژنگ پبلشرز کے نام سے پبلشنگ ادارہ قائم کیا۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر ان چکروں میں نہ پڑتا تو شاید مالی لحاظ سے آسودہ ہوتا۔ میں گھر سے کسی اور کام کے لیے نکلا تھا لیکن میرے راستے میں شاعری آگئی یہ کام مجھے پسند آگیا۔ اب تک میری سولہ کتابیں آچکی

ہیں ۔ میں نے بہت لکھا ہے لیکن مجھے تسکین نہیں ہوتی مجھے اور لکھنا ہے۔ گھر کے گورکھ دھندوں سے فرصت نہیں ملتی لیکن اس کے باوجود لکھنا میری مجبوری ہے جلد ہی میرا نیا شعری مجموعہ ''دھوپ کا چوکور ٹکڑا'' منظر عام پر آ رہا ہے۔

س سرکاری ادبی اداروں کے کردار سے مطمئن ہیں؟

ج بالکل نہیں، کچھ لوگوں نے اپنی سیاسی وابستگیوں اور اثر رسوخ استعمال کر کے یہ ادارے بنوائے ہیں اور اب یہ لوگ گدھوں کی طرح ان پر قابض ہو کر ان کو نوچ رہے ہیں۔

س ادبی گروہ بندیوں کے بارے میں کیا رائے ہے اور یہ کہ آپ کا تعلق کس گروہ سے ہے؟

ج ہم ایک منتشر صورت حال میں رہ رہے ہیں۔ قیاس میں زندہ رہنے کے لیے گروہ بندی ضروری ہے۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ میرا کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ دیگر شعبوں کی طرح اس شعبے میں بھی ایک مافیا سرگرم ہے۔ یہی وجہ ہے پرائڈ آف پرفامنس اور ستارہ امتیاز جیسے تمغوں کی فراوانی ہے یقین جانیے اس صورتحال میں مجھے اپنے ستارہ امتیاز پر شرم آنے لگی ہے۔

س خواتین شاعرات میں سے کس نے متاثر کیا؟

ج ہمارے ہاں بے شمار شاعرات لکھ رہی ہیں۔ ان میں شمیم اختر اور کزئی، فاطمہ حسن اور فہمیدہ ریاض کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ غزل میں شبنم شکیل اور شاہدہ حسن بہتر غزل لکھ رہی ہیں۔

مُنّو بھائی

س اپنی زندگی کے ابتدائی سفر کے متعلق کچھ بتائیں۔

ج میری پیدائش ۶ فروری ۱۹۳۳ء کی ہے۔ یہ وہی دن ہے جب جرمنی میں ہٹلر کی چانسلر شپ ہوئی۔ میرا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس سے ہے۔ میرے والد ریلوے میں ملازم تھے۔ اُس دور میں بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ تحریک آزادی ابھی باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوئی تھی لیکن لوگوں میں شعور بڑھ رہا تھا۔ میرے دادا امام مسجد تھے لیکن اُن کا پیشہ کتابوں کی جلد بندی تھا۔ امامت اُن کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ اُن کا نام میاں غلام حیدر تھا۔ انہوں نے گیتا کا پنجابی ترجمہ بھی کیا تھا۔ وہ مہاراجہ کشمیر کے فارسی کے اتالیق بھی رہے۔ پنجابی کے ممتاز لکھاری شریف کنجاہی میرے ماموں تھے۔ انہی کی وجہ سے میرا ترقی پسندوں سے تعلق بنا جن میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں جن کو میرے بارے میں علم تھا کہ گھر میں مجھے منو کہا جاتا ہے۔ انہوں نے میرا نام منو بھائی رکھا اور امروز میں میری نظم چھاپی۔

س بچپن کن شہروں میں گزرا اور اخبار میں کیسے لکھنا شروع کیا؟

ج میری پیدائش وزیر آباد کی ہے۔ اس کے بعد راولپنڈی اور پھر لاہور میں وقت گزرا۔ بچپن میں راولپنڈی سے ''تعمیر'' اخبار نکلتا تھا جس میں لکھنے کی ابتدا کی۔

س ''سونا چاندی'' آپ کا ایک یادگارٹی ڈرامہ ہے جس کے بعد اب ایک عرصے سے آپ نے ٹی وی کے لیے ڈرامہ نہیں لکھا اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج موجودہ دور میں ٹی وی پر کمرشل بریک آیا ہوا ہے جس میں ہمارا کوئی کام نہیں۔ اب یہ بریک ختم ہونے والا ہے۔ وہ ڈرامہ جو اشفاق احمد کے ساتھ قبر میں اُتر گیا تھا وہ دوبارہ شروع ہونے والا ہے۔ اب میں جیو کے لیے سونا چاندی اینڈ کمپنی کے نام سے دوبارہ ڈرامہ لکھ رہا ہوں جس میں گلیمر کی بجائے اصل کرداروں کو سامنے لاؤں گا جو معاشرے کی اصل تصویر ہیں۔

س پنجابی کے علاوہ اور کس زبان میں شاعری کی؟

ج میں نے شاعری پنجابی زبان میں ہی کی ہے اور وہی میری پہچان بنی ہے اور اس شاعری پر مجھے ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' ملا ہے۔ میرا پنجابی مجموعہ ''اجے قیامت نہیں آنی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

س شاعری کے لیے آپ نے پنجابی زبان کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج پنجابی میری مادری زبان ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ میرے لیے اپنی ماں بولی میں اظہار زیادہ آسان ہے۔ میں نے اس حوالے سے فیض صاحب سے بھی مشورہ کیا تو انہوں نے کہا ''خواب کس زبان میں دیکھتے ہو؟''

تو میں نے کہا ''پنجابی میں۔''

انہوں نے کہا ''بس پھر پنجابی میں ہی لکھو۔''

س شاعری، ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری میں آپ کو کون سا تعارف زیادہ پسند ہے۔

ج ڈرامے میں میری پذیرائی بہت زیادہ ہوئی لیکن میرے خیال میں کالم نگاری میں، میں بہتر انداز میں اظہار کر سکتا ہوں۔

س ایک کالم نگار کے لیے غیر جانبدار ہونا کس حد تک ضروری ہے؟

ج میرے خیال میں ایک کالم نگار کے لیے غیر جانبداری ممکن نہیں ہے۔ اگر میں جانبدار نہیں تو کالم نگاری کیوں کر رہا ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے بے انصاف نہیں ہونا چاہیے۔ جو چور کے خلاف، جہالت کے خلاف ہے ناانصافی کے خلاف ہے وہ غیر جانبدار نہیں ہو

سکتا۔ کالم نگار کو چاہیے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو انصاف سے کام لے۔

س آج کے دور میں ترقی پسند تحریک کا وجود ہے؟

ج آج ترقی پسند تحریک اپنے اس انداز میں تو موجود نہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے اُس دور میں اس تحریک کے انداز کو اپنایا وہ آج نامور حیثیت میں موجود ہیں۔

س اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

ج جو بھی انسان کی محرومی، خواہشوں، آرزوؤں کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ وہ منٹو ہو، فیض ہو یا انتظار حسین ہو۔ میرے خیال میں ہر وہ لکھنے والا جو انسان کے حق کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ ان معنوں میں میں انتظار حسین کو بھی ترقی پسند سمجھتا ہوں۔

س پاکستان کا مستقبل کیا ہے؟

ج ہمیں ماضی کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ جبکہ ہم مستقبل کی طرف جانا چاہ رہے ہیں۔ یہ جو انتہا پسندی جیسے رویے ہیں یہ ہمیں ماضی کی طرف لے جانے والے رویے ہیں۔ میرے خیال میں بنیاد پرستی اور انتہا پرستی کی یہ آخری ریل چل رہی ہے۔ اس کے بعد ہم اپنے اصل راستے کی طرف واپس آئیں گے اور پاکستان کی تعمیر اصل معنوں میں کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی تحریک پاکستان چل رہی ہے۔ آج کا پاکستان قائداعظم، علامہ اقبال اور قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان نہیں۔

س رمشا کیس کے حوالے سے آپ کا کیا موقف ہے؟

ج پہلی دفعہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے علماء نے حق اور انصاف کی بات کی ہے۔ ایک ایسی بچی کے بارے میں جو کہ ذہنی طور پر نارمل نہیں یہ کہنا کہ وہ توہین قرآن کی مرتکب ہوئی ہے اپنی جگہ خود ایک ابنارمل رویہ ہے۔ پہلی دفعہ اس کیس میں نظر آ رہا ہے کہ جج بغیر کسی دباؤ کے فیصلہ کر سکیں گے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہم ہندوستان میں خود ایک اقلیت تھے۔ آج ہمیں اقلیتوں کو تنگ کرتے وقت شرم محسوس کرنی چاہیے۔

مشکور حسین یاد

مشکور حسین یاد اردو شعر و ادب کا ایک نا قابل فراموش حوالہ ہیں۔ ساٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف۔ تمام زندگی حرفوں کی تخلیق اور تدریس میں گزاری ہے۔ صحافت سے ان کی وابستگی بہت پرانی ہے۔ جب پاکستان بنا تو اس وقت 1947ء میں بھی ایک سرکاری اخبار کے اڈیٹر تھے۔ ربع صدی گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھایا۔ جہاں سے ان کے شاگرد ہر شعبہ زندگی میں گئے۔ ان کے شاگردوں میں وزیر اعظم پاکستان سمیت بہت سے وزراء اور اہم حکومتی و غیر حکومتی افراد شامل ہیں۔ گزشتہ دنوں ہم نے لاہور کے علاقے ظفر کالونی میں ان کی رہائش گاہ پر ارژنگ کے قارئین کے لئے ایک انٹرویو کیا۔

س: ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے؟

ج: میرے والد صاحب پولیس میں تھے۔ یہ 1925ء کی بات ہے جب ان کی تعیناتی ضلع حصار کے علاقے بھٹنڈا میں تھی تو وہیں موضع منڈی ڈوالی میں میری پیدائش ہوئی۔

س: تعلیم کا ابتدائی سلسلہ بھی وہیں شروع ہوا؟

ج: ابتدائی تعلیم تو والد صاحب کی سرکاری نوکری کی تعیناتی کے ساتھ چلی۔ سکول میں داخلہ دوسری جماعت میں لیا تھا، اس کے بعد سکول تو تبدیل ہوتے رہے مگر سب سرکاری سکول ہی تھے جن میں میں نے تعلیم حاصل کی۔

س: آپ نے بتایا کہ والد صاحب پولیس میں تھے۔ پھر آپ کا ادب کی طرف کیسے آنا ہوا؟

ج: میرے نانا اچھے خاصے ادیب اور توانا شاعر تھے۔ میرے خیال میں شاید ننھیال کی

طرف سے یہ چیز آئی ہے۔ مگر میرے دادا بھی ایسے ہی شعروادب سے متعلق آدمی تھے اور دادی تو لکھنو کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ پھینکا بیگم کے نام سے لوگ انہیں جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا تعلق لکھنو سے بھی بنتا ہے۔ ویسے میرے خاندان کا تعلق ضلع مظفر نگر کے قریب بڈاولی گاؤں سے ہے۔ اس گاؤں کے علاوہ بھی ہمارے پاس تین مزید گاؤں تھے جو نواب نے دیئے تھے۔ اچھے خاصے جاگیردار تھے۔

س آپ جاگیردار خاندان سے تھے، پھر لکھنے پڑھنے کو کیریئر بنانے کا خیال کیسے آیا؟

ج میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ ضلع حصار میں واقع ہمارے سکول میں ترانہ پاکستان کے خالق حفیظ جالندھری آئے، انہوں نے مجھ سے غزل سنی اور داد دیتے ہوئے کہا کہ تم تو بہت زوردار شاعر ہو۔

س پہلی کتاب شاعری کی شائع ہوئی تھی یا نثر کی؟

ج پہلی کتاب شاعری کی شائع ہوئی، نثر کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا۔ اب تو ساٹھ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اب تک غزل کے بارہ مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ نثر میں بہت سارے موضوعات پر لکھا۔ انشائیے پر کافی کام کیا۔ اردو انشائیے کا تو مجھے موجد کہا جاتا ہے۔

س آپ معلم اور ماہر تعلیم بھی ہیں، موجودہ پرائم منسٹر نواز شریف بھی آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ تدریس کا تجربہ کیسا رہا؟

ج ذہین طلباء استاد کو پڑھانا سکھاتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی تمام زندگی پڑھایا اور یہ میرے لئے ہمیشہ ایک اعزاز کی بات رہی ہے۔ میں نے پچیس سال وہاں پڑھایا مگر کبھی ایک کلاس بھی مس نہیں کی۔ ایک بھی ناغہ نہیں کیا۔ یہ جو آج کل کہتے ہیں کہ شاگرد استاد کی عزت نہیں کرتے۔ یہ بالکل غلط اور فضول بات ہے۔ استاد اپنے فرض کو نبھا کر تو دیکھے، شاگرد اب بھی بہت عزت کرنے والے ہیں۔ ایک دفعہ حفیظ جالندھری اپنی بیگم کے ساتھ میری کلاس میں آکر پیچھے بیٹھ گئے اور ضد کرنے لگے کہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ

میں کیسے پڑھاتا ہوں۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ آپ پڑھائیں مگر انہوں نے ضد نہ چھوڑی اور مجھے پڑھاتا دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ بعدازاں بہت تعریف بھی کرتے رہے۔

س آپ کی جوانی کے ایام میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا بہت چرچا تھا۔ آپ بھی روشن خیال آدمی ہیں۔ کیا اس تحریک سے بھی تعلق رہا؟

ج انجمن ترقی پسند مصنفین کے تمام سرکردہ لوگ میرے دوستوں میں شامل تھے۔ مگر کبھی اس تحریک کا باقاعدہ حصہ نہیں بنا۔ سچ بتاؤں تو ہم خود بڑے ''پانے خان'' تھے ان دنوں میں۔

س عشق کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج ارے بھائی! جس نے عشق نہیں کیا وہ تو بالکل گدھا ہے۔ ہم نے تو زندگی میں بہت سارے عشق کئے۔ عشق کے بغیر تو انسان مکمل ہی نہیں ہوسکتا۔ میں تو ہمیشہ ہی عشق کے لئے تیار ہوں۔

س آپ کے گھنے بالوں، چستی اور سدابہار جوانی کا کیا راز ہے؟

ج میرے ابا گنجے تھے، دادا گنجے، نانا گنجے اور دادی بھی گنجی۔ جوانی کے دنوں میں جب میں بال بناتا تو اماں طنز کرتیں کہ بیٹا یہ چند دن کے مہمان ہیں، پھر نہیں رہیں گے۔ میں کہتا اماں میرے بال ہمیشہ قائم رہیں گے۔ میں نے دیکھا ہے آپ اپنے بارے میں جیسا گمان کرتے ہیں ویسا ہی ہوجاتا ہے۔

س آج کل بھی کچھ لکھ رہے ہیں؟

ج بہت کچھ لکھ رہا ہوں۔ لکھنے والا تو لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خیر میرے پاس زندگی تھوڑی بچی ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کررہا ہوں۔

س پارٹیشن کی کیا یادیں ہیں؟

ج میں اپنے 35 اہل خانہ میں سے اکیلا زندہ بچ کر پاکستان پہنچا تھا۔ ضلع حصار سے جب ہم نکلے تو میری ماں، بہن، بھائی، نانا، نانی سب مارے گئے تھے۔ میں ان دنوں حصار

میں ایک اخبار ''پکار'' کا ایڈیٹر تھا۔ ہمارا گھر اسٹیشن کے پاس تھا۔ بڑا اچھا علاقہ تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ محفوظ ہے مگر بلوائی وہاں بھی پہنچ گئے۔ جب بلوائی حملہ آور ہوئے تو میں زمین پر گر پڑا تھا، ٹھوکر لگی تھی۔ وہ سمجھے کہ میں مرگیا ہوں۔ سب اہلخانہ کو قتل کرنے کے بعد انہوں نے تسلی کے لئے دوبارہ نیزے اور برچھیاں ماریں۔ اتفاق سے جب انہوں نے مجھے نیزہ مارا تو وہ زمین میں جا کر پیوست ہوگیا۔ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ پھر میں گرتا پڑتا لاہور پہنچ گیا۔

س قیام پاکستان سے قبل ادبی منظرنامے پر کون لوگ نمایاں تھے؟

ج بہت سے لوگ تھے۔ مگر مجھے جگر مرادآبادی زیادہ پسند تھے۔ باقی سب سے بھی ذاتی تعلق یوں تھا کہ میں نے اورینٹل کالج لاہور سے فارسی اور اردو میں ایم فل کیا جہاں یہ سب لوگ آتے جاتے تھے۔

س سنا ہے ایشوریا رائے آپ سے بہت متاثر ہیں؟

ج ہاں! بمبئی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ کہنے لگیں باقی سب لوگ مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہیں، آپ سیدھا دیکھتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کی شوقین ہیں مگر ایشوریا کو چھوڑو بمبئی میں ہی میری ملاقات گاندھی جی سے بھی ہوئی تھی۔ میں سروجنی نائیڈو کے ساتھ تھا۔ گاندھی جی گورے، چٹے آدمی تھے اور لڑکیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ میں نے سروجنی نائیڈو سے پوچھا کہ اس آتما کو مہاتما بنانے میں لڑکیوں کا کتنا حصہ ہے؟

مشتاق احمد یوسفی

س اُردو میں مزاح نگار کچھ کم نہیں؟

ج ڈنک مارنے والے کم ہی ہونے چاہئیں۔

س آپ کی تحریر میں بعض لوگوں پر جارحانہ جملہ بازی ہوتی ہے۔ایسا کیوں؟

ج میں نے اپنی تحریر میں کسی پر حملہ نہیں کیا۔ کیونکہ میں شاید جوابی حملے کی تاب نہیں رکھتا۔ پھر یہ بھی کہ تحریر میں تلخی آ جائے یا قلم کو طیش آ جائے تو وہ ادب نہیں رہتا۔ یہ چیز نعرہ وغیرہ ہو جاتی ہے یا کچھ اور شکل اختیار کر لیتی ہے۔

س آپ نے ابوالکلام آزاد کی نثر کو جناتی زبان قرار دیا۔ کیا یہ زیادتی نہیں؟

ج مولانا ابوالکلام آزاد مذہبی عالم بھی تھے اور ادیب بھی۔ میں نے ادیب کی حیثیت سے بات کی تھی اور ان کی نثر کو جناتی قرار دیا تھا۔ مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) تو اس بنا پر ان کو سب سے بڑا اُردو دشمن کہہ گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے بقول اس طرح کی اُردو اصل میں اُردو کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ میں بھی مولوی عبدالحق کا حامی ہوں اسی طرح میں آج کے دور میں میرامن اور رتن ناتھ سرشار کی زبان لکھنے کے بھی خلاف ہوں۔ یہ تو ایسے ہی ہوگا کہ آج کی دُلہن کا سنگھار سو سال پہلے کی دُلہن کی طرح کیا جائے یعنی اسے آملے کا تیل لگا کر چپکایا جائے تو کیا ایسی دلہن کو آج کا دولہا قبول کرے گا۔

س تو پھر اُردو کے معیاری نمونے کیا ہوں گے؟

ج ہمارے لیے نثر کے عمدہ نمونے سرسیّد احمد خان، مولوی عبدالحق، سعادت حسن منٹو، غلام عباس اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کی تحریروں میں ہیں۔ بیدی کبھی کبھی اُردو لہجے سے

انحراف کرتے ہیں مگر ان کی تحریر جاندار بہت ہے۔ اس لحاظ سے میں اسے پہلے نمبر پر رکھتا ہوں۔ جبکہ کرشن چندر کو چھٹے نمبر پر بھی نہیں رکھتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے اور میری رائے کی بہر حال زیادہ اہمیت نہیں۔ کیونکہ میں محقق یا نقاد نہیں ایک عام قاری ہوں۔ میں تو فارسی بھی نہیں جانتا اسی لیے کہتا ہوں کہ میری رائے ایک عام قاری کی رائے ہے۔

س آپ نے کچھ عرصہ قبل دبستان لاہور کو مستند کہا تو یہ بات مذاق میں کہی یا؟

ج میں نے یہ بات سنجیدگی سے کہی تھی۔ زبان جامد شے نہیں ہوتی اس میں تغیر آتا رہتا ہے۔ ہم بنا بنایا سانچہ پیش کر کے لوگوں کو اس کا پابند نہیں کر سکتے۔ اُردو کا فروغ گزشتہ ستر سال سے پنجاب میں ہو رہا ہے۔ وہاں بہترین شاعر اور افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں۔ وہاں کے ناشرین تو آزادی سے پہلے بھی نمایاں تھے۔ اس لیے اب اُردو کا محاورہ وہیں بنے گا۔ ممکن ہے یہ محاورے نئے لگیں مگر اُردو ادب میں اب یہ جذب کرنا ہوں گے۔ مگر یہ انجذاب فطری ہوگا تو کامیاب ہوگا۔ انگریزی زبان جہاں گئی وہاں اس میں تبدیلی ہوتی رہی۔ انگریزی نے برصغیر سے ہزاروں الفاظ لیے (اس پر چھ سو الفاظ کی ایک مکمل ڈکشنری تیار ہو چکی ہے) ماضی میں دلی اور لکھنؤ اُردو کے مراکز تھے مگر اب تو لکھنؤ میں کوئی سائن بورڈ بھی اُردو میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ نہ ہی وہاں کے بچے اُردو پڑھنے کے عادی ہیں۔ اب اُردو ویسی ہی بولی جائے گی جیسا کہ اس کو استعمال کرنے والے بولیں گے اور ظاہر ہے پنجاب اس میں نمایاں ترین ہے۔ مستقبل میں بھی پنجاب میں اس کا فروغ نظر آ رہا ہے۔ انگریزی میں ویسٹ انڈین کا یعنی جیمیکن کا لہجہ اپنا اور آکسفورڈ کا اپنا ہے۔ ہر جگہ ایک سا لہجہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس نظریے پر اپنی کتاب ''آبِ گم'' میں لوک لہجہ کے نام سے ایک پیراگراف لکھا ہے۔ میرے نزدیک اُردو کا ہر لہجہ لطف دیتا ہے اور یہی سب کچھ برقرار رہنا چاہیے۔ میرا من یا رجب علی سرور کا لہجہ اپنانے پر ہر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو ارتقاء پذیر ہے۔ یہ اپنے طریقے خود بنائے گی۔ اس پر تردّد کی ضرورت بھی نہیں۔ اب کلاسیکی زبان کے محاورے ختم ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنی تحریر میں ایک جگہ ایک محاورہ ''زنجک چاٹنا'' لکھا تو افتخار عارف کو عجیب لگا تھا۔ حالانکہ ہمارے بچپن میں یہ محاورہ عام تھا۔ اُردو

میں محاورے اور ترکیبیں وغیرہ اسی طرح بنتے بگڑتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ اب لفظ خلفشار ہے تو اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ اس کا ماخذ کیا ہے مگر یہ مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خلل اور فشار سے مل کر بنا ہو۔ اس طرح سنسنی خیز بھی غلط ہے مگر مستعمل ہے۔ جوش ملیح آبادی لفظ رہائش کے خلاف تھے مگر اس کا استعمال جاری ہے اور یہ سب الفاظ اچھے بھی لگتے ہیں۔ گرائمر کے مطابق لفظ ادائیگی کے بجائے ادائی ہونا چاہیے مگر ادائیگی مروج ہے اور بھلا لگتا ہے۔ ویسے پاکستان میں اُردو کی حیثیت میں تضاد ہے۔ اس پر اکیڈمی آف لیٹرز میں بھی بحث رہی تھی۔ میری رائے میں محاورہ بولی جانے والی زبان سے بنتا ہے نہ کہ معدوم زبان سے۔ پاکستان میں موجودہ اُردو وہی ہوگی جو بولی اور لکھی جائے گی۔ اُردو کی سند اب قلعہ معلّی سے نہیں لاہور کے قلعے سے لی جائے گی۔ کیونکہ کروڑوں اہل پنجاب اب لہجہ اپنا رہے ہیں اور وہاں سے یہ اُردو ہر جگہ پھیل رہی ہے۔ البتہ پوری طرح اس کا انجذاب آہستہ آہستہ ہوگا۔

س آپ کی لفظوں میں اتنی گہری دلچسپی کس وجہ سے ہے؟

ج مجھے لفظوں کی تلاش اور کھوج میں مزا آتا ہے۔ اس سے اور کئی الفاظ کی گرہیں کھلتی ہیں۔ مثلاً جس کھیت میں بیج ڈالے جائیں یا نئے نئے پودے نکلے ہوں تو وہاں ان کو پرندوں سے بچانے کے لیے صلیب نما ڈھانچے پر قمیض ڈال دی جاتی ہے تاکہ پرندے اسے انسان سمجھ کر اس سے ڈریں اور دور رہیں تو مجھے اس کا نام نہیں آتا تھا۔ پتہ چلا کہ اُردو میں اسے الگ الگ نام دیے جاتے ہیں۔ پنجابی میں اسے بڈاوا بھی کہتے ہیں اور کچھ اور بھی۔ اس طرح میں نے ایک لفظ بکھاہریال عورت میرے علم کے مطابق یہ پنجابی اصطلاح ہے مگر بہت سے پنجابیوں کو اس کا پتہ نہیں۔ اُردو میں اس کا متبادل ہراچک بتایا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت پاکستان میں زبان کی تحقیق کے معاملے میں سب سے بڑی سند مشفق خواجہ اور شان الحق حقی ہے۔ میں اکثر و بیشتر اُنہی سے سند لیتا ہوں۔

س اب آپ کے ہاں لفظوں میں اختراعی پہلو بہت زیادہ ہے جو پہلے نہیں تھا۔ آپ لفظوں سے یہ تخریب کاری کیوں کرتے ہیں؟

ج لفظوں سے کھیلنا پرانی عادت ہے۔ اودھ پنچ والے یہی کرتے تھے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ صرف لفظوں کا کھیل نہ ہو بلکہ ساتھ فکر بھی ہوتا کہ ہنسنے کے ساتھ ساتھ قاری کچھ سوچے بھی۔ اس طرز میں جو میرے نظریات جھلکتے ہیں ان کو ایک عام آدمی کے نظریات سمجھیں۔ میں کتابوں کا عاشق ہوں۔ میری لائبریری میں دس ہزار سے زائد کتب ہیں۔ مطالعے کا عاشق ہوں مگر میں ہر کتاب کو فرض سمجھ کر نہیں پڑھتا بلکہ جو پسند نہ آئے اسے پڑھتا ہی نہیں۔

س طنز ومزاح کے ساتھ آج کے قاری کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟

ج یہ تو قارئین بتائیں گے ہم تو لکھتے جا رہے ہیں۔ میرے مشاہدے کے مطابق کراچی، لاہور اور لندن کے اُردو کے قارئین میں یہ صنف کافی مقبول ہے۔ سنجیدہ نثر سے مزاحیہ نثر زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ شاید اسی وجہ سے گزشتہ دنوں کراچی میں مجھ سے ایک مصور نے اپنی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کرایا کہ میری وجہ سے لوگ زیادہ آئیں گے۔

س آپ کی نئی تصنیف کب آ رہی ہے؟

ج نئی کتاب تیار ہے۔ مگر میں کتاب لکھ کر تین چار سال تک پڑی رہنے دیتا ہوں اور پھر اس کی خواندگی کر کے خامیاں دور کرتا ہوں۔ سو یہ کتاب آج کل اسی مرحلے میں ہے۔

س آپ نے کس سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا؟

ج میری والدہ میمک تھیں یعنی دوسروں کے لہجے کی بڑی اچھی نقل کر لیتی تھیں۔ وہیں سے مجھے تحریک ملی اور جب کبھی آ جائے تو آتی ہی چلی جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔

س شاعروں میں افتخار عارف بہت متاثر کر رہا ہے۔ جب کہ عطاء الحق قاسمی سے اچھا کالم کوئی نہیں لکھ رہا۔ زبان وبیان کی تحقیق میں شان الحق حقی اور مشفق خواجہ سب سے نمایاں ہیں۔

س آپ کا اپنے فن کے معیار کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج مجھے اپنے بارے میں کوئی مغالطہ نہیں۔ مکمل نئی تخلیق کوئی نہیں کر سکتا۔ ہر بات پہلے ہو چکی ہوئی ہے۔ بس اس کو ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں لکھ رہا ہے۔ میرا تخلیقی سیکرٹ یہ ہے کہ جب میں کسی موضوع پر لکھتا ہوں تو پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ لوگ اس پر کیسے لکھتے ہیں۔ پھر

میں یہ کرتا ہوں کہ ان کے اسالیب کو نظر انداز کر کے نیا پن لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی میں اس میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو کبھی ناکام۔ میں پہلے سامعین میں اپنی تحریریں سناتا نہیں تھا پھر سنانا شروع کر دیا۔ میں نے ٹی وی کے لیے بھی کچھ نہیں لکھا۔ ویسے اگر نثر میری ہی طرح پڑھ کر سنائی جائے تو اس کا انجام بھی آج کل کے مشاعروں جیسا ہی ہوگا۔ پہلے مشاعروں کے لیے شاعر اپنی سطح سے گفتگو کرتا تھا اب وہ یہ دیکھتا ہے کہ لوگ اس کو کیسے لیں گے۔ پھر وہ ویسا ہی لکھتا ہے۔ اس سے معیار میں کمی آئی ہے۔ صرف لوگوں کی پسند کا خیال رکھ کر تیار کی جانے والی چیز کی عمر کم ہوتی ہے۔ سو میں جب لکھتا ہوں تو قاری کے ردعمل کی پروا نہ کرتے ہوئے لکھتا ہوں۔ البتہ کہیں کچھ سنانا ہو تو پھر کچی بات ہے کہ میں سامعین کا کچھ خیال کر کے لکھتا ہوں اور یہ ہر شہر کے لیے الگ الگ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو چیزیں دوحہ میں پسند کی جائیں ضروری نہیں کہ وہ ساہیوال میں بھی کامیاب رہیں۔

س آپ اپنی کتابوں میں تصویر کیوں نہیں دیتے؟

ج ''چراغ تلے'' کے پہلے ایڈیشن میں تو دی تھی پھر نہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میں کہ اپنی تصویریں سنبھال کر رکھتا ہی نہیں۔ سوغات میں میرے لیے خصوصی گوشہ شائع کرنا تھا مگر ان کو اپنی تصویر فراہم نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گوشہ تو شائع ہوا مگر اس کا اداریہ میرے خلاف لکھ دیا گیا۔ فوٹوگرافی حالانکہ میرا شوق ہے مگر میں صرف تصویریں کھینچتا ہوں، کھنچواتا نہیں۔ اس حوالے سے میں نے ایک بار لکھا بھی تھا کہ اپنی صورت دیکھ کر خدا پر میرا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ میں نے آخری تصویر غالباً 1976ء کی کھنچوائی ہوئی ہے۔ بعد میں نہیں کھنچوائی۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ قرۃ العین حیدر کی طرح میں بھی اپنی تصویر دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ (قرۃ العین بھی نئی تصویر نہیں بنواتی بلکہ کتاب پر پرانی تصویر ہی دے دیتی ہیں) مگر عورتوں کو بہرحال اس طرح کے حربوں کا حق حاصل ہے۔

محسن مگھیانہ، ڈاکٹر

اردو ادب کی روایت رہی ہے کہ نوواردان اپنے فنی سفر کا آغاز عموماً شاعری، مضامین نویسی یا پھر کہانی وناول نویسی سے کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا یہ منفرد اعزاز ہے کہ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مزاحیہ آپ بیتی کی اشاعت سے کیا۔ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل سرجن ہیں مگر عموماً ادب کے قارئین انہیں پی ایچ ڈی ڈاکٹر سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول بیرون ملک مقیم پاکستانیوں میں ان کے متعلق یہ غلط فہمی زیادہ عام ہے کہ وہ طبیب نہیں بس ادیب ہیں۔ ان کی اب تک گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مزید کتب پر ان کا کام جاری ہے۔ ایک قومی روزنامہ اخبار میں مستقل کالم بھی لکھتے ہیں۔ ان کا اصل نام نیاز علی خاں مگھیانہ ہے۔ مگر ادبی حلقوں میں اپنے قلمی نام محسن مگھیانہ کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش 1956ء میں پنجاب کے تاریخی شہر جھنگ میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اپنا مستقل قیام بھی اپنے آبائی شہر میں ہی رکھا۔ ادب اور ادب کے متعلق کئی قومی اور عالمی اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ حال ہی میں ہونے والی مختصر سی غیر رسمی گفتگو ''ارژنگ'' کے قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

س روایتی تعلیم تو آپ نے میڈیکل کے شعبے سے حاصل کی مگر آپ کی وجہ شہرت ادبی شعبہ بنا۔ سب سے پہلے تو ان دو مختلف شعبوں جنہیں متضاد بھی کہا جا سکتا ہے، اپنے تعلق کے متعلق ہمیں بتائیں؟

ج لکھنا تو میں نے آٹھویں جماعت سے ہی شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں میں بچوں

کے اخبارات کے علاوہ کوہستان، مشرق اور جنگ میں بچوں کی کہانیاں اور لطیفے وغیرہ لکھ کر بھیج دیا کرتا تھا۔ مشق سخن تو تب سے جاری ہے۔ اس وقت مجھے یہ تو نہیں پتہ تھا کہ میں ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ ان دنوں ٹیلی فون اتنا عام نہیں تھا اور انٹرنیٹ ابھی آیا نہیں تھا۔ قلمی دوستی کا دور تھا۔ نویں جماعت میں تھا جب ہم نے سولہ صفحات پر مشتمل رسالہ ''شہید'' شروع کیا۔ مجھے گھر سے جو بھی پیسے ملتے سب کے سب انہی کاموں میں خرچ ہو جاتے تھے۔

س کالج کا زمانہ کیسا تھا؟

ج گورنمنٹ کالج جھنگ سے میں نے ایف ایس سی کی تھی۔ کالج میں داخل ہوا تو میگزین کا ایڈیٹر بن گیا۔ کارواں کے نام سے شائع ہونے والا یہ بڑا بھرپور پرچہ تھا۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ گورنمنٹ کالج جھنگ وہی کالج ہے جہاں سے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام نے تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے اپنے دور میں یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

س آپ اپنی کتابوں کی تفصیل قارئین کو بتانا پسند کریں گے؟

ج میری پہلی کتاب تو مزاحیہ آپ بیتی تھی جو ''انوکھا لاڈلا'' کے نام سے شائع ہوئی تھی اور جس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کے بعد ''بھنبھیری'' کہانیوں کی کتاب تھی جو پنجابی اور ہندی میں شائع ہوئی۔ طنز و مزاح کی کتاب ''چھیڑ خانی'' اردو میں شائع ہوئی۔ اسی طرح ''دیسی ان ولایت'' میرا سفرنامہ تھا۔ ''مسئلہ ہی کوئی نہیں'' طنز و مزاح پر مبنی میرے کالموں کا مجموعہ۔ اسی طرح انیندرے، ٹھکیلیاں، چنتا، الف میم (حج کا سفرنامہ) یہ کیسی محبت ہے، موتی رولن مرے، پنجابی ماہیئے کی کتاب ہے۔ حسن مصر، تیرے باجھوں اور خالی ہاتھ زیر طبع ہیں۔

س کیا آپ کی تخلیقات پر کوئی تحقیقی کام بھی ہوا ہے؟

ج اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں میری مزاحیہ آپ بیتی ''انوکھا لاڈلا'' کے موضوع پر ایم اے کا تھیسس ہوا ہے۔ یونیورسٹی کی فیکلٹی تو میری شخصیت اور فن پر پی ایچ ڈی اور ایم فل بھی کروانا چاہتی تھی مگر جس پر پی ایچ ڈی کرنا ہو اس شخصیت کا وفات پا جانا ضروری ہے اور

ایم فل طالب علم صرف اس ادیب پر ہی کر سکتے ہیں جو ساٹھ سال کی عمر سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے میں نہ تو فوت ہوا ہوں اور نہ ہی ساٹھ سال کے سنہری ہندسے کو پہنچا ہوں اس لئے ایم اے کی سطح پر ہی میرے فن پر کام ممکن ہے جو کہ ہو بھی چکا ہے اور مزید ہو بھی رہا ہے۔

س جھنگ سے آپ کا تعلق بڑا جذباتی محسوس ہوتا ہے، کیا کہیں گے اس پر؟

ج جھنگ ہیر رانجھا، مرزا صاحباں اور سلطان باہو کی سرزمین ہے۔ دوسری طرف جھنگ کے دو سائنسدانوں کو نوبل پرائز ملا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام اور راگ بنگ کھرانہ، اتفاق کی بات ہے کہ دونوں کو فزکس کے شعبے میں ہی انعام ملا ہے۔ ایسی متمول تاریخ اور روایات کا شہر جب آپ کا جنم استھان بھی ہو تو اس رشتے میں جذباتیت کا عنصر تو لازمی ہوگا۔

س آپ میڈیکل سرجن ہو کر ڈاکٹر عبدالسلام اور راگ بنگ کھرانہ کی روایت نبھا رہے ہیں اور شعروسخن کو رقم کر کے سلطان باہو کے قافلے میں بھی شامل ہیں۔ مگر یہاں رہتے ہوئے کبھی ادبی مراکز سے دوری کا احساس نہیں ہوا؟ میرا مقصد یہ ہے کہ میڈیا کے مراکز تو لاہور، کراچی، اسلام آباد ہیں؟

ج یہاں رہتے ہوئے میڈیا میں آواز پہنچانا تو واقعی بڑا مشکل ہے۔ حالانکہ ہمارے ہاں ٹیلنٹ اتنا زیادہ ہے کہ شعراء کی بڑی تعداد کے سبب ہمیں مشاعرہ کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں روٹری کلب کا صدر تھا تو مجھے انتظامیہ کے لوگ کہتے کہ شعراء کی تعداد کم کریں۔ مگر میں اپنی معذوری ظاہر کرتا کہ یہ سبھی سٹیج پر چڑھنے کے حقدار ہیں۔ باقی ہمارے میڈیا میں کوریج کے لئے ذاتی واقفیت ہونا ضروری ہے۔ یہ المیہ تو بہرحال ہے کہ مجید امجد سے لے کر عفت سلطان تک لائم لائٹ میں نہیں آئے۔ حال ہی میں ظفر سعید فوت ہوئے جو بڑے جاندار شاعر تھے لیکن کوریج سے محروم رہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ مجید امجد کو لائم لائٹ میں لانے کا سہرا بھی خواجہ محمد زکریا کے سر پر ہے۔ اگر خواجہ زکریا نہ ہوتے تو مجید امجد بھی شاید لائم لائٹ سے محروم رہتے۔

س ادیب کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہئے؟ کیا ہمارا ادیب اپنا سماجی کردار صحیح طور

پر نبھار ہا ہے؟

ج: ادیب بے چارہ تو اپنی طرف سے لکھ رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کا پیغام ہی عوام تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ المیہ یہ بھی ہے کہ معاشرے میں ادیب کو صحیح مقام اور عزت نہیں دی جا رہی۔ سماجی اعتبار سے دیکھیں تو ہمارے معاشرے کا رویہ بھی غیر مہذبانہ ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ انقلاب فرانس میں اتنے ادیب تھے اور انقلاب روس میں میکسم گورکی کے کردار سے لے کر تمام اس عہد کے اہل قلم کا انقلاب میں کلیدی کردار ہمارے سامنے تقابلی مقابلے کے لئے رکھا جاتا ہے۔

ارے بھائی! جس ملک میں کتاب کی تعداد ہی پانچ سو پر مشتمل شائع ہوگی، وہ کیا انقلاب لے آئے گی؟ خوش قسمتی سے میری کتابیں بکتی ہیں مگر اس کے باوجود اگر میں چاہوں کہ میری کتابوں کی مناسب انداز میں تشہیر و ترسیل ہو جائے تو شاید میں جو کچھ کماتا ہوں سب پبلشرز کی نذر ہو جائے۔ یہاں تو پڑھے لکھے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ میں نے ایک ڈاکٹر دوست کو اپنی کتاب پیش کی۔ انہوں نے کتاب پر سرسری نظر ڈال کر مجھ سے کہا کہ یار محسن!...... پنجابی کون پڑھے؟ آپ دیکھیں کہ ملالہ یوسف زئی کی کتاب لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوگی۔ لہٰذا اس کا اثر بھی اسی تناسب سے ہوگا۔ ہمارے ہاں تو چند گنے چنے منیر نیازی اور مشتاق یوسفی جیسے لوگ ہیں جن کی کتابیں کچھ نہ کچھ بکتی رہتی ہیں، باقی اہل ادب کے لئے تو قارئین تلاش کرنا ہی مشکل منزل ہے۔

نیلما ناہید درانی

س: سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے۔ عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟ ادب سے شوق کی ابتدا؟

ج: میں لاہور میں پیدا ہوئی۔۔۔امی کا خاندان لاہور میں برانڈرتھ روڈ پر رہتا تھا۔۔امی کے دادا حکیم محمد ذکریا انجمن حمایت اسلام طبیہ کالج کے پرنسپل تھے۔۔۔امی کے والدین ان کے بچپن میں وفات پا گئے تھے ان کی پرورش ان کے دادا اور دادا کے بعد ان کے چچا نے کی تھی۔۔۔شادی بھی چچا نے کروائی۔۔۔

میرے والد کا خاندان امرتسر سے لاہور آیا تھا۔۔پاکستان بننے کے بعد۔۔۔

میرے دادا مولانا آغا نعمت اللہ جان درانی۔۔۔خطیب اہلبیت تھے ان کا تخلص احقر امرتسری تھا۔۔۔ان کی کتابیں چھپ کر گھر میں آتی ہیں۔۔

"شان عزا" اور "یاد حسینؑ" ان کی دو کتابوں کے نام ہیں۔۔۔

میرے والد آغا اعجاز حسین درانی کو شاعری، افسانہ نگاری اور مصوری سے لگاؤ تھا۔۔۔امرتسر میں اے حمید اور سیف الدین سیف سے دوستی تھی۔۔۔وہ گفتگو کے دوران اقبال، غالب کے اشعار پڑھا کرتے جو بچپن میں ہی ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہو گئے تھے۔گھر میں کتابوں کی فراوانی تھی۔۔۔بہت سارے رسائل بھی آتے تھے۔ہمیں ہر ماہ بچوں کی دنیا، تعلیم و تربیت، ہدایت لے کر دیے جاتے۔۔۔ان دنوں گلی محلوں میں آنا لائبریری بھی ہوتی تھی۔۔ہم وہاں سے لا کر بھی کتابیں پڑھتے۔۔۔یوں والد اور دادا نے ہمیں مطالعہ کرنے کے ساتھ لکھنے کی ترغیب بھی دی۔۔۔پہلی کہانی ماہنامہ ہدایت میں

چھپی جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔۔۔رسالہ کے ایڈیٹر جناب نظر زیدی تھے۔۔۔پہلی نظم 1965 کی جنگ کے بارے میں لکھی۔۔۔

پہلا مشاعرہ۔۔۔ریڈیو پاکستان لاہور کے ہفتہ اطفال کے مشاعرے میں پڑھا۔۔جس کی صدارت صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے کی۔۔۔پروگرام کے پروڈیوسر بشیر زیدی اسیر تھے۔۔۔۔

پہلا بڑا مشاعرہ سکول کے زمانے میں ہی ایمبیسڈر ہوٹل لاہور میں پڑھا جس کا اہتمام مشیر کاظمی نے کیا تھا۔۔۔صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ علاوالدین صدیقی کی تھی

س: اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج: میری پہلی کتاب 1986 میں شائع ہوئی۔۔۔"جب تک آنکھیں زندہ ہیں"

2۔۔جب نہر کنارے شام ڈھلی۔

3۔تمہارا شہر کیسا ہے

4۔۔واپسی کا سفر

5۔۔قطرہ قطرہ عشق

6۔۔چانن کتھے ہویا۔پنجابی شاعری

7۔۔دکھ سجایہ جگ۔پنجابی شاعری

8۔۔اداس لوگوں سے پیار کرنا۔۔

9۔۔راستے میں گلاب رکھے ہیں۔۔

10۔۔جنگل جھیل اور میں

11۔۔چڑھدے سورج دی دھرتی۔۔سفر نامہ جاپان

12۔۔چاند، چاندنی، چندی گڑھ۔۔۔سفر نامہ بھارت

13۔۔ٹھنڈی عورت۔۔افسانے

14 -- بلجیم میں بیس دن -- افسانے

15 -- عقیدت (نعت، سلام، مرثیہ)

س آپ نثر نگار بھی ہیں۔شاعر بھی ---شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج مجھے اچھی تحریر پڑھنا اور لکھنا مرغوب ہے۔خواہ وہ شاعری کی صورت میں ہو یا نثر میں ---شاعری، مصوری، مجسمہ سازی، کہانی کاری یہ سب فنون لطیفہ کی مختلف اقسام ہیں ---افکار کے بہتے ہوئے دھارے کو جو بھی اظہار یہ ممکن ہو وہ اس میں ڈھل جاتا ہے --- مجھے شعر کہنا اس لیے پسند ہے کہ کم الفاظ میں بڑا موضوع بھی ایک شعر میں بیان کیا جا سکتا ہے ---شاعری کے لیے وقت جگہ کی پابندی بھی نہیں ہوتی --- جبکہ نثر لکھنے کے لئے جگہ اور زیادہ وقت درکار ہوتا ہے ---شاعری میں اثر آفرینی بھی زیادہ ہے ---اسے ساز اور آواز کے ذریعے عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے

س الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جارہا ہے؟؟

ج الیکٹرک میڈیا ہی صرف کتاب سے دوری کی وجہ نہیں ہے --- کتاب کا مہنگا ہونا اور عام آدمی کی دسترس سے باہر ہونا بھی ایک وجہ ہے --- جن ممالک نے الیکٹرک میڈیا کی بنیاد رکھی وہ تو کتاب پڑھتے ہیں --- ہر محلے میں لائبریری موجود ہے --- جہاں ہر عمر کے لوگوں کے لیے الگ الگ سیکشن ہیں --- خاص طور پر بچوں کے حصے کو بچوں کے لیے پرکشش بنایا جاتا ہے -- بچوں کی ممبر شپ بھی ہوتی ہے --- وہ کتابیں گھر بھی لے جا سکتے ہیں --- اگر پاکستان میں بھی اس طرح لائبریریاں ہوں تو کتاب سے دوری ختم ہو سکتی ہے ---

پبلشرز نے بھی رنگین سرورق والی مہنگے کاغذ پر کتاب چھاپ کر اسے عوام سے دور کر دیا ہے --- منٹو، کرشن چندر۔ راجندر سنگھ۔ منشی پریم چند اور جتنا بھی ادب ہم نے پڑھا وہ نیوز پرنٹ پر چھپی ہوئی -- پیپر بیک جلد والی نہایت سستی کتابیں ہوتی تھیں --- اب کتاب صرف دیکھنے یا شیلف میں سجانے کی چیز بن گئی ہے

س تخلیقیت کیا ہے؟ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیق وہ واردات ہے جو کسی حساس انسان کے ذہن و دل پر اس کے اردگرد ہونے والے واقعات۔حادثات اور اثرات کے نتیجے میں اس کے قلم سے وجود میں آتی ہے۔۔۔دنیا میں آنے والا ہر انسان اپنے اردگرد کے حالات۔موسم۔زندگی کی خوشیوں۔غموں۔۔سیاسی اور جغرافیائی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے۔۔۔مگر ایک فنکار کا قلم۔۔اس کا برش ان لمحوں کو اپنے لفظوں یا رنگوں میں قید کر لیتا ہے۔۔۔۔اس کو تخلیق کہا جاتا ہے۔۔۔
اچھا تخلیق کار وہی ہے جس میں کوئی انفرادیت ہو۔۔۔وہ اپنی الگ ڈکشن لے کر اپنی الگ پہچان بنا سکے

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں آ گئے آنسو
خوشی کے ساتھ یہ غم کا حصار کیسا تھا۔۔۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج کچھ عرصہ سے محسوس ہو رہا ہے کہ ہر شعبہ میں غیر سنجیدگی کی فضا ہے۔۔۔۔کچھ لوگ فیشن کے طور پر اس شعبہ میں آ گئے ہیں۔۔۔ان کا نظریہ شہرت حاصل کرنا ہے۔۔۔کچھ گروہ بندیاں ہیں۔۔۔اصل نقل کی پہچان ختم ہو گئی ہے۔۔۔نیا منظرنامہ عجیب سا ہو گیا ہے۔۔۔لیکن کہیں کہیں کبھی کبھار بہت سنجیدہ مشاعرے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔۔۔۔جیسے میاں چنوں میں آپ کے زیر اہتمام ہونے والا مشاعرہ ایک یادگار مشاعرہ تھا جو فجر کی اذان تک جاری رہا اور ہزاروں کی تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔معیاری اور خوبصورت شاعری پیش کی گئی۔۔۔ایسے مشاعرے اب خال خال ہی دیکھنے سننے کو ملتے ہیں

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟معاشرے سے؟یا

اندرون سے؟

ج دونوں سے۔۔۔شاعر اور ادیب اپنے قلبی، باطنی اور بیرونی۔موسمی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، ناگہانی واقعات سے تحریک لیتا ہے اور ان کو اپنی تحریر میں ڈھالتا ہے

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا ایک اچھا ذریعہ ہے۔۔ادب کے فروغ کے لیے۔۔۔اس کی وجہ سے ہم اپنی بات اپنی تحریر اپنی تخلیق دنیا کے ہر کونے میں موجود لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔۔۔۔لیکن یہاں بھی کچھ غیر سنجیدہ لوگ۔۔۔اقبال یا مختلف اساتذہ کے نام سے منسوب بے وزن اور بے تکے اشعار پوسٹ کر رہے ہیں۔۔۔جو ادب کی بجائے بے ادبی پھیلا رہے ہیں۔۔۔ادبی سرقہ بھی بڑھ گیا ہے۔۔۔کچھ لوگ اصل شاعر کے نام کی بجائے۔۔۔کسی کی بھی شاعری لگا کر داد وصول کرتے ہیں۔۔۔جب انہیں احساس دلایا جائے تب بھی شرمندہ نہیں ہوتے

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج تخلیق کار کی ہر تخلیق اس کے ذاتی تجربات مشاہدات، محسوسات اور واقعات ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔۔۔اس میں زیب داستاں کے لیے رنگ بھرے جا سکتے ہیں کچھ تصوراتی کردار اور واقعات بھی گھڑے جاتے ہیں۔۔۔لیکن ہر تخلیق اپنے خالق کے تجربات و مشاہدات کا ہی مظہر ہوتی ہے

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج یہ بڑا دلچسپ سوال ہے۔۔۔کیا کھویا کیا پایا؟۔۔۔میں نے زندگی کے ہر لمحے سے، ہر انسان سے، ہر واقعہ سے کچھ نا کچھ سیکھا ہے۔۔۔کسی دکھ نے مجھے شعر دیا ہے۔۔۔کسی واقعے نے کہانی۔۔۔لہٰذا میں نے کبھی کچھ کھویا نہیں ہمیشہ پایا ہی ہے۔۔۔

ناز بٹ

س: سب سے پہلے تو اپنے ادبی اور سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے۔

ج: میرا تعلق کراچی اور لاہور دونوں شہروں سے ہے، 15 اکتوبر کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کراچی سے حاصل کی، سینٹ پیٹرکس کالج سے انٹر سائنس، کراچی یونیورسٹی سے گریجوایشن کرنے کے بعد لاہور سے ایم اے انگلش کیا، نہایت ادبی ماحول میں پرورش ہوئی۔ والد صاحب شاعر تھے اور پیشے کے اعتبار سے انجینئر جبکہ والدہ درس وتدریس کے شعبہ سے وابستہ تھیں۔ والد صاحب انتہائی باذوق شخصیت کے مالک تھے، انہیں عربی اور فارسی پر بھی عبور حاصل تھا اور اقبال سے عشق بھی...... سو نہایت غیر محسوس طریقے سے انہوں نے اقبال کو ہماری زندگیوں میں شامل کر دیا، یوں سمجھیں کہ اسکول کی کتابوں کے ساتھ ساتھ بانگِ درا، بال جبریل، ارمغان حجاز، شکوہ جوابِ شکوہ، پیامِ مشرق اور جاوید نامہ کے درمیان آنکھ کھولی۔ والدہ شام میں ہمیں اسکول کے ہوم ورک کی تیاری کرواتی تھیں جبکہ رات کو والد صاحب ہوتے تھے، اقبال اور ہم بہن بھائی...... وہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے ایک ایک مصرع کی تشریح اور تفسیر ہمیں اس طرح سمجھاتے تھے کہ ازبر ہو جاتا اور میرا دل کرتا تھا کہ یہ سیشن کبھی ختم نہ ہو۔ مصوری سے میری دلچسپی بھی والد صاحب کی طرف سے وراثت میں ملی۔

ذہین طالبہ رہی، اسکول اور کالج کے زمانے میں نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اسکول کالج کی نمائندگی بھی کرتی رہی اور انعامات بھی حاصل کئے۔ اردو انگریزی تقریری مقابلوں میں بھی اپنے کالج کی نمائندگی کرتی رہی، ایتھلیٹ بھی تھی، والدہ

کی خواہش پر کراٹے کلاسز جوائن کیں اور بلیو بیلٹ حاصل کی۔

ادب سے لگاؤ کے بارے میں بتایئے، کب سے شعر کہہ رہی ہیں اور با قاعدہ شاعرہ ہونے کا احساس کب ہوا؟

ادب سے لگاؤ کا کیا کہا جائے...... آپ کو بتایا کہ اٹھان ہی ایسے ماحول میں ہوئی۔ کتابوں سے محبت کرنا ہماری گھٹی میں شامل تھا۔ والد صاحب شاعر تھے سو نہ صرف شاعری کا جنون ان کی طرف سے میرے خون میں شامل ہے بلکہ مصوری کی صلاحیت بھی والد صاحب ہی کی طرف سے ہی منتقل ہوئی اور جہاں تک بات ہے شعر کہنے کی تو کچھ پتہ نہیں کب سے شعر کہہ رہی ہوں، میرا سارا بچپن، لڑکپن تعلیمی دور سمندر کی لہروں سے عشق میں گزرا، آٹھ دس دن بعد سمندر کی سیر کو جانا معمول تھا۔ سب گھر والے سمندر انجوائے کرتے تھے اور میں سمندر سے کچھ فاصلے پر کھڑی سمندر کی اداسی، خموشی اور تنہائی اپنے اندر اتارا کرتی تھی۔ مجھے چپ سی لگ جاتی تھی سمندر کو دیکھ کر، یہ کیفیت آج بھی اسی طرح ہے۔ آج بھی سمندر سے والہانہ عشق ہے۔ خیر بات اسکول کے دور کی ہو رہی ہے تو میں واپس جا کر اپنی ساری کیفیت کو اپنی ڈائری میں اتار کر آنکھیں موند لیا کرتی تھی، احساس بھی نہیں تھا کہ کیا لکھا، کیوں لکھا، بس لکھنے کی بے چینی اور لکھنے کے بعد سکون...... پھولوں، تتلیوں، تاروں کی باتیں، خوشبو سے عشق...... تمام سرگوشیاں ڈائری سے۔

والد صاحب نے ایک دن ڈائری دیکھی تو محبت سے ماتھا چوم لیا۔ درحقیقت ڈائری میں اپنی کیفیات سے میں ٹوٹی پھوٹی نظمیں تشکیل کیا کرتی تھی جس کا مجھے ادراک تک نہیں تھا، میری اس ڈائری کے کچھ صفحات آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

میر، درد، غالب، آتش، حسرت کو اسکول کے زمانے میں پڑھا اور خوب پڑھا۔ بلکہ ایک ایک شعر کی چار چار صفحات پر تشریح کر کے ٹیچر کو حیران کرنا معمول تھا۔ اچھا لگتا تھا جب وہ کہتی تھیں ناز تمہارے اندر ''شاعری کے جراثیم'' بہت زیادہ ہیں۔ بس تو پھر غیر ارادی طور پر اشعار بھی ہو جاتے۔ اس وقت قافیئے اور وزن کی تو اتنی سمجھ نہ تھی لیکن معصومیت کا یہ حال تھا

کہ ذہن میں ایک ردھم سی بنا کر یہ خیال رکھتے ہوئے کہ ردھم میں سانس ٹوٹنے نہ پائے۔ صرف ردیف کی پابندی کے ساتھ پانچ چھ اشعار کہہ کر اپنے تئیں خود کو بڑی شاعرہ تصور کر لیا جاتا کہ چلو جی ''غزل'' ہو گئی۔ فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لیا تو والد صاحب ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ گئے، دنیا اندھیر ہو گئی اور یوں ہوا کہ پھول، خوشبو اور سمندر کے حسن کی جگہ آنسوؤں اور آہوں اور سسکیوں نے لے لی۔ غم کی شدید کیفیت میں غزل ہوئی جس کا ایک شعر جسے میں اپنا پہلا باقاعدہ شعر مانتی ہوں

''زندگی شام الم کی وسعتوں کا نام ہے
زندگی بے درد کانٹوں کے سوا کچھ نہیں''

کبھی کبھار اپنی کوئی نظم اخبار میں بھی بھیج دیا کرتی تھی۔ فیض، میرا، نون میم راشد، فراز، امجد اسلام امجد صاحب، ناصر کاظمی اور پروین شاکر کی شاعری سے عشق ہوا جو آج بھی اسی طرح ہے۔ محسن نقوی کو بہت پڑھا، ساغر صدیقی کو پڑھ پڑھ روتی تھی۔ پروین شاکر اور امجد اسلام امجد کی نظمیں میرے اندر بستی ہیں.........وقت کے ساتھ ساتھ شاعری کا جنون بھی پروان چڑھتا رہا اور نکھار بھی آتا گیا، موقر ادبی جرائد میں کلام چھپتا بھی آیا ہے۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے گا؟

ج حرف لفظوں میں اور لفظ شعروں میں کب ڈھلنے لگے پتہ ہی نہ چلا البتہ لفظوں کو سینت سینت کے رکھنے کا عمل ''وارفتگی'' کا موجب ٹھہرا۔ نظموں اور غزلوں پر مشتمل میرا شعری مجموعہ ''وارفتگی'' منظر عام پر آ چکا ہے جبکہ نظموں کا ایک مجموعہ پائپ لائن میں ہے۔

س شاعری کیا ہے؟ نظم یا غزل دونوں میں سے آپ سہولت کہاں محسوس کرتی ہیں اور اس سہولت کی وجہ؟

ج شاعری عطیہ خداوندی ہے، آمد ہے، ایسی عطا ہے جو خاص لوگوں کو ودیعت ہوتی ہے، رومنز تو شاعری کو الہام کا درجہ دیتے تھے......

شاعری بشر کے ذاتی، وجدانی المیہ کا بیان ہی تو ہے.........شاعری جیسے دیوار گریہ کی

تلاش......... یہ میرا عشق بھی ہے جنون بھی......... میرے اندر کی صداقتوں کے اظہار کا ذریعہ بھی......... میرے اندر کی سچائیوں کو کائنات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی بھی......... روح وبدن میں پھیلتی محبت کی سرشاری بھی اور قطرہ قطرہ زندگی سے زہر کشید کر کے......... رخصت کی راہ بھی اور احساسات و جمالیات کا اظہاریہ بھی......... وہ جو دل کے اندر اک دنیا ہوتی ہے نا، اس کا سکون بھی.........

میں سمجھتی ہوں کہ خیال اپنی ساخت ساتھ لاتا ہے، سوچ سمجھ کر یا ارادتاً کچھ نہیں ہوتا، بس کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی قرطاس پر بکھرتے بکھرتے نظم کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو کبھی دو مصرعوں میں آپ کے خیال یا کیفیت کی مکمل ترسیل ہو جاتی ہے۔ دراصل غزل دو کناروں کے درمیان کا سفر ہے......... جبکہ نظم سمندر کا سفر ہے جانے کب کہاں بہا لے جائے آپ کی کیفیت آپ کو......... آپ کب ڈوبتے ہو، کب ابھرتے ہو کچھ پتہ نہیں چلتا......... بس لہروں کے مدوجزر پر......... رواں! مزاج چونکہ نظم سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے سو سمندر کی لہروں کا سفر زیادہ سرشار کرتا ہے۔

اک بے کلی سی، اداسی، اضطراب، ہمیشہ ساتھ رہتا ہے لیکن جب میں اپنے اندر کی کیفیت کو لفظوں میں ڈھال لیتی ہوں تو اداسی کی کیفیت سے نکل آتی ہوں اور کئی دن تک اپنی تخلیق کے سرور میں رہتی ہوں۔

س: آپ نثر نگار بھی ہیں شاعر بھی، شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج: یہ تو بالکل ایسا ہی سوال ہے کہ گڑیا زیادہ عزیز ہے یا سلمان، منا!

س: آپ اخبار سے منسلک رہی ہیں ایک کامیاب مدیر رہی ہیں، اب یہ بتائیے کہ صحافت میں دلچسپی کب اور کیسے ہوئی؟ کالم لکھنے کب شروع کیے؟

ج: شعیب بن عزیز صاحب نے خاصا زور دیا کالم لکھنے پر کہ آپ کی نثر بہت اچھی ہے، کالم لکھا کریں۔ گھر سے بھی یہی آواز تھی۔ سعید آسی صاحب نے کالم لکھنے کی ترغیب بھی دی اور تحریک بھی، نوائے وقت میں کالم لکھنے شروع کر دیئے۔ صحافت میں کچھ خاص دلچسپی تو نہ

تھی لیکن بس باتوں باتوں میں ہی اخبار سے منسلک ہوگئی۔ سنڈے میگزین کی مدیر کی ذمہ داری سنبھال لی اور اپنے مزاج میں نفاست اور پرفیکشن کی وجہ سے بہت کامیاب بھی رہی کیونکہ کمٹمنٹ اور معیار پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

س آپ کو بطور خاتون لکھاری میدان ادب میں کس قسم کی مشکلات درپیش آئیں؟ اگر ایسا ہے تو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

ج ایک تو عورت ہونا.......... اس پر اس کا تخلیق کار ہونا اور وہ بھی بغیر کسی ''استاد'' کے...... مشکلات کا باعث تو بنتا ہی ہے۔ دراصل ہمارے معاشرے میں مردوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو عورت کو اسیر دیکھنے میں ہی اپنی ذہنی تسکین حاصل کرتا ہے، کجا وہ عورت ان کو کسی خاطر میں ہی نہ لائے.........!

اللہ کا شکر ہے کہ مجھے گھر سے تو کبھی بھی کسی قسم کی رکاوٹ یا مشکلات کا سامنا نہیں ہوا اور باہر کی مشکلات کو میں کسی گنتی میں اس لئے شمار نہیں کرتی کہ میری اپنی ایک سوچ ہے، مزاج، شعور اور معیار، میرے اپنے کچھ اصول بھی ہیں۔ میں اپنے مزاج کے خلاف کبھی نہیں جاتی اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتی۔ اللہ پاک نے اچھے برے کی تمیز دی ہوئی ہے، الحمد اللہ! جو راستہ پسند نہ آئے وہاں ٹکراؤ کرنے کی بجائے خوشی سے پیچھے ہٹ جاتی ہوں۔ شہرت کے بجائے ہمیشہ اپنی عزت اور وقار کو ترجیح دی۔

اکثر سنتی ہوں کہ تخلیق کار صرف تخلیق کار ہوتا ہے مرد یا عورت نہیں..... یعنی gender کی تخصیص نہیں..... لیکن میں ایک پل کے لئے بھی اپنے عورت ہونے کو نظر انداز نہیں کر پائی......... اور مجھے فخر بھی ہے اپنے عورت ہونے پر اور الحمد اللہ جتنی عزت اور محبت اللہ پاک کے فضل و کرم سے مجھے ملی ہے اس کے لئے میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فن کار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟ دکھ کیا ہے؟ ذاتی؟ اجتماعی؟

ج: میں بنیادی طور پر محبت کی شاعرہ ہوں.........کومل اور لطیف جذبوں کی شاعرہ.........پھول، خوشبو، بادل، سردیوں کی بارش، سمندر، پہاڑ، خنک ہوائیں، فطرت کا حسن، محبت کی لطافت وسرشاری میرے ذوق جمالیات کی تسکین کرتے ہیں.........اور ایسے میں شاعری اترنے لگتی ہے، جتنی شدت سے کوئی کیفیت اترتی ہے اتنی ہی شدت سے وہ کیفیت قرطاس پر منتقل ہوتی ہے۔

لیکن یہاں بات چونکہ دکھ کی ہے تو اتنا ہی کہوں گی کہ چونکہ انسانی سرشت زود رنج واقع ہوئی ہے، اور اک شاعر کا احساس دوسروں کی نسبت زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ سو اسکی یہی حساسیت اس کے غم کو شدت بخشتی ہے اور غم کی یہ شدت اس کی شاعری کو جلا بخشتی ہے.........مشاہدہ تجربے سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے، تخلیق کار وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو ظاہر کی آنکھ نہیں دیکھتی.......سو "خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر!" کے مصداق دل بھیگتا ہے، لفظ رونے لگتے ہیں.......آنکھیں بین کرنے لگتی ہیں۔

بات چونکہ دکھوں کی ہو رہی ہے تو اتنا ہی کہوں گی کہ

دکھ بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں، دل میں پلتے، روح میں گھلتے، بدن میں پھیلتے، آنکھوں سے چھلکتے، قطرہ قطرہ پگھلتے دکھ!

دکھ.........جو شاعر کے لئے اثاثہ بھی ہیں۔ نعمت بھی۔ اس کے لفظوں کا حسن بھی اور شاعری کا نکھار بھی۔

سڑک کے کنارے چھوٹے بچے کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کا دکھ، کوڑے پر بکھری پڑی زینب کی آہ و پکار کا دکھ، مکتب میں خون میں لتھڑے ہوئے گلابوں کا دکھ، کہیں بوڑھے ماں باپ کے آگے ناخلف اولاد کی زبان داری کا دکھ، کبھی اپنے پیاروں کو اپنے سامنے سے جاتے ہوئے دیکھنے کا دکھ.........بوڑھے باپ کے کاندھے پر جوان بیٹے کی لاش کا دکھ، کشمیر، فلسطین، سریا کے مسلمانوں کا دکھ، اپنی عزت بچا کر دارالامان سے فرار ہونے والی سڑک پر بچھی ہوئی اس سولہ سالہ بچی کا دکھ جو بھیڑیوں سے فریاد کر رہی تھی کہ مجھے میرے گھر

بھیج دو..........آہ!

بعض اوقات غم کی شدت انسان کو پتھر کر دیتی ہے.....آنکھیں آنسوؤں سے ہی مکر جاتی ہیں، انسان کو درد کا احساس ہی نہیں ہوتا.......... وجود سُن.......... کوئی درد..........درد ہی نہیں لگتا، بلا کی حسیاسیت ہے میرے اندر.......... جو عام زندگی میں نقصان تو پہنچاتی ہے مجھے، لیکن میرے قلم کو طاقت بھی دیتی ہے..........اور لفظوں کو شدت عطا کرتی ہے۔

س ادب میں تنقید و تحقیق کی کیا اہمیت ہے، فروغ ادب کے لئے تنقید کہاں تک کار آمد ہو سکتی ہے؟

ج آج کل کے اکثر تنقیدی رویے سطحی ہیں، سامنے والے کو نیچا دکھانے کے لئے تنقید کا سہارا لے لیا جاتا ہے، اصل تنقید سے مراد ایسی صحت مند تنقید ہے جس میں اصلاحی پہلو نمایاں ہو، صحت مند تنقید تخلیق کار کے فن کو جلا بخشتی ہے۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل شاعری کے نام پر جو کچھ مشاعروں میں پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟ اور یہ بھی بتایئے کہ مشاعروں اور تقریبات میں کم کم شریک ہونے کی کوئی خاص وجہ؟

ج اس سوال کے جواب میں تو پوری کتاب لکھ سکتی ہوں مختصراً یہی کہ نہیں میں مطمئن نہیں ہوں۔ حالانکہ میں نے بے شمار کل پاکستان اور بین الاقوامی ''معیاری'' مشاعروں میں شرکت کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹی وی چینلز کے مشاعروں میں بھی شرکت کی ہے۔ پڑوس ملک بھارت میں بھی پاکستان کی نمائندگی کر چکی ہوں لیکن دو تین سالوں سے بہت تبدیلی آ گئی ہے۔ زیادہ تر مشاعرے اب سنجیدہ شاعری کا پلیٹ فارم ہی نہیں رہے۔ خود نمائی، خود ستائشی اور ڈرٹی پالیٹیکس کا شکار ہو چکے ہیں، شارٹ کٹس سے راتوں رات مشہور ہونے کے لئے مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے جا رہے ہیں، یہ سب کچھ دیکھ کر میں پیچھے ہٹ گئی، شکر میرے مالک کا کہ میرا یہ مزاج نہیں، میں کبھی بھی کسی بھی قسم کی دوڑ میں شامل نہیں

رہی، کوئی لالچ کوئی ہوس نہیں۔ ہوس چاہے دولت کی ہو یا شہرت کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے.......... انسان ایک اندھی دوڑ میں شامل ہو جاتا ہے اور الحمدللہ مجھے آنکھوں کھول کے چلنے کی عادت ہے اور ویسے بھی اہمیت تو ہمارے لفظوں کی ہے۔ یہی لفظ ہماری پہچان ہیں، ہمارے بعد ہمارے لفظوں نے ہی زندہ رہنا ہے۔

س لاہور رائٹرز کلب کے بارے میں بتائیے۔

ج تین برس قبل شعیب بن عزیز صاحب کی سرپرستی میں ''لاہور رائٹرز کلب'' کے نام سے ہم نے ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ تنظیم کا نام بھی شعیب صاحب نے تجویز کیا۔ لاہور رائٹرز کلب کے صدر قمر رضا شہزاد صاحب، نائب صدر فرحت پروین، سیکرٹری جنرل میں ہوں اور فنانس سیکرٹری وسیم عباس ہیں۔ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اپنے اس پلیٹ فارم سے ہم معیاری ادبی تقریبات کا انعقاد کر لیا کرتے ہیں۔ ہماری اس تنظیم کا مقصد گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف جینوئن تخلیق کاروں کی تخلیقات کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہے۔ ہم نے طے کر رکھا ہے کہ جو کام بھی کرنا ہے معیاری کرنا ہے۔

س آخر میں ایک ذاتی سا سوال کہ آپ نے اس سارے سفر میں کیا کھویا، کیا پایا؟ اور کیا زندگی سے مطمئن ہیں؟

ج زندگی نفع نقصان سے ماورا ہے اور قربان جاؤں اپنے اللہ کے کہ اس پاک ذات نے مجھے عزت، شہرت اور بے پناہ محبتوں سے نواز کر اک ذرے کو آفتاب کیا، یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے۔

وصی شاہ

ڈرامہ ''آہن'' سے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے وصی شاہ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا، تو بے جا نہ ہوگا وصی شاہ اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ اس نے جو بھی کام کیا قسمت نے اس کا بھرپور ساتھ دیا ابھی لوگ ڈرامہ آہن میں اس کے کردار کو نہیں بھولے تھے کہ اس کے شعری مجموعے ''آنکھیں بھیگ جاتی ہیں'' نے چھپ کر نہ صرف ملک گیر مقبولیت حاصل کر لی بلکہ فروخت کے نئے ریکارڈ بھی قائم کیے مگر وصی شاہ کی اب تک کی کامیابیوں کو محض ان کی خوش قسمتی کا مرہون منت قرار دینا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی خوش قسمتی اپنی جگہ وصی شاہ کی کامیابیوں میں اس کی محنت لگن اور خلوص کو بھی برابر کا دخل ہے جس کا اعتراف عہد حاضر کے نامور ادیب اور اساتذہ فن کر چکے ہیں۔

س ادب کی طرف کیسے آئے؟

ج مجھے شروع ہی سے موسیقی سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ گانوں کی دھنیں وغیرہ بنانے کے دوران مختلف شعراء کا کلام پڑھنے اور سننے کا اتفاق ہوا جس سے قدرتی طور پر لکھنے پڑھنے کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ اس لئے میرے خیال میں ادب کی طرف میں حادثاتی طور پر آیا۔

س عوام میں آپ کی پہلی پہچان بطور ڈرامہ نگار اور اداکار کے ہے اس کے بعد آپ کے پہلے مجموعے ''آنکھیں بھیگ جاتی ہیں'' نے فروخت کے ریکارڈ قائم کئے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کی شہرت میں ڈرامہ یا شاعری میں سے کس کا ہاتھ زیادہ ہے؟

ج اس حوالے سے میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا اللہ تعالی نے مجھے اس میں شہرت دی۔ جب ٹی وی پر میرا پہلا ڈرامہ سیریل ''آہن'' چلا تو لوگوں نے مجھے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار دونوں حیثیتوں میں سراہا۔ اس کے بعد جب میرا پہلا شعری مجموعہ ،، آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، شائع ہوا تو لوگوں نے میری توقع سے بڑھ کر بہت زیادہ پذیرائی کی ۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آج کل لوگوں میں میری پہچان کس حوالے سے ہے۔ تو میرے خیال میں لوگ مجھے بطور شاعر زیادہ پسند کرتے ہیں بہ نسبت ڈرامہ نگار اور اداکار کے۔

س آپ بیک وقت نثر نگار بھی ہیں اور شاعر بھی آپ کی پسندیدہ صنف کون سی ہے؟

ج میرا مسئلہ پہچان یا پیسہ نہیں ہے میں کام پر یقین رکھتا ہوں خواہ وہ کسی فیلڈ میں ہو۔ اس لئے لکھتے ہوئے کبھی طے کر کے نہیں لکھا کہ اس صنف ادب میں لکھوں۔ میرے خیال میں اظہار کی قوت یا تخلیق صنف ادب کا اپنے لئے خود تعین کر لیتی ہے۔ جب آپ پہلے سے طے کر کے لکھیں گے تو پھر وہ تخلیق اوریجنل نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مجھے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار کے لوگوں نے کافی سراہا میں ڈرامہ نگاری یا اداکاری کو ہی پکڑ کر نہیں بیٹھ گیا۔

س اپنے کام کے حوالے سے کسی سے باقاعدہ اصلاح لی؟

ج باقاعدہ طور پر تو میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ لیکن اپنے سینئرز کا کام دیکھ کر اور کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ باقی کچھ دوستوں سے مشاورت وغیرہ چلتی رہتی ہے۔ جس میں کام کے حوالے سے خامیوں کا پتہ چلتا رہتا ہے۔

س بطور ڈرامہ نگار آپ کے پسندیدہ رائٹر؟

ج ویسے تو سبھی لکھنے والے میرے لئے محترم ہیں اور میں ان سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہوں لیکن خاص طور پر ڈرامہ میں جو لوگ مجھے پسند ہیں ان میں اصغر ندیم سید، ڈاکٹر ڈینس

آرٹ ک،گلزار، امجد اسلام امجد اور نورالہدیٰ شاہ کے نام اہم ہیں۔

س اور بطور شاعر؟

ج بے شمار ہیں مثلاً فیض، ساحر لدھیانوی، ساغر صدیقی، احمد فراز، امجد اسلام امجد اور پروین شاکر۔

س اپنے ہمعصروں میں سے آپ نے کسی کا نام نہیں لیا؟

ج میرے خیال میں تقریباً سبھی اچھا لکھ رہے ہیں۔

س بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج اس کا جواب میں ایک شعر کی صورت میں دوں گا۔شاعر کا نام البتہ مجھے اب یاد نہیں شعر کچھ یوں

راستو کیا ہوئے وہ لوگ کہ آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

میرے خیال میں اس سلسلے میں دونوں دھڑوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے دونوں کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہئے۔ جونیئرز کو بڑوں کی عزت اور سینئرز کو جونیئرز کے ساتھ شفقت کا رویہ رکھنا چاہئے۔

س ادب میں گروہ بندیوں کو کیسا خیال کرتے ہیں۔

ج گروہ بندی کسی بھی حوالے سے ٹھیک نہیں۔خواہ ادب میں ہو یا سیاست میں۔

س آئندہ صدی میں غزل یا نظم میں سے کس کا مستقبل روشن ہے؟

ج جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے تخلیق صنف کی محتاج نہیں ہے۔جس تخلیق میں جان ہو گی وہ زندہ رہے گی خواہ وہ غزل ہو یا نظم۔

س ہمارے ہاں بین الاقوامی مسائل کے حوالے سے بہت کم لوگوں نے لکھا ہے اس کی وجہ؟

ج پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے ہاں ایسا کچھ ہے۔ دراصل ساری

بات زبان کی ہے۔ ہماری زبان چونکہ بین الاقوامی زبان نہیں ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ ہمارے ہاں تقریباً ہر موضوع پر لکھا جا رہا ہے۔ یہی سمجھا جا رہا ہے کہ جیسے ہم لوگ صرف اپنی ذات تک یا اپنے خطے تک محدود ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر اس بات کو کسی حد تک درست بھی مان لیا جائے تو اس کی بڑی وجہ ہمارے داخلی مسائل ہیں، ہم لوگ ابھی روٹی کپڑے کے مسائل سے ہی باہر نہیں نکل سکے۔ داخلی مسائل سے ہمیں فرصت ملے گی تو خارجی امور کی طرف توجہ دیں گے۔ وہ ایک محاورہ ہے نا کہ

تجھے پرائی کیا پڑی پہلے اپنی تو نبیڑ

س نثری نظم کو شاعری سمجھتے ہیں؟

ج میں نے چونکہ کبھی نثری نظم کہی نہیں ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ میں اس بارے میں رائے دینے کا کوئی استحقاق رکھتا ہوں یا شاید پھر اس طرح کسی کو بھی رائے دینے کا حق نہیں ہے۔ اس کا بہتر فیصلہ وقت کرے گا۔

س جدت کے نام پر ہمارے ہاں ادب میں فحش نگاری کا رجحان چل پڑا ہے۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

ج یقین کریں اس قسم کا کوئی لٹریچر مجھے پڑھنے کا اب تک اتفاق نہیں ہوا۔ ہمارے سینئرز کا لکھا ہوا ادب ہی اتنی زیادہ مقدار میں ہے کہ اسے پڑھنے سے فرصت نہیں ملتی۔
دوسری بات یہ کہ مجھے واہیات لٹریچر پڑھنے سے ویسے ہی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

س آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

ج ادب برائے زندگی میں سمجھتا ہوں کہ ادب برائے ادب وقت کا ضیاع اور نری بکواس بازی ہے۔

یاسر پیرزادہ

یاسر پیرزادہ کا شمار پاکستان کے مقبول ترین کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ بڑے مختصر عرصے میں انہوں نے بطور سنجیدہ تجزیہ کار اور اینکر پرسن اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ بحیثیت ڈرامہ نگار بھی کامیابی نے ان کے قدم چومے اور ان کے تحریر کردہ ڈرامے عوام سے سند قبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ادب و صحافت کے حوالوں کے علاوہ وہ ایک بیوروکریٹ بھی ہیں۔ پچھلے دنوں اس روشن دماغ اور ہمہ جہت باصلاحیت شخصیت سے گفتگو کرنے کا موقع میسر آیا۔ قارئین ارژنگ کی خدمت میں یہ بات چیت پیش کی جارہی ہے۔

س آپ کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ مگر ذاتی طور پر آپ کو یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ تحریر کو ہی ذریعہ اظہار بنانا چاہیے؟

ج تحریر کو ذریعہ اظہار بنانے کا خیال تو یوں آیا کہ میں بچپن سے اپنے والد صاحب کو کالم نگاری کرتے دیکھ رہا تھا اور گھر کا ماحول خاصا ادبی تھا۔ دوسری وجہ وہ نالائق کالم نگار تھے جن کی بری تحریروں کی وجہ سے میں نے احتجاجاً کالم نگاری شروع کر دی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر یہ نالائق کالم نگار لکھ سکتے ہیں اور ان کا کالم اخبار میں چھپ بھی جاتا ہے تو پھر میں یقیناً ان سے تھوڑا سا تو بہتر ہی لکھ سکتا ہوں۔ ویسے میں ان نالائق کالم نگاروں کا بہت شکرگزار ہوں انہوں نے مجھے بہت موٹیویٹ کیا۔

س عطاء الحق قاسمی صاحب سے ہماری ذاتی عقیدت مندی سے قطع نظر، اگر کوئی بھی شخص پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے چار، چھ کالم نگاروں کی فہرست بنائے تو یقیناً ترتیب کا فرق تو ہوسکتا ہے مگر ان کا نام ضرور شامل ہوگا۔ اتنے بڑے نام کی

موجودگی میں خوف محسوس نہیں ہوا کہ آپ Survive کر پائیں گے؟

ج ہاں! خوف تو موجود تھا اور ایک خوف اس سے بھی بڑا تھا کہ جب آپ اپنے اوپر یہ چیک لگا لیتے ہیں کہ لوگ جب یہ پڑھیں گے اور سوچیں گے کہ یہ قاسمی صاحب کے بیٹے کی تحریر ہے تو اس سے لکھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی دوسرا شخص لکھنا چاہیے تو اس کے لیے یہ نسبتاً آسان تک ہوگا۔ مگر اس کا ایک فائدہ بھی ہے کہ جب آپ اپنے اوپر ایک کوالٹی چیک لگا لیتے ہیں تو پھر بہتر سے بہتر تحریریں سامنے آتی ہیں۔ باقی یہ اللہ تعالٰی کی دین ہے جس کو وہ عطا کر دے۔

س آپ ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ کالم نگار، دانشور، ادیب، ڈرامہ نگار اور بیوروکریٹ، آپ کو اپنا کون سا تعارف زیادہ پسند ہے؟

ج مشکل سوال ہے۔ مگر آسان جواب یہ ہے کہ بطور کالم نگار۔ ویسے تو اگر نوکری بھی تہذیب اور ایمانداری سے کی جائے تو وہ بھی باعث اطمینان ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس ملک میں جو تھوڑی بہت شناخت ملی ہے وہ کالم نگاری نے دی ہے۔ اس لیے یہ تعارف مجھے زیادہ عزیز ہے۔

س اپنی پہلی تحریر کے بارے میں بتائیے جس کے متعلق آپ کا خیال ہو کہ اسے کسی کو سنانا چاہیے یا چھپوانا چاہیے؟

ج میری پہلی تحریر ایک افسانہ تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ایف ایس سی کا طالب علم تھا۔ سول سروسز اکیڈمی میں بھی میں نے بعدازاں چند افسانے تحریر کیے۔ نوائے وقت میں ''ذرا ہٹ کے'' کے عنوان سے کالم نگاری بھی شروع کی مگر پھر لمبا بریک آ گیا۔ پھر ۲۰۰۶ء میں یہ سلسلہ شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔

س کہتے ہیں برگد کے نیچے برگد پرورش نہیں پا سکتا۔ آپ کو بھی اپنی الگ پہچان بنانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا؟

ج جہاں عطاء الحق قاسمی کا بیٹا ہونا ایک اعزاز کی بات ہے وہاں فنی میدان میں یہ

نسبت اپنی پہچان بنانے میں مشکلات کا بھی سبب بنی۔ لوگ ہو سکتا ہے سوچتے ہوں کہ اس باعث اخبار میں جگہ آسانی سے مل گئی ہوگی۔ مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوا۔ میر شکیل الرحمٰن نے میری تحریر میرے نام کے بغیر پڑھی۔ اسے پسند کیا اور بعدازاں قاسمی صاحب نے ان کو بتایا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں حسد کرنے والے لوگ بھی بہت سے ہیں جن سے کسی کی کامیابی برداشت نہیں ہوتی۔ ایسے ماحول میں ابتدائی سفر دشوار تھا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ چیزیں بہتر ہوئی چلی گئیں۔

س آپ کی ابتدائی تحریروں میں طنز و مزاح کا پہلو خاصا نمایاں تھا۔ اب آپ کی تحریریں زیادہ سنجیدہ نظر آتی ہیں۔ طنز تو پھر بھی موجود ہے مگر مزاح کا پہلو ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

ج اس کی وجہ ہمارے ملک کی صورت حال ہے۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو اس وقت ملک میں دہشت گردی اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی چند سالوں میں برپا ہوگئی ہے۔ باقی پاکستانیوں کی طرح ظاہر ہے میں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جتنا ہو سکا میں نے اپنا حصہ ڈالا۔ جب اس طرح تشدد کا ماحول ہو اور بے گناہ لوگ آپ کے اردگرد مر رہے ہوں تو ایسے ماحول میں مزاح لکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ مجھے یوں لگا کہ میں ناانصافی کروں گا۔ معاشرے کے ساتھ اگر میں اسی طرح مزاح تحریر کروں۔ بہر حال طنز کا سلسلہ جاری ہے۔

س جیسے آپ نے کہا آپ کا الیکٹرانک میڈیا سے بھی تعلق ہے۔ ہمارے ہاں جو بگاڑ کی صورت حال نظر آتی ہے کیا اس میں ٹی وی ٹاک شوز کا بھی کوئی کردار ہے؟

ج جی ہاں! ٹی وی ٹاک شوز کا بھی کردار ہے۔ ایک دلچسپ بات ہے کہ عمومی طور پر جب یہ سوال کیا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جن کی صحافتی تربیت نہیں ہوئی اور وہ پیراشوٹ کے ذریعے میڈیا میں آتے ہیں۔ بظاہر یہ بات صحیح لگتی ہے مگر اتنی صحیح بھی نہیں۔ کیونکہ جتنے بھی لیڈنگ ٹاک شوز ہیں ان کی زیادہ تر تعداد کو جید

صحافی ہی چلاتے ہیں اور ان میں بھی یہ سب قابل اعتراض باتیں ہوتی ہیں۔ جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے جن کو پیراشوٹ کے ذریعے اس شعبے میں اُترنے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ انہیں پیراشوٹ سے اُترے بھی اب دس سال ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب گزارش ہے کہ یہ تنقید ختم کر دیں۔

س شدت پسند تنظیموں پر جتنی کڑی تنقید آپ کرتے ہیں اردو صحافت میں تو ایسی کڑی تنقید شاید کوئی بھی نہیں کرتا۔

ج زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ویسے بھی ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ زندگی میں کچھ نہ کچھ تو ایسا چھوٹا موٹا ہی سہی ضرور کر لینا چاہیے جس کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ ہم نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔ خطرہ تو سچ کی راہ میں بہر حال ہوتا ہی ہے۔

س آج کل ہمارے ہاں یہ بات بہت سننے میں آ رہی ہے کہ اینکر پرسن اور کالم نگار کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ آپ کی اس بارے میں رائے کیا ہے؟

ج غیر جانبداری بڑا دلچسپ لفظ ہے۔ صحافت میں۔ اگر آپ رپورٹر ہیں اور کوئی واقعہ رپورٹ کر رہے ہیں تب تو غیر جانبداری اختیار کرنے کی سمجھ آتی ہے اور یہ ضروری بھی ہے لیکن جب کالم نگار سے غیر جانبدار ہونے کا تقاضا کیا جاتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ اس سے مضحکہ خیز بات ہو نہیں سکتی۔ اگر تو آپ کے پسند کے لیڈر اور حکمران کی تعریف کی جائے تب تو یہ ہو گئی غیر جانبداری۔ اگر اس کے خلاف بات کی جائے یا پھر کسی دوسرے کی تعریف کر دی جائے تو پھر کالم نگار صرف جانبدار ہی نہیں بلکہ بکا ہوا بھی ہے۔

آپ کے کالم نگار اینکر پرسن کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس کی اپنی کوئی رائے نہ ہو اور وہ غیر جانبدار ہو۔ دانتے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دوزخ میں سب سے اندھیری جگہ ان لوگوں کے لیے مختص ہے جنہوں نے اخلاقی بحران کے دوران اپنی غیر جانبداری برقرار رکھی۔" پاکستان کے اخلاقی بحران میں اگر کوئی شخص اپنی غیر جانبداری قائم رکھتا ہے تو اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات کوئی نہیں ہے۔

س آپ کا اپنا پسندیدہ کالم نگار کون ہے؟

ج اس سوال کا ایک جواب تو "باقی ڈیفالٹ" ہے جو کہ آپ کو معلوم ہے۔ مگر میں اس کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ ایک گلدستہ ہے کالم نگاروں کا جس میں آٹھ دس کالم نویس آتے ہیں۔ جو بھی خوبصورت لکھتے ہیں ان آٹھ، دس کالم نگاروں کے نام لینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہی آٹھ دس کالم نویس ہی ہیں جو اس ملک میں پڑھے جاتے ہیں۔ وہی میرے بھی پسندیدہ ہیں۔

س آپ نے افسانے بھی لکھے، افسانوں کا مجموعہ شائع کروانے کا ارادہ ہے؟

ج افسانوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میری سستی آڑے آ جاتی ہے۔ کالم بھی میں اسی لیے لکھ لیتا ہوں کہ ایک طے شدہ مقررہ مدت تک مجھے تحریر کر کے بھیجنا ہوتا ہے۔ اگر افسانے کے سلسلے میں بھی وقت کی قید کوئی شخص مقرر کر دے تو میں لکھ دوں گا۔ بصورت دیگر یہ ممکن نہیں میرے لیے۔

س شعر کہنے کا خیال کبھی نہیں دل میں آیا؟

ج شاعری کے اوزان کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ میری چائے کی پیالی نہیں ہے۔

س ٹی وی ڈراموں کے موجودہ معیار سے مطمئن ہیں؟

ج موجودہ ٹی وی ڈراموں میں سے بہت کم ایسے ہیں جو آپ کو مجبور کر دیں کہ آپ بیٹھ کر انہیں دیکھیں۔ اس کی اگلی قسط کا انتظار کریں۔ اگر آپ پی ٹی وی کے سنہرے دنوں کے ڈرامے جیسا ڈرامہ تلاش کریں تو ناسٹیلجیا کی وجہ سے بھی ویسا ڈرامہ تو نہیں ملے گا مگر آپ کو انہی میں سے کوئی خوبی تلاش کر کے آگے بڑھنا ہے۔ جیسے پچھلے دنوں ترکی کے ڈراموں نے بہت پسندیدگی حاصل کی تھی۔ اگر ڈرامے میں کوئی خوبی کا جوہر ہوگا تو پھر میرے مطمئن ہونے یا نہ ہونے سے کچھ نہ ہوگا۔ وہ خود ہی اپنی مقبولیت تلاش کر لے گا۔

احمد عدنان طارق

س اپنے بچپن، ابتدائی زندگی اور تعلیم سے متعلق کچھ بتائیں؟

ج میری تاریخ پیدائش ۱۴ جولائی ۱۹۶۳ء ہے۔ میں دو بہت پڑھے لکھے ماں باپ کے ہاں پیدا ہوا۔ دونوں سرکاری ملازم تھے۔ میری والدہ ڈبل ایم اے تھیں اور تدریس کے شعبے سے وابستہ تھیں۔ میرے والد بھی ایم اے تھے اور ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر تھے۔ ماں باپ دونوں ایم اے انگلش تھے۔ لہٰذا مجھے بی ایس سی میڈیکل کرنے کے بعد بھی شوق چرایا کہ کیوں نہ ایم اے انگلش کرلیا جائے۔ وکالت میں نے پولیس میں نوکری کی وجہ سے کی۔ نوکری سے چند دن فراغت ملی تو ریگولر MCS کیا۔

میری والدہ تاندلیانوالہ کے اکلوتے گرلز ہائی سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ اس لیے میرا بچپن تاندلیانوالہ میں گزرا۔ میرے ننھیال اور ددھیال دونوں کا تعلق فیصل آباد سے ہے لیکن والدہ کی نوکری کی وجہ سے میٹرک تک میری تعلیم تاندلیانوالہ ہائی سکول سے ہے۔ تاندلیانوالہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ پورے قصبے میں صرف دو گھروں میں ٹیلی ویژن تھا۔ ایک میرے گھر اور دوسرے شیخ مظفر کے گھر جو تب مارکیٹ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ تاندلیانوالہ کے آدھے باسی رات کو ہمارے گھر اور آدھے اُن کے گھر میں ٹیلی ویژن دیکھنے کے لیے براجمان ہوتے تھے۔

چھوٹا تھا تو امی کے سکول چلا جاتا تھا۔ سکول کی ڈاک میں لائبریری کے لیے بچوں کے ناول بھی آیا کرتے تھے۔ تقریباً سارے سکولوں کا الحاق فیروز سنز سے ہوا کرتا تھا۔ بچوں کی ننھی منھی کہانیوں کی کتابیں اور ناول چھاپنے میں فیروز سنز کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

اُنہیں کتابوں سے کتب بینی کا جو شغف ہوا وہ شوق اب زندگی کے ساتھ ہی جائے گا۔ پڑھتے رہنے کے ساتھ ساتھ کوئی ۱۱-۱۲ سال کی عمر میں چھوٹی موٹی تحریریں چھپنے لگیں۔ میٹرک میں نے ۱۵ سال کا ہونے سے پہلے کرلیا تھا۔نویں دسویں میں ہی لیکن میں فیروز سنز کے بچوں کے رسالے تعلیم و تربیت میں مستقل چھپنے لگا تھا۔

پھر میرا بچپن اچانک ختم ہوگیا۔ میری والدہ کا اچانک انتقال ہوگیا۔ میں اُس وقت صرف ۱۵ سال کا تھا۔ والدہ کے انتقال کے بعد تاندلیانوالہ سے ہمیں فیصل آباد منتقل ہونا پڑا۔ میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں داخل ہوا اور پھر وہیں سے ایف ایس سی، بی ایس سی اور ایم اے انگریزی کیا۔ ایل ایل بی میں نے پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد کیا۔

س پولیس میں ملازمت کیسے ہوئی؟ عملی زندگی کا آغاز؟

ج میرے کلاس فیلوز اور میرے بچپن سے جاننے والے دوست آج تک یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ میں پولیس آفیسر ہوں۔ میں نے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا تو میرٹ پر میرے کچھ نمبر زکم تھے۔ میرا ایڈمشن میڈیکل کالج میں نہیں ہوسکتا تھا۔ والدہ کی وفات اور تاندلیانوالہ سے فیصل آباد منتقل ہونا یعنی ایسے کلاس فیلوز سے دوری جن کے ساتھ میرا مقابلہ تھا اس کا اثر ہوا تھا۔ میرے دو ماموں بڑی دیر سے لندن مقیم تھے۔ انہوں نے میرے والد محترم کو درخواست کی کہ اسے کہیں اپنی تعلیم مکمل کرے ہم اسے لندن لے کر جائیں گے۔ لہٰذا FSc کی دوبارہ کوشش کی بجائے میں نے BSc میں داخلہ لے لیا اور پہلے سال ہی پاس بھی ہوگیا۔ چھ ماہ گلیکسوز میں میڈیکل ریپ رہا۔ میرا بہترین دوست طارق جو DSP ہوکر لاہور شہید ہوا، نے سفارش کروائی تھی۔ وہ ASi کا امتحان دینے جا رہا تھا۔ میں بھی ساتھ چلا گیا۔ تب میں پرائیویٹ طور پر ایم اے انگلش کر رہا تھا اور سفارش کے بغیر ۱۹۸۵ء میں ASI بھرتی ہوا۔ آج محکمہ کو جوائن کیے ہوئے ۳۴ سال ہوگئے ہیں۔

س آپ نے دیارِ غیر کی سیاحت بھی خوب کی وہاں کیسے جانا ہوا؟ یادگار واقعات؟

ج UNO کی طرف سے امن مشنز منعقد کیے جاتے ہیں۔ جن ملکوں میں سیاسی طور پر

اتنی ابتری ہو جائے کہ خانہ جنگی کا خطرہ ہو جائے تو پھر اقوامِ متحدہ وہاں الیکشن کرواتی ہے۔ الیکشن سے پہلے حالات ٹھیک رکھنے کے لیے انہیں مختلف ملکوں سے پولیس مانیٹرز درکار ہوتے ہیں۔ جس کے لیے وہ ممبر ممالک میں جا کر پڑھے لکھے پولیس آفیسرز کا انٹرویو کرتے ہیں۔ میری کیوں کہ تعلیم ہی اتنی تھی اس لیے نیمبیا کے امن مشن کے لیے میری سلیکشن ہوئی۔ خوش قسمتی سے پنجاب میں جو سلیکشنز ہوئیں وہ میرے Batchmates زیادہ تھے۔ اس لیے مشن کا مزا دوبالا ہو گیا۔ نیمبیا کو ساؤتھ افریقہ سے آزادی ملنی تھی۔ گورے کالے کا بے حد فرق تھا۔ ہسپتالوں، کالجوں کے باہر لکھا ہوتا تھا کہ کتے اور کالے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ میرے مشن ایریا میں جنوبی افریقہ اور افریقہ کے بہت سے ملک تھے جنہیں چھٹیوں کے دوران دیکھنے گئے۔ کالا ہاری صحرا دیکھا۔ تنزانیہ میں Etosha Park جنگل دیکھا۔ زمبابوے میں جا کر وکٹوریہ آبشار دیکھی۔ افریقہ کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اسی طرح 4 سال بعد ۱۹۹۳ء میں کمبوڈیا کے مشن پر گئے تو سارا ایشیا دیکھا۔ بنکاک ہمارے لیے اس طرح تھا کہ ہمیں گلیاں تک یاد تھیں۔ اسی طرح تھائی لینڈ کے دوسرے مقامات پتایا اور پھکٹ وغیرہ کئی بار دیکھے۔ نانگ نوچ بوٹینکل گارڈن دیکھا۔ اینگر واٹ کے کھنڈر دیکھے۔ افریقہ اور ایشیا کے علاوہ کیوں کہ ہمارے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ تھے لہٰذا موقع پاتے ہی جب چاہا یورپ کی سیر کی اور فن لینڈ تک سیریں کیں۔ نیمبیا میں UNO کی کرکٹ ٹیم تھی۔ جو لیگ کھیلتی تھی۔ لیگ کا سٹیٹس فرسٹ کلاس کا تھا۔ دو جزیروں کے کھلاڑی تھے۔ سب کا تعلق ویسٹ انڈیز سے تھا۔ دو گروپ بنے ہوئے تھے۔ میری لاٹری نکل آئی۔ میں کپتان بن گیا۔ بس پھر تو کرکٹ کھیلنے اور سیر و تفریح کے ہی پیسے کمائے۔

س بچوں کی کہانیاں لکھنے کا خیال کیسے آیا؟

ج میں تاندلیانوالہ میں تھا تو امی کے سکول کی ڈاک گھر آتی تھی۔ وہیں سے بچوں کی کہانیاں پڑھنے کا شوق ہوا اور کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پورے تاندلیانوالہ جو کہ چھوٹا سا قصبہ تھا میں صرف دو ٹیلی ویژن تھے۔ جن میں ایک ہمارے گھر میں تھا۔ سارے پنجاب کے ہائی

سکولز کی لائبریریوں کے لیے فیروز سنز سے بچوں کے ناول اور رسالے وغیرہ آیا کرتے تھے۔ پہلے کہانی پڑھنا شروع کی اور پھر طبع آزمائی۔ نویں دسویں میں میں نے کتنی کہانیاں تعلیم وتربیت کے لیے لکھیں۔ تعلیم وتربیت تب بھی سب سے زیادہ چھپنے اور بکنے والا بچوں کا رسالہ تھا۔ امی فوت ہوئیں اور میں فیصل آباد کالج چلا گیا تو بچوں کے لیے لکھنا چھوٹ گیا۔ جو کہ نارمل تھا لیکن ساری زندگی میں ادبی کتابیں پڑھتا رہا۔ پولیس کی نوکری کے بعد تو بچوں کے ادب کی طرف واپسی بعید از قیاس تھی۔

لیکن میں ساہیانوالہ تھانہ فیصل آباد میں ۲۰۱۰ء بطور SHO تعینات تھا۔ وہاں چھ بندے ہم نے مقدمہ میں بے گناہ کر کے چھوڑے۔ تو ان کے مخالفین نے انہیں عید سے ایک دن پہلے قتل کر دیا۔ یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ ٹینشن سے مجھے کمر میں مہروں کا مسئلہ ہوا اور میری داہنی ٹانگ مفلوج ہوگئی اور میں معذور ہوگیا۔ چار ماہ تک میں ایک منٹ بھی نہ سو سکا۔ تکلیف میں ماں یاد آتی ہے یا خدا اور اس کا رسولؐ۔ میں نے دُعائیں کیں اور ماں کے یاد آنے سے مجھے بچپن کی کتابیں یاد آئیں۔ تب میں نے معذور ہو کر بستر پر لیٹنے کی بجائے گاڑی پر بیٹے معاذ کو ساتھ لے کر پرانی پرانی لائبریریاں ڈھونڈیں۔ گاڑی چلنے سے میرے معذور ہونے کے احساس میں کمی ہوتی تھی۔ میں نے ان سالوں میں بچوں کے لیے پاکستان میں چھپنے والی تقریباً ساری کتابیں اکٹھی کر کے گھر میں لائبریری بنائی۔ اب پاکستان میں اتنی کتابیں صرف میرے پاس ہیں یا کراچی میں میرے دوست فاروق صاحب کے پاس۔ پھر میں نے بچوں کے رسائل کا دوبارہ ستر کی دہائی سے مطالعہ شروع کیا۔ انگریزی، روسی، چینی اور فرانسیسی ادب پڑھا اور دیکھا کہ بہت چھوٹے بچوں کے لیے کوئی بھی نہیں لکھ رہا تو میں نے طبیعت کی بحالی کے ساتھ بچوں کے ادب کی بحالی کی بھی ٹھانی۔

س بچپن میں کن کن ادیبوں کو پڑھا؟ پسندیدہ ادب؟

ج میں خوش قسمت ہوں۔ میں نے کہانیاں تب پڑھنی شروع کیں جب بچوں کے ادب کا پاکستان میں سنہری دور چل رہا تھا۔ سعید لخت، مقبول جہانگیر، راز یوسفی، عزیز اثری،

جبار توقیر، زبیدہ سلطانہ، ذاکر اعجاز، اے حمید، سیف الدین حسام، اشتیاق احمد، رحیم، یونس حسرت وغیرہ سبھی ایک دور میں لکھ رہے تھے۔ میں آج بھی یونس حسرت صاحب کی نقل مارنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میرے پسندیدہ رائٹر جبار توقیر تھے۔ کون ''میرا نام منگو ہے'' بھول سکتا ہے۔

س مغرب اور یہاں کے ادب میں فرق؟

ج یہ فرق اتنا ہی ہے۔ میں آج کل کی بات کروں گا جتنا کسی سمندر اور کنویں میں ہو سکتا ہے۔ ۸۰ء کی دہائی کے بعد یہاں کے ادیبوں نے بچوں کو مزے کی کہانیاں دینے کی بجائے مذہب کی طرف کھینچ لیا۔ ان بچوں کو بھی جنہیں ہم نے پیار سے نماز کی تلقین کرنی تھی۔ انہیں کہانی میں مزیدار واقعہ سنانے کی بجائے صرف ڈائیلاگ کی تکرار کے ذریعے نصیحتیں کی گئیں اور بچے بصری یلغار کے شکار ہو گئے۔ انہوں نے بور کہانیاں پڑھنے کی بجائے ڈورے مون اور بھیم دیکھنا شروع کر دیا۔ جبکہ مغرب کے ادیبوں نے ہر طرح کی مزے مزے کی کہانیاں بچوں تک پہنچائیں۔ خود بھی پیسے کمائے اور بچوں کی تربیت بھی کی۔

ہمارے ۸۰ء کی دہائی کے ادیبوں کی تحریروں میں جان ہوتی تو ہمارے ادیبوں کے بھی ترجمے باہر کے ملکوں میں ہوتے اور ہمارا ادب صرف عنبر ناگ ماریہ سیریز اور اشتیاق احمد صاحب کی محمود فاروق فرزانہ سیریز تک محدود نہ رہ جاتا۔

س آپ کے نزدیک بچوں کے ادب کی کیا اہمیت ہے؟

ج میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ بچوں کے ادیب اپنی بغل میں سمیٹے تھیلے میں مال ہی ایسا لے کر پھر رہے ہیں جو بکاؤ نہیں ہے۔ جو دو چار رائٹر ہیں اُن کی کتابیں آج بھی دھڑا دھڑ بکتی ہیں۔ جبار توقیر نے بچوں کے لیے دس بارہ ناول لکھے اور وہ بھی یونیسکو کے انعام یافتہ تھے۔ آپ بہت اچھا لکھنے والے ہیں تو گورنمنٹ کے ادارے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں لیکن ہمارے ادیبوں کا سفر جہلم تک ختم ہو جاتا ہے اسلام آباد پہنچ ہی نہیں پاتے۔ کیونکہ وہاں انٹرنیشنل لیول پر لکھنا ہوتا ہے۔ گورنمنٹ بھی اُس فن کی

پذیرائی کرتی ہے جو انٹرنیشنل لیول پر مستند ہو۔ ویسے افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعر پاکستان میں بے شمار ہوں گے۔ حقیقی کتنے ہیں جو دلوں میں رہتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں۔

س ایک طرف انسپکٹر اور دوسری طرف بچوں کی کہانیاں لکھنا اس میں کوئی دشواری تو خیر نہیں ہوتی۔

ج پولیس والوں کے شوق نرالے ہوتے ہیں۔ جن باتوں کے لیے وہ مشہور ہوتے تھے وہ سبھی جانتے ہیں لیکن اب پولیس میں بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں اور لکھنے پڑھنے والے ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب غلام رسول زاہد جیتی جاگتی مثال ہیں۔ بچوں کے لیے لکھتے ہیں۔ انسان شوق پورا کرنے کے لیے وقت نکال ہی لیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ شوق سے جنون کی حد تک پیار کرتا ہو۔

س بچوں کا ادب لکھنے کے لیے احتیاطیں کیا ہیں؟

ج میں نے دوسروں پر تنقید کی تو خود کو ان باتوں سے پاک کرنے کی کوشش کی جو مجھے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ جس کے نتیجہ میں میں نے بچوں کے لیے ایسا لکھا جیسے میں کوئی نانی اور دادی ہوں اور بچے کو سلاتے وقت کہانی سنا رہی ہوں اور غیر محسوس طریقے سے بچے کو آخر میں کوئی اخلاقی سبق بھی دے دیا۔ کوئی کومہ یا فل اسٹاپ نہیں لگایا تاکہ یہ نہ ہو کہ بچہ سونے کی بجائے اُٹھ کر بیٹھ جائے اور مجھے دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

جو بات خود نہ کہہ سکا کسی پری یا بونے کی زبانی کہہ دی۔ مگر میری کہانیوں کے پریاں بونے محنتی ہیں۔ جادو سے چیزیں حاصل نہیں کرتے بلکہ سارا سال مزدوری کرتے ہیں تب سردی سے بچنے کے لیے ایک کوٹ خرید سکتے ہیں۔

انہیں محلے سے نکالا، سیریں کروائیں، رنگین پنسلوں، چاکلیٹوں، پریوں کے دیس میں لے گیا۔ ساری دنیا کے ملکوں اور سمندروں کی سیر کروائی۔ انہیں گھسی پٹی اور دقیانوسی کہانیوں جو محلے سے شروع ہو کر محلے میں ہی ختم ہو جاتی ہیں، کے طلسم سے نکالا۔ ان کی عمر پر جا کر سوچا کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو مسئلہ حل ہو گیا۔

س سنا ہے آپ کے پاس کتابوں کا وافر ذخیرہ موجود ہے؟

ج جی اب اللہ کے فضل سے پاکستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد چھپنے والی زیادہ تر بچوں کی کتابیں میرے پاس موجود ہیں اور اُن کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

س آپ کی شائع شدہ کتابیں کون سی ہیں؟ اور مستقبل میں کون سی زیرِ طبع ہیں؟

ج میری کتابیں جو نستعلیق پبلی کیشنز کی طرف سے چھپیں۔ وہ ذیل ہیں:

① تزئین اور تتلیاں ② بارش اور گلاب ③ خوابوں کا سوداگر

④ پریوں کی تلاش میں ⑤ سبز دروازے کے پیچھے ⑥ سانپوں کا راجہ

علم و عرفان کی طرف سے:

⑦ ننھا اژدھا ⑧ تزئین کہانی ⑨ ملک ملک کی کہانیاں

جہلم بک کارنر:

⑩ جنگل کا بادشاہ ⑪ پری کے گاؤں سے ⑫ دیس دیس کی کہانیاں

چلڈرن پبلی کیشنز:

⑬ کہانیوں والا قلم ⑭ ایک سہ پہر کا ذکر ہے ⑮ جادوگر کی پہیلیاں

یہ تینوں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے ہیں۔

نستعلیق پبلی کیشنز کی طرف سے محترم حسن عباسی صاحب میری نظموں کی کتاب شائع کر رہے ہیں اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے داستان امیر حمزہ کئی حصوں میں اور میری کتاب ''بوڑھے برگد کا راز'' زیرِ طبع ہے۔

س اتنے لکھنے والوں میں آپ نے اپنا منفرد نام کیسے بنایا؟

ج میں اس سوال کا جواب اس طرح دیتا ہوں کہ اگر میں اس سفر کا آغاز ایک ایسی گلی سے کرتا جو بڑی گنجان آباد ہوتی تو لازم تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں کسی راہگیر سے ٹکراتے لیکن بچوں کا ادب کی گلی ایسی تھی جس میں سے اکا دکا افراد گزر رہے تھے۔ لہٰذا میں خدا کے فضل سے اُن چلتے ہوؤں میں سے بھاگ کر آگے نکلا۔ مطلب یہ کہ چھوٹے بچوں کے لیے لکھنے

والوں کا کال پڑا ہوا تھا۔ میں نے دیدہ دانستہ موقعہ پا کر اُن کے لیے لکھا۔

مجھے تعلیم و تربیت والوں نے موقعہ دیا اور میں نے ان کے لیے مستقل لکھا۔ آج بھی بچوں کے لیے سب سے زیادہ چھپنے والا اور بکنے والا رسالہ ہے۔ اسی لیے مجھے اچھا بھی لکھنا پڑا اور بہت زیادہ بچوں نے مجھے پڑھا اور سراہا۔

مجھے سب سے پہلے تعلیم و تربیت کے آفتاب صاحب نے کھوج نکالا اور آج تک میرا بازو پکڑے ہوئے ہیں اور اس کے بعد میرے مربی، میرے دوست حسن عباسی صاحب جن کی ان تھک کوششوں سے میں اس مقام تک ہوں۔ میں دو دوستوں کا ذکر بھی کروں گا۔ جو ہر حال میں میرے ساتھ ہیں۔ آپ انہیں نہیں جانتے میں جانتا ہوں۔ ایک الیاس صاحب اور ایک منو صاحب اور آخر میں میری بیوی۔ میری دوست عروج جس نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔

س زندگی کا کوئی یادگار واقعہ؟

ج میں گوجرہ سے جھنگ جا رہا تھا تو ایک چھ سال کی بچی کی والدہ نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ ان کی ایک ہی بچی تھی جو فوت ہوگئی ہے۔ وہ اور ان کے میاں نعوذ باللہ سے شکایت کنندہ تھے کہ ان کی بچی ہی کیوں؟ تبھی انہی دنوں انہوں نے میری کہانی ''انجان راستہ'' پڑھی تو انہیں اس کے سبق سے چین آیا اور انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

جعفر حسن مبارک، ڈاکٹر

س آپ کی پیدائش کب کہاں اور کس خاندان میں ہوئی؟

ج میری نمودِ خاکِ شہرِ ہنروراں سے ہوئی ہے جسے اُس زمانے میں لائل پور کہا جاتا تھا۔ پنجاب کی دریائے چناب اور دریائے راوی کے مابین واقع، ساندل بار میں بسائے اس شہر کو اب فیصل آباد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اگر چہ لائل پور کو فیصل آباد بنے کئی دہائیاں گزر چکی ہیں مگر اب بھی اس شہر کے بہت سے دیگر باسیوں کی طرح...... کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے اس شہر جہاں کی خاک سے میرا خمیر اُٹھا ہے، کے نام کی اس تبدیلی نے مجھے اُسی ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی ورثے سے بیک جنبش قلم محروم کر دیا ہے جو علامتی طور پر ''لائل پور'' نام کی شناخت میں سموئی ہوئی تھی جہاں تک تاریخ پیدائش کا معاملہ ہے تو ٦ جون میری سالگرہ کا دن ہے جسے اکثر منانا بھول جاتا ہوں۔ جہاں تک شجرۂ نسب کا سوال ہے تو میرا شجرۂ نسب خاندانِ بنو ہاشم سے ہوتا ہوا دیگر تمام انسانوں کی طرح حضرتِ آدم تک جانکلتا ہے۔ گویا خاندانی حوالے سے آپ یوں کہہ لیں کہ اپنے آپ کو کسی تخصیص یا امتیاز سے تہی خیال کرنا میرا پسندیدہ طرزِ عمل ہے۔ میری فردیت اگر کوئی امتیاز یا پہچان چاہتی ہے تو صرف کردار کی بنیاد پر...... میرا ایمان ہے کہ امتیازات کی بنیاد ''تقویٰ'' کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

س اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ج میں نے ایک ایسے متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم و ادب کو ایک نمایاں تہذیبی قدر کا درجہ حاصل تھا۔ لہٰذا فطری طور پر بچپن ہی سے کتاب آشنائی کے مواقع میسر

ہوئے۔ علمی وادبی سرگرمیوں پر حوصلہ افزائی کا ماحول ملا۔ سکول لائف نے زیادہ تر کتب بینی اور "بزمِ ادب" کے معمولات تک محدود رکھا جب کہ کالج لائف نے اس قابل بنا دیا کہ تنظیمی حوالہ سے مختلف ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں لائے ہوئے مباحثوں، مذاکروں، مشاعروں کے اہتمام میں کوئی کلیدی کردار سرانجام دے سکوں۔ اپنی عمر کے اس حصے پر نظر ڈالتا ہوں تو کل پاکستان سطح تک طلبا و طالبات کے مابین بے شمار مباحثوں اور مذاکروں کا اہتمام اپنے کریڈٹ پر پاتا ہوں۔ آج کے بہت سے مقبول تخلیق کار ایسے ہیں جن سے اس زمانے سے یاد اللہ قائم و دائم چلی آ رہی ہے جب انہیں نئے لکھنے والوں کی فہرست میں شامل کیا جاتا تھا۔ جب کبھی ان سے صاحب سلامت کا موقع ملتا ہے اس زمانے کے مشاعروں اور مباحثوں کی بات بھی چل نکلتی ہے۔ تو وہ اعتراف پر بخل سے کام نہیں لیتے کہ ان مباحثوں، مشاعروں، مذاکروں اور مضمون نویسی کے مقابلوں نے ان کی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ میں اپنے اس زمانے کے ادبی کردار پر نظر ڈالتا ہوں تو سچی بات ہے کہ آپ کو تخلیق کار کم اور ادبی تنظیموں کے منتظم کے طور پر زیادہ با اعتبار پاتا ہوں۔ حالانکہ میں اپنے کالج کے ادبی میگزین کا مدیر تھا۔ کالج کے زمانے سے کل پاکستان بین الکلیاتی مقابلوں میں اپنے تعلیمی اداروں کی نمائندگی کی اور بہت سارے انعامات کالج کی زینت کیے۔

س ادب کی طرف کب اور کیسے مائل ہوئے؟

ج میرا ادبی میلان قطعاً کوئی حادثاتی معاملہ نہیں ہے کہ کسی خاص واقعے نے اچانک مجھے متاثر کرتے ہوئے اس راہ پر ڈال دیا ہو۔ میں اگر اس حوالہ سے اپنا تجزیہ کروں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ میلان مجھے فطرت ہی کا عطا کردہ ہے۔ اتفاق سے مجھے ماحول بھی ایسا میسر آیا کہ اس میلان کو میرے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ تاہم کالج کے زمانے تک لکھنے لکھانے کا سلسلہ اپنی تخلیقات حلقہ دوستاں سے شیئر کرنے تک محدود رہا۔ اس زمانے کے شاید چند ایک رسائل کے ادبی صفحات ہی گواہی دے پائیں کہ مجھے اشاعت

پذیری کی کوئی خاص پرواہ رہی ہو۔ تاہم جب میں عملی زندگی میں داخل ہوا تو مختلف ادبی رسائل میں تواتر سے شائع ہونے والے احباب نے مجھے خصوصی طور پر اس جانب راغب کیا۔ اب بھی آپ اسے میری فطری کوتاہی کہہ لیں کہ تخلیقات مہینوں یونہی پڑی رہتی ہیں۔ اشاعتی حوالہ سے کسی میگزین کو اصرار کے باوجود بھجوانے کی توفیق نہیں ہو پاتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا تخلیقی عملیہ خود کو کسی اشاعتی ضرورت سے مشروط نہیں رکھتا۔

س پہلی کتاب کون سی تھی اور کب شائع ہوئی؟

ج خالصاً ادبی حوالے سے دیکھا جائے تو ''نئے دنوں کے خواب'' ایسا شعری مجموعہ ہے کہ جو اشاعتی حوالہ سے میری شعری تخلیقات کو منظرِ عام پر لانے کا سبب بنا۔ اس حوالہ سے آپ اسے میرا اوّلین شعری مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں جو اگر میں بھول نہیں رہا ہوں تو ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ بعدازاں ۲۰۰۷ء میں ''دریا سے صحرا تک'' سفرنامہ دبئی اور ۲۰۱۰ء میں ''اپنے استنبول میں'' کے نام سے سفرنامہ ترکی طبع ہوا۔ ۲۰۱۱ء میں ''تنہا رہنا سیکھ لیا ہے'' کے نام سے دوسرا شعری مجموعہ اشاعت پذیر ہوا۔ جب کہ ''کپسر کے دیس میں'' کے نام سے سفرنامہ آسٹریا ''ساحل سے ساحل تک'' کے نام سے سفرنامہ سری لنکا اور ریزہ کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ زیرِ طبع ہیں۔ یہاں میرے لیے اپنی دو تین ایسی کتابوں کا ذکر شاید بے معنی یا بے جا نہ ہو جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ''سوشل ورکر'' کے طور پر میرے کردار کو شباہت دینے میں معاون رہی ہیں۔ ان میں ''میں نے نشہ چھوڑ دیا''، ''علم المنشیات'' اور ''سحر قریب ہے'' کے نام سے اشاعت پانے والی کتابیں شامل ہیں جن کا زمانہ اشاعت ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۰ء تک ہے۔ یہ کتابیں ''ڈرگ ایڈکشن'' کے خلاف بطور سماجی کارکن میری جدوجہد کے تناظر میں منشیات کی نوعیت، ان کے اثرات، تدارک، علاج اور ان سے پیدا کرنے والے سماجی مسائل کے موضوعات سے بحث کرتی ہیں۔ تاہم میں نہیں سمجھتا کہ انہیں کسی بھی طور پر ادبی زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔

''حرفِ جعفر'' کے نام سے ایک ماہنامہ پچھلے پندرہ سولہ سال سے مسلسل شائع کرنے

کا سزاوار بھی ہوں جس کی نوعیت نیم سماجی، نیم ادبی ہے۔

س سفرنامہ لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ اور اب تک کتنے سفرنامے شائع ہو چکے ہیں؟

ج میں خود کا شمار ایسے لوگوں میں کرتا ہوں جن پر "سفر کا پاؤں پر لکھا ہونا" کا محاورہ صادق آتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جب سے عملی زندگی کا آغاز ہوا ہے کبھی نجی اور کبھی پیشہ ورانہ حوالے سے وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی سفر ہمیشہ درپیش ہوتا ہے۔ جناب منیر نیازی کے ایک شعری مضمون کی طرح ایک دریا کے پار اُترنے پر ایک اور دریا کا سامنا ہوتا ہے۔ ہر نئی سمت کا سفر حسی اور فکری سطح پر نئے تجربات اور تازہ محاصل کا ماخذ ہوتا ہے۔ میرے علمی آغاز میں میرے اسفار کے حسی اور فکری محاصل غزل، نظم، افسانے کی تخلیق کا محرک بنتے رہے۔ بعدازاں میرے حلقہ ادب کے احباب نے اصرار کیا کہ میں اپنے سیاحتی تجربات کو تخلیقی روداد کی صورت میں سامنے لاؤں۔ چونکہ افسانہ، ناول، تنقید، شاعری کی طرح اُردو ادب میں لکھے گئے بیشتر سفرنامے بھی میری مطالعاتی دستبرد سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ اس لیے مجھے سفرنامے کے ادبی معیارات کا ادراک رکھنے میں کچھ ایسا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ سو احباب کے اصرار پر میں نے اپنی سی کوشش کی۔ "دریا سے صحرا تک" کی صورت میں دُبئی کا سفرنامہ منظر عام پر آیا۔ تو احباب کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی جانب سے بے پناہ پسندیدگی ملی تو قلم اس ڈگر پر چل نکلا اور اب صورت یہ ہے کہ اپنے سفر کا سفرنامے کی صورت میں تخلیقی بیان حسی اعتبار سے میرے لیے بہت طمانیت کا باعث بنتا ہے۔ اب تک دو سفرنامے "دریا سے صحرا تک" (سفرنامہ دُبئی) اور "اپنے استنبول میں" (سفرنامہ ترکی) منظر عام پر آ چکے ہیں جب کہ "کیسپر کے دیس میں" (سفرنامہ آسٹریا) طباعت کے مرحلے میں ہے۔ زمانہ حال میں بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے میں نے ادبی حوالہ سے اپنے بکھرے ہوئے تخلیقی کام کو سمیٹ کر اُسے مطبوعہ شکل میں لانے کی کوشش ہے۔ ایک پلندے کو سمیٹتا ہوں تو ایک اور کو بکھرا پاتا ہوں پھر اُسے سمیٹنے میں لگ جاتا ہوں۔ میرے ساتھ تو ایک عرصہ سے یہی واردات چل رہی

ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے آپ کا زمانہ حال آپ کے مستقبل کا تخلیق کار ہوتا ہے۔ میں اپنے مستقبل میں کسی ایسی بڑی تبدیلی کی توقع نہیں رکھتا جو میرے زمانہ حال سے مماثل نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرے پاس کچھ بہتر کرنے کی استعداد ہے تو وہ زمانہ حال ہی میں ہے۔

س فیصل آباد کی ادبی فضا کے بارے میں کچھ بتائیں۔ مستقبل میں کون سے شاعر اس شہر کی پہچان بنیں گے؟

ج ادبی حوالہ سے فیصل آباد کی مٹی ہمیشہ بہت زرخیز رہی ہے۔ اس شہر ہنروراں نے ایسے ایسے ہنرور پیدا کیے ہیں کہ جن کی فکری وفنی اپج اور کمال کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔ ن، م، راشد کا تعلق اسی خطہ زمین سے تھا۔ سلیم بے تاب، جوہر جالندھری، حافظ لدھیانوی، عبیر ابوذری، شوق عرفانی، احسن زیدی، شہزادہ حسن، قمر لدھیانوی، طالب جالندھری، افتخار نسیم، عدیم ہاشمی، ممتاز کنول، خاور زیدی، نذر جاوید، اقبال اختر ایسے شعرا ہیں کہ جواب ہم میں نہیں ہیں۔ مگر ان کا شعری آہنگ فیصل آباد کے مجموعی شعری آہنگ کو ایک مخصوص شناخت دینے میں کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ افضل احسن رندھاوا، ڈاکٹر ریاض مجید، افسر ساجد ایسے نام ہیں جو عالمی ادبی منظر نامے پر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ارشد جاوید، قیوم ناصر، افضل خاکسار، احمد شہباز خاور، نصرت صدیقی، اشرف یوسفی، کوثر علی، خاور جیلانی، انجم سلیمی، ظفر عجمی، مقصود وفا، علامہ ضیا حسین ضیا، شاہد اشرف، ثناء اللہ ظہیر، راشد اقبال، کاشف نعمانی، محمود رضا سیّد، منصف ہاشمی، علی زریون اور سردار آصف آرائیں کا شمار عمدہ اشعار کہنے والوں میں ہوتا ہے کہ فیصل آباد کے شعری شباہت کے رنگ انہی کی تخلیق کارفرمائی کے مرہون ہیں۔ افضال نوید، شہزاد اسلم گو بیرونِ ملک جاتے ہیں مگر یہاں کی شعری فضا آج بھی ان کا حوالہ پا کر خوشگوار محسوس ہوتی ہے۔ شہزاد بیگ، اشفاق بابر، یاور نقوی، اشرف اشعری عہد جاریہ کے ایسے فعال نام ہیں کہ جس کی ادبی فعالیت حیران کر دینے کا نامہ رکھتی ہے۔ اُردو افسانے کی تخلیق کے باب میں طاہرہ اقبال اور گلزار ملک کے مؤقر ادبی جرائد میں اپنی جگہ بناتے، اکثر دکھائی دے جاتے ہیں۔ نثر و شاعری کے حوالہ

سے خواتین کے کردار کا تذکرہ کیا جائے تو محترمہ گلفام نقوی، محترمہ کنیز اسحاق، محترمہ نسیم صحرائی، محترمہ ضیاء بتول، محترمہ فوزیہ ہاشمی، محترمہ عنبرین اشعر، محترمہ رابعہ سرفراز، محترمہ فرحت صدیقی، محترمہ ناز فاطمہ، محترمہ سعیدہ ہاشمی اور محترمہ رفعت یاسمین فیصل آباد کے نسائی ادب کو پہچان دینے میں اہم کردار سرانجام دیتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر سہیل عباس جوان دنوں ٹوکیوں میں مقیم ہیں، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر آصف اعوان، ڈاکٹر سعید احمد، ڈاکٹر اصغر علی بلوچ (شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد) خاصے فعال نظر آتے ہیں۔

فیصل آباد کے منتخب شعراء و ادباء کی مندرجہ بالا فہرست کو اگر ادبی حوالہ سے تخلیقی صلاحیت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بے اختیار زبان پر......

ہر ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

کا مصرعہ جاری ہو جاتا ہے۔

س قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

ج عصری ادب کی فعالیت کے حوالے سے عموماً سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ آج کا ادب قارئین کو متوجہ کرنے سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میں اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں رکھتا۔ آج کا ادب اپنے قاری سے اتنی ہی کشش رکھتا ہے جتنی کلاسک ادب اپنے قدیم قاری کے لیے رکھتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج کا قاری اپنے ناقدانہ ردِعمل کو اظہاری رویے میں ڈھالنے کے ذوق سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کتاب سے استفادے کے باوجود اپنی ریڈرشپ کے ماحصل کو خارج از بیان کر دینے کے رویے نے خواہ اس کی وجہ کوئی بھی ہو، کتاب کی مطالعاتی رغبت کو تحرک دینے میں رکاوٹ پیدا کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قاری کا مطالعہ اُسے جو بھی نتائج دے، ان کے اظہار سے مباحث کو اپنا جواز پانے کا موقع ملتا ہے اور علمی و ادبی تحرک انھی مباحث ہی سے اپنا وجود پاتا ہے۔ میں قارئین ادب سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنی آراء خود تک محدود رکھنے کی بجائے اسے مکالمے کا جواز دیں گے کہ ادبی جمود کے خاتمے کی یہی تہذیب ہے۔

رفعت عباس

س رفعت عباس کون ہے؟

ج رفعت عباس صرف ایک شاعر ہے۔ یہی اس کی وجودی اور سماجی حیثیت ہے۔ یہ اس خوبصورت نارمل زندگی میں ایک شاندار سب نارمل شخص ہے جس کے پاس شاعرانہ وقوف اور دلیل ہے۔ یہ لوگوں کا مددگار ہے کہ انہیں خواب دیکھنے میں آسانی ہو۔ یہ پکھوے کا مددگار ہے کہ شہر سے باسہولت گزر کر اپنے پانیوں تک پہنچے۔ یہ رب کی مخلوق کا وکیل ہے۔

س آپ کی شاعری کا جہان سرائیکی شعری روایت سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ کیا ایسا ہے؟

ج میرا شعری جہاں سرائیکی شعری روایت سے مربوط ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ شعری روایت شاعری سے زیادہ ہماری روزمرہ زندگی میں پھیلی ہے۔ میلے ٹھیلے، ناٹک، گلی بازاروں میں خلق خدا کا مکالمہ، شور اور ہجوم کی نفسیات، بچوں کے کھیل، نانیوں اور دادیوں کی کہانیاں، اساطیر، ان سب اطراف میں اس خطے کی شعری منطق کارفرما ہے۔ میری نانی ایک کہانی سنایا کرتی تھی کہ ایک کوا مائی بڑھیا کے پلو سے مکئی کا ایک پھلا لے اُڑا۔ مائی بڑھیا نے وہ پھُلا واپس لینے کے لیے سوجتن کیے اور بالآخر اپنا پھلا واپس لینے میں کامیاب ہوئی۔ یہ کہانی مرے لیے ہمیشہ تقویت کا باعث بنی۔ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں یہ کہانی میرے لیے ایک شعری منطق میں ڈھل گئی۔

ہک پُھلّے دی گالھ تاں آنجھی کوئی نہ ہئی پئی رفعت
مائی جو ایویں ٹرویندی تاں کاں دا دل ودھ ویندا

(ایک پھلے کی بات اہم نہیں تھی۔ اگر ماں یونہی واپس چلی جاتی کوے کا دل بڑھ جاتا)

یہ سرائیکی لوک کہانی کی وہ روایت تھی جو نئے پلٹاؤ کے ساتھ ایک شعری منطق میں ڈھلی۔ میں نے ہمیشہ آوازیں اکٹھی کیں۔ میرا یقین ہے کہ اپنی زبان بولنے والے عام لوگوں کے تکلم میں اس خطے کا شعری مواد موجود ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ لوگوں کو اپنے لیے شعر کہنے دیا ہے۔

لوکیں دیاں میں گالھیں وچوں بیت بنڑیندا ں رفعت
(میں لوگوں کی گفتگو سے اپنی شاعری بناتا ہوں)

سو آپ کی بات کا جواب یہی ہے کہ میری شاعری اپنی زبان اور جغرافئے سے اُبھری ہے۔

س ایک طبقہ آپ کی شاعری کو نظر انداز کرتا ہے۔ جبکہ دوسرا آپ کو منفرد اور بڑا شاعر قرار دیتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کی آپ کے نزدیک کیا وجہ ہے؟

ج یہی جدلیات ہے۔ شعری دلیل نئی صورت حال پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات بالکل یدھ جیسی کیفیت بہت سے کلیشے اور ٹیبوز زد میں آتے ہیں۔ ترتیب اور تلازمات بدلتے ہیں۔ زندگی کے ساتھ نئے معاہدے اُبھرتے ہیں۔ اس رزمیے سے ہم آہنگ نہ ہونے والے طبقوں کے نزدیک شعری دلیل کو نظر انداز کرنا ہی بہترین حکمت عملی ہے۔ دوسری طرف ایسے لوگ موجود ہیں جو زندگی کے عمل کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ایک شاعر کے طور پر مجھے رد و قبول ہر دو کیفیتوں کا سامنا رہا ہے۔ مرا پہلا شعری مجموعہ پڑھ کر جام پور کے عوامی کردار سعید خان نے کہا تھا کہ رفعت عباس یا تو بڑا احمق ہے یا بڑا شاعر۔ میری کتاب ''بھوندی بھوئیں تے'' شائع ہوئی تو ایک سینئر سرائیکی شاعر نے کہا ''اگر یہ شاعری ہے تو اب تک ہم نے کیا کیا ہے۔ اس پر میرے دوست اور سرائیکی کے نامور شاعر اشولال نے لکھا کہ پریشان نہ ہوں جو آپ نے لکھا وہ بھی شاعری ہے۔ یہ خیر و برکت کی بات ہے کہ میری شاعری نے مجھے محبت اور عزت دی ہے۔ اس شاعری کے حوالے سے ہر جگہ میرے دوست موجود ہیں۔

س آپ رب کو انسان کے اس قدر قریب لے آئے ہیں کہ دوئی ختم ہوگئی ہے۔آپ کو ملا سے ڈر نہیں لگتا؟

ج میں ملا سے مایوس نہیں ہوں۔اسے کسی وقت بھی ادراک ہو سکتا ہے کہ جمال خداوندی روز افزوں ہے۔

اساں ملاں توں مایوس نیسے
ڈس کہیں ویلے وی پئے سگدی
ایہا گالھ اللہ دی جاری ہے

(ہم ملا سے مایوس نہیں۔کسی وقت بھی اسے خبر مل سکتی ہے کہ اللہ کا کلام جاری وساری ہے)
اس لیے مجھے ملا سے ڈر نہیں لگتا۔میں نے اللہ کا اقرار کیا ہے اور اسے روزمرہ زندگی اور اپنے جغرافیے کے حسن میں دیکھا ہے۔میں نے روایتی وحدت الوجود سے آگے اس وحدت الوجود کی بات کی ہے جس پر مقامی آدمی کے دستخط ثبت ہوں۔

س آپ کی شاعری میں دریا درخت پرندے بلکہ پوری کائنات اور انسان ایک خاندان کی طرح پروئے ہوئے ہیں۔یہ ارتباط کیا ہے؟

ج آپ نے بالکل صحیح کہا یہ ارتباط موجود ہے۔میری شاعری میں کائنات ایک کنبے کی طرح ہے۔مجھے سردیوں کا موسم اور اپنا لحاف بھاتا ہے۔یوں لگتا ہے چاند ستارے درخت ندیاں سب میرے لحاف میں موجود ہیں۔سردیوں میں ٹھٹھرتے بچوں کشتیوں پلوں کو میں اپنے لحاف میں لینا چاہتا ہوں۔چیزوں کے بکھرنے کا دھڑکا مجھے بہت بچپن سے ہے۔میں ہمیشہ اپنی کتابوں اور کھلونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کے رکھتا کہ یہ رات کو ڈر نہ محسوس کریں۔میرا ایک کھلونا دوسرے کے بیچ میں رہتا۔موت کا دھڑکا بھی مجھے بچپن سے ہے۔میرے والد ریلوے میں ملازم تھے۔وہ سفر میں رہتے۔میں ریلوے اسٹیشن پر ان کا انتظار کرتا۔مجھے ڈر لگتا کہ میرا والد کھو جائے گا۔والد کی موت کے بعد میں نے شاعری کا ایسا گھر بنایا جہاں ہجر نہیں ہے۔موت نہیں ہے۔اس گھر میں پوری کائنات ایک دوسرے سے جڑی

ہے۔ میں نے اپنے والد اور پوری کائنات کو شاعری میں زندہ کیا۔ آپ نے پوچھا یہ ارتباط کیا ہے؟ یہ فانی زندگی میں بقا کا ایک گھاٹ ہے۔

س آپ کی شاعری کے استعارے اور تشبیہات یا تو کائنات کے کینوس سے لیے گئے ہیں یا محدود سرائیکی وسیب سے۔ اس کا کیا سبب ہے؟

ج وسیع کائنات اور سرائیکی وسیب دو الگ جہانوں کا نام نہیں۔ یہ محدود سرائیکی وسیب ہی وسیع کائنات ہے۔ یہ سرائیکی خطہ بھی کرہ ارض اور نظام شمسی کا حصہ ہے۔ خط سرطان کے نواح میں ہمارے ہاں بھی سرخ اور نیلے پھول کھلتے ہیں۔ درخت اپنے کانٹوں میں پانی جمع رکھتے ہیں۔ پرندوں کی پیلی اور سرخ چونچیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہم اپنی شاعری میں سندھ دریا کی نابینا ڈولفن کے لیے آنکھیں ڈھونڈتے ہیں۔ ہماری کشتیاں بھی ہار سنگھار کرتی ہیں کہ پاران کے عزیز رہتے ہیں۔ ہم گہرے رنگوں والے ملبوس پہنتے ہیں کہ موت رنگوں سے ڈرتی ہے۔ جہاں سرائیکی وسیب ختم ہوتا ہے۔ نیا خطہ شروع ہو جاتا ہے۔ جنوب میں سندھ اور پھر ہند کا سمندر اور پھر وہ قطب جہاں کریسنٹ سٹار روشن ہے اور پھر ہمارے شمال میں شاندار قومیں آباد ہیں جن کے پہاڑوں کے پار چین ہے اور پھر قطب شمالی، یونہی مشرق اور مغرب ہیں۔ یہ سرائیکی وسیب اُسی طرح کرہ ارض سے جڑا ہے۔ جس طرح دیگر دنیا جڑی ہے۔ یہ خطہ وہ ہے جہاں رگ وید لکھی گئی ہے۔ رگ وید میں آکاش اور دھرتی ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

س آپ کے مجموعہ کلام ''پڑچھیاں اُتے پھل'' یعنی ''چٹائیوں پر پھول'' نے آپ کو مقبولیت بخشی۔ آپ کے نزدیک اس میں کیا انفرادیت ہے؟

ج اس مجموعے کی اشاعت کے پینتیس سال بعد شاید میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب میں کہانی کی دوسری پرت اُبھری ہے۔ قصہ در قصہ انفرادی بیان کی جگہ اجتماعی خود کلامی کا اعتبار بڑھا ہے۔ اجتماعی یادداشت نے کچھ نئے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس مجموعہ کی پہلی غزل میں نے ۱۹۷۹ء میں اپنی ریلوے ملازمت کے دوران میں ڈیرہ غازی خان میں کہی:

کینوں ساکوں یاد نہ رہسی اوندے گھر دا رستا
ڈوتاں سارے جنگل آسن ترے تاں سارے دریا
(اس کے گھر کا راستہ ہمیں کیوں نہ یاد رہے گا، دو ہی تو جنگل آئیں گے اور تین ہی تو کل دریا)

اس غزل نے میرے لیے خیر و برکت کے راستے کھول دیے۔ ۱۹۹۰ء میں عظیم سندھی قوم پرست رہنما رسول بخش پلیجو سے ملتان میں میاں منصور کریم سیال کے ہاں ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنے مخصوص سندھی لہجے میں یہ شعر مجھے سنایا اور اور بتایا کہ کتاب ''پڑچھیاں اُتے پھل'' انہیں سکھر جیل میں راجن پور سے آنے والے دوست صوفی تاج محمد گوپانگ نے پڑھنے کے لیے دی۔ ۱۹۸۴ء میں یہ کتاب چھپی اور چند دنوں میں پورے سرائیکی وسیب میں میرے لیے ایک محبت کی فضا پیدا ہوگئی۔ یہ ایک حیران کن عمل تھا جس کی سرشاری میں ہمیشہ محسوس کرتا رہوں گا۔ اس کتاب نے مقامیت کے وقت اور موقف کو دریافت کیا۔ شاید یہی اُس کی انفرادیت ہو۔

س ''بھوندی بھوئیں تے'' یعنی ''گھومتی زمین پر'' لکھنے کا خیال کیسے آیا؟

ج یہ خیال سرائیکی شاعری کے مروجہ ردھم، رومان اور غنائیت سے باہر نکلنے کی تمنا میں اُبھرا۔ میری شاعری کا آغاز غزل سے ہوا جس کے لیے میں نے لاشعوری طور پر اٹھائیس ماتروں پر مشتمل سری چھند برتی اور پھر دوسرے مجموعے میں دوہا چھند کو استعمال کیا لیکن میرا خواب تھا کہ لے کے اس چکر سے نکلوں۔ اس کا موقع مجھے ۱۹۹۰ء میں ملا۔ جب لیاقت پور ضلع رحیم یار خان میں لیکچرار تعینات ہوا۔ میری رہائش اپنی فیملی کے ساتھ شہر کے بالکل وسط میں چوبارے پر تھی۔ نیچے صبح سے شام تک شہر کا بہاؤ تھا۔ مانوس ردھم، رومان اور غنائیت کو توڑتا ہوا ہجوم، بیک وقت آگے بڑھتے اور پیچھے ہٹتے ہوئے ہجوم نے مجھے وہ گشٹالٹ بنانے میں مدد دی جو میرا خواب تھا۔ میں نے لے کے بسرام اور چکر کو توڑا اور ماتروں کو آزادی کے ساتھ آگے بڑھنے دیا۔ اگرچہ یہ نظمیں نثری پیراگراف میں لکھی گئی ہیں لیکن ماترائی تسلسل

کے باعث ان کا اپنا ایک آہنگ اُبھرا ہے۔اس تکنیکی معاملے سے ہٹ کر ان نظموں میں سرائیکی شاعری اپنے آسودہ زرعی سماج سے نکل کر پیچیدہ شہری اور صنعتی زندگی تک آئی ہے۔

س آپ کی کتاب ''بھوندی بھوئیں'' ہو یا ''پروبھرے ہک شہر اچوں'' یعنی ''ایک دور افتادہ شہر سے......'' سرائیکی زبان میں بالکل نئے اور اچھوتے تجربات ہیں۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ تجربات اردو میں کرتے تو وسیع کینوس ہونے کے سبب آپ کی آواز بہت دور تک پہنچتی ؟

ج دو تین باتیں ترتیب سے عرض کرتا ہوں۔

پہلی بات: یہ تجربات نہیں سادہ سی شاعری ہے۔

دوسری بات: میرے لیے شاعری اپنی ماں بولی میں ممکن ہے۔

تیسری بات: میرا نہیں خیال کہ اردو کا کینوس سرائیکی یا پاکستان میں بولی جانے والی کسی زبان سے وسیع ہے۔

چوتھی بات: مادری زبانوں میں لکھنے والے کی آواز دور تک پہنچتی ہے۔

س ''پروبھرے ہک شہر اچوں......'' ایک طویل نظم ہے جو دس ابواب اور ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس نظم کا مرکزی تھیم کیا ہے؟

ج اس نظم کا مرکزی تھیم دور افتادہ شہروں کو قربِ حیات میں لانے کا مکاشفہ ہے۔یہ نظم ان شہروں کی روداد ہے جو اپنی تاریخ اور اساطیر میں بچھڑے، زمان و مکاں کی بھول بھلیوں میں اُترے۔تصور رب کے مخمصے سے اُبھرے۔اپنی جنگوں میں مارے گئے۔بارش کی زد میں آئے، آتش زدگی سے نکلے، استعماریت سے گزرے، اپنی زبان کے باغ میں رکے اور پھر مکاشفے کی سمت نکل گئے۔

س اس ملک میں بسنے والی قوم سے ریاست پاکستان کا سلوک کیا رہا ہے۔آپ ایک شاعر کے طور پر کیا محسوس کرتے ہیں؟

ج ناروا......اس ملک میں بسنے والی تل وطنی اقوام سے ناروا سلوک برتا گیا ہے۔اس

دھرتی کے لوگ ہزاروں سال قدیم تہذیب و ثقافت کے حامل ہیں۔ ان کے پاس زرعی، تمدنی اور علمی تسلسل ہے۔ انہوں نے شہر بسانا سیکھا ہے۔ تجارت کی ہے۔ بغیر کسی جنگ کے ہمسایہ اقوام سے تعلق قائم رکھا ہے۔ ریاست پاکستان نے کسی معاملے میں بھی دھرتی کی وارث ان اقوام کی حکمت حیات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ ریاست کا اپنا ایک تجریدی بیانیہ ہے جو وہ لوگوں پر مسلط کرتی ہے۔ وہ اپنی اس بیانیے کی بنیاد پر لوگوں کی وفاداری اور حب الوطنی کو جانچتی ہے۔ دو قومی نظریہ، ایک قومی زبان، ایک ملت وغیرہ کے حوالے سے بار بار پسپائی کے باوجود ریاست کا انجینئرڈ دماغ ایک ہی جگہ اٹکا ہوا ہے۔ اس خطے کی تاریخ کو گم کر دیا گیا ہے۔ نئی نسل اپنی تاریخ سے ناآشنا ہے۔ یہ ریاست تاریخ کے بغیر اپنے جغرافیے کا دفاع کرنا چاہتی ہے۔ پاکستان میں بسنے والی ہزاروں سال قدیمی اقوام پاکستان سے منسلک رہنا چاہتی ہیں لیکن ان سے مفتوحہ لوگوں جیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ یہ ریاست حملہ آور فاتح کی نفسیات کی حامل ہے۔ یہ اپنا قبضہ مستحکم رکھنے کے لیے مذہب اور مسلح قوت کا استعمال کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ملک طاقت وروں کے ہاتھ میں چلا گیا جنہیں ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ یہ ملک چھن جائے گا، ٹوٹ جائے گا۔ یہاں بسنے والی اقوام کو اس طرح کا کوئی خوف لاحق نہیں۔ وہ اس ملک کی سلامتی چاہتی ہیں۔ ملک ٹوٹنے کا خوف حملہ آوروں اور فاتحین کی نفسیات کا حصہ ہے۔ ایک شاعر کے طور پر میں اس سرزمین کے عام آدمی کا وکیل ہوں۔ اس ملک میں آباد اقوام کو پروقار اور معتبر دیکھنا چاہتا ہوں۔ مقامی آدمی کی حکمت اور دانش کو ملک کی تعلیمی، انتظامی، داخلہ اور خارجہ پالیسیوں میں منعکس دیکھنا چاہتا ہوں۔ لوگوں کی ماں بولیوں اور ثقافتوں کے احترام کا متمنی ہوں۔

س آپ کا ایک طویل انٹرویو چھپا ہے۔ ''مقامی آدمی کا موقف'' جس میں آپ نے مقامیت اور مقامی آدمی کے موقف کو موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ کے نزدیک مقامیت کیا ہے اور مقامی کون ہے؟

ج یہ انٹرویو ملتان کے معروف صحافی اور مترجم منور آکاش نے کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب

لاہور کے ایک پبلشنگ ادارے نے چھاپی اور پہلا ایڈیشن بہت جلد نکل گیا۔ اس انٹرویو نے مجھے اپنی بات کہنے میں مدد دی۔ مقامیت کے حوالے سے مجھے بہت گنجائش دکھائی دی کہ اس دھرتی پر مقامی آدمی بننے کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ یہاں کا مقامی آدمی ریڈ انڈینز اور ایبورجینیز سے مختلف ہے۔ جہاں مقامیت میں داخلے کا دروازہ بند ہے۔ یہاں زبان، تاریخ، ثقافت اور اساطیر کا در کھلا ہے۔ آپ کسی ایک باب سے داخل ہوں صرف پانچ ہزار میل کا تہذیبی سفر طے کریں۔ موہن جودوڑو کی سمبارا، ملتان کی ملوبیا، ٹیکسلا کی مطربہ، ہڑپہ کے منقش ظروف سے ہم آہنگ ہوں۔ آپ مقامی ہیں، اگر آپ میں اتنی وسعت ہے کہ آپ سچل سرمست یا مست توکلی یا خواجہ فرید کو پاکستان کا قومی شاعر قرار دینے کی تائید کر سکتے ہیں تو پھر مقامی آدمی ہیں۔ اگر آپ سندھ دریا کی اندھی ڈولفن بلہنڑ کی آنکھوں کی تلاش کے اساطیری سفر پر نکل سکتے ہیں تو آپ مقامیت کا حصہ ہیں اس خطے میں مقامیت ایک نیا ارادہ ہے۔ آپ باندھیں تو سہی۔

س مقامیت کی سماجی اور سیاسی توجیہ کیا ٹھہرتی ہیں؟

ج جس ریاست میں بسنے والی اقوام کی تاریخ کو رد کر دیا گیا ہو، ان کی مادری زبانوں کا احترام نہ ہو، ان پر غیر ملکی فاتحین کا نصاب مسلط کر دیا گیا ہو، ان کی رائے کی اہمیت نہ ہو، انہیں جگہ جگہ غیر معتبر اور مشکوک ٹھہرایا جائے، جہاں ریاست حملہ آور کی نفسیات کی حامل ہو اور اپنے ہی باشندوں کے خلاف ڈٹ جائے وہاں مقامیت ایک سماجی اور سیاسی مزاحمت ہے۔ مقامیت اس ملک میں بسنے والی اقوام کا مشترکہ لائحہ عمل ہے۔ مقامیت ادبی تنقید کا ایک نیا دریچہ ہے۔

س کیا اس کرہ ارض پر مقامیت ایک محدود سوچ کو جنم نہیں دے گی؟

ج نہیں، مقامیت مور کے ساتھ ساتھ قطب جنوبی کے پینگوئن کو بھی احترام دیتی ہے۔ گندم کی کٹائی کے جشن بیساکھی کی طرح لاطینی امریکہ میں مکئی کی تقریبات کی بھی وارث ہے۔ مقامیت کل اور آج کے استعماریت کے خلاف ہے۔ خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو۔

مقامیت اس کرہ ارض کے حقیقی وارثوں کو جوڑتی ہے۔ مقامیت جنگ کو رد کرتی اور ماحولیاتی اخلاقیات کی پاسدار ہے۔ مقامیت اس کُرّہ کو اپنے لوگوں، جانداروں، پرندوں، پانیوں، جنگلوں کے ساتھ محفوظ رکھنے کا نام ہے۔

س آپ نے حکایات لکھیں ہیں۔ اس حوالے سے کیا کہنا چاہیں گے؟

ج حکایات کا لکھنا میری شعری زندگی کا اہم واقعہ ہے۔ ان حکایات کے ذریعے میں نے اس دھرتی کے باشندوں کی وجودی اور تخیلاتی آزادی کی تمنا کی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ یہ عمل سماجی اور سیاسی آزادی کا باعث ہے۔

س حکایت کس طرح سماجی اور سیاسی حوالہ بن سکتی ہے وضاحت کیجیے؟

ج حکایت کا جنم کسی خطے کی آزادی سے مربوط ہے۔ حملہ آور یا فاتح سب سے پہلے کسی قوم کی حکایت کو نشانہ بناتا ہے۔ وہ اپنی حکایت کو مسلط کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ذہنی غلامی کا آغاز ہوتا ہے۔ آریاؤں نے رگ وید کے ذریعے سندھ وادی سے آگے گنگا جمنا کے میدانوں تک اپنی دھاک بٹھائی، رامائن آریاؤں کا عروج ہے۔ جب متھرا کا راج کمار رام الوہی شخصیت بن کر ابھرا اور مقامی راون معتوب ٹھہرا لیکن مہابھارت میں بندرابن کا کرشن ہندوستان کو واپس اپنے اصل کی طرف لے آیا۔ غلامی سے آزادی کی طرف یہ سب حکایات کا سفر ہے۔ عرب خدا کا مخصوص تصور لے کر ایران پہنچے لیکن ایران کے عظیم حکایت گو مولانا روم نے خدا اور موسیٰ کی کمال حکایات کے ذریعے تصور رب کو بدل کے رکھ دیا۔ عرب اپنی تمام تر فتوحات کے باوجود ایران کے تخیل کو فتح نہ کر سکے۔ ایران سے جنم لینے والی حکایت نے ان کی آزادی کا تحفظ کیا۔ سندھ وادی نہ صرف حملہ آوروں بلکہ ان کی حکایات کی بھی زد میں رہی۔ دوسرے الفاظ میں اس خطے کا تخیل بھی حملہ آوری کی زد میں رہا۔ یہ غلامی کی انتہائی صورت ہے۔ دنیا بھر کی حکایات کا احترام اور ان سے سیکھنے کا عمل اپنی جگہ لیکن زندہ قومیں اپنی آزادی کے لیے حکایات کو جنم دیتی ہیں۔

س آپ کے نزدیک اساطیر اور حکایات کا باہمی تعلق کیا ہے؟

ج: حکایت اساطیر کی جنم بھومی ہے۔ دنیا بھر کی اساطیر کا آغاز حکایات سے ہوا۔ رامائن نے رام اور مہا بھارت نے کرشن کو جنم دیا۔ اندر رگ وید سے نکلا۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے جو دنیا کے اہم ترین حقائق کو کھولتا ہے۔

س: آپ کی شاعری میں والد کا حوالہ نمایاں ہے۔ جبکہ والدہ آپ کی شاعری کا حصہ نہیں بن پائی۔ کیا یہ بات آپ نے محسوس کی ہے؟

ج: یہ سوال آپ نے ان دنوں پوچھا ہے جب میری والدہ کے انتقال کو بیس دن گزرے ہیں۔ میں نے اپنا پہلا سرائیکی بیت اپنی والدہ کو سنایا تھا اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرا تعارف کسی بھی سرائیکی شاعر یا ادیب سے نہیں تھا۔ والدہ نے مجھے بتایا کہ الفاظ کا موقع اور برتاؤ کیا ہوتا ہے۔ اس طرح میری شعری تربیت میں خورشید بی بی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میرے والد ملک حسن بخش کا ۱۹۷۴ء میں انتقال ہو چکا تھا اور اب ۱۹۷۶ء میں اپنی والدہ سے میں شاعری سیکھ رہا تھا۔ والد میرا اولیں محبوب تھا۔ اس کی موت نے مجھے شاعری کا راستہ دکھایا اور میں نے اسے اپنی شاعری میں دوبارہ زندہ کیا۔ ۱۰ فروری ۲۰۱۹ء باپ کی موت کے پینتالیس برس بعد ماں بچھڑ گئی۔ اس کے انتقال سے تین دن پہلے میں نے ماں کو اس کی سنائی ہوئی چار چھوٹی کہانیاں سنائیں۔ ایک کہانی میں جان بوجھ کے بھولا تو ماں نے یاد دلائی اور بتایا کہ اب مائی بڑھیا دریا کے پاس جائے گی۔ اگلے دن پھر وہی کہانیاں سنائیں اور مجھے لگا کہ کہانی واپس اپنے گھر پہنچ گئی۔ آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں کہ میری شاعری میں بے شک والد کا تذکرہ نمایاں ہے لیکن اس کا سارا سلیقہ میری ماں جیسا ہے۔

س: اپنی کوئی تازہ تخلیق قارئین کے لیے شیئر کریں۔

ج: ایک حکایت پیش خدمت ہے جسے منورآکاش نے سرائیکی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

اندھی ڈولفن اور ملاح

سندھ کی ایک اندھی ڈولفن ملاح پر عاشق ہوئی۔ پھر اس کے عشق نے پانی میں آگ

لگادی۔دریا کے دیوتا نے اسے بلایا اور تین میں سے ایک چناؤ اُسے دیا:

(۱) وہ چاہے تو ملاح ایک ڈولفن بن جائے۔

(۲) وہ چاہے تو خود عورت بن جائے۔

(۳) اُسے آنکھیں دوبارہ مل جائیں۔

دریا کے دیوتا نے ملاح کو الگ سے بلایا اور یونہی تین میں سے ایک چناؤ اُسے بھی دیا۔

(۱) ڈولفن عورت بن جائے۔

(۲) وہ خود ڈولفن بن جائے۔

(۳) ڈولفن کو آنکھیں دوبارہ مل جائیں۔

اب ڈولفن اور ملاح ایک کشتی میں رہتے ہیں۔ ملاح نے ڈولفن کے لیے آنکھیں منتخب کیں اور ڈولفن نے عورت ہونا چنا۔

سلیم شہزاد

س سلیم شہزاد کون ہے؟

ج سلیم شہزاد ادب کا ایک طالب علم ہے جو حرف اور ذات کے معنی کی کھوج میں سرگرداں ہے۔حرف کا ابہام اور ذات کا الہام اس کے لیے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔

س ادب کی انسانی زندگی میں کیا اہمیت ہے؟

ج ادب زندگی کا ہی پرتو ہے۔ادب کی مہک سے زندگی کے شعلے میں لپک پیدا ہوتی ہے۔بے جان پرچھائیوں کو زندگی کی حرارتیں ادب کی سانسوں سے ملتی ہیں۔اگر ادب نہ ہو تو زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

س آپ ابتدا میں غزل کے شاعر تھے مگر بعد میں نثری نظم پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ غزل جیسی مقبول صنفِ سخن کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔اس انقلاب کی وجوہات کیا ہیں؟

ج گھڑے گھڑائے سانچے مجھے اپیل نہیں کرتے۔مجھے اپنی شاعری کے لیے اظہار کے نئے سانچے درکار تھے۔زندگی کے جن پہلوؤں پر میری نظر جاتی ہے ان کی جہتیں غزل میں منکشف نہیں ہوتیں۔یہی وجہ ہے کہ نثری نظم نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔

س کیا اعلیٰ ادب اپنی ماں بولی میں ہی لکھا جا سکتا ہے؟

ج یقیناً کچھ لوگوں کے لیے ایسا ہی ہوگا لیکن یہ ضروری نہیں۔زبان ایک ذریعۂ اظہار ہے اور اعلیٰ ادب کسی بھی زبان میں ظہور پذیر ہو سکتا ہے بشرطیکہ آپ اس زبان پر قدرت رکھتے ہوں۔

س بہت سے شعراء نے اُردو میں اعلیٰ ادب تخلیق کیا جبکہ وہ ان کی ماں بولی نہیں تھی۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج آپ درست فرما رہے ہیں۔ ایسا ہی ہے اور اس کی ایک بڑی مثال ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ہیں۔

س سرائیکی میں شاعری کے علاوہ دیگر اصناف میں ادب کیوں نہیں تخلیق ہو رہا، یا جو ہو رہا ہے اس کی مقدار اور میعار دیگر علاقائی زبانوں کی نسبت کم ہے۔

ج سرائیکی زبان میں پچھلے دس سال سے تقریباً سبھی اصناف میں بہت اعلیٰ ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس کے مقابلے میں پاکستان کی دیگر قومی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب کا تناسب زیادہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قومی سطح پر سرائیکی زبان کی پذیرائی کم ہے جس کی وجہ سے سرائیکی ادیب شناخت کے بحران کا شکار ہے۔

س آپ کی کن کتب کو اب تک صدارتی ایوارڈ مل چکے ہیں اور ان میں کیا منفرد اور نیا ہے؟

ج پیریں ٹرداشہر (سرائیکی نظمیں) قومی ادبی ایوارڈ ۲۰۰۷ء

گھان (سرائیکی ناول) قومی ادبی ایوارڈ ۲۰۱۲ء

جہاں تک ان میں انفرادیت اور نئے پن کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ پرتیں نقاد اور قاری بہتر طور پر کھول سکتے ہیں۔

س اُردو میں نثری نظم مقبول کیوں نہیں ہو پائی؟

ج آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ اردو میں نثری نظم مقبول نہیں۔ آج کے دور میں آزاد اور نثری نظم یکساں مقبول ہے۔

س خواجہ غلام فرید کو سرائیکی کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہاں

لکھا ہے کہ میں سرائیکی شاعر ہوں۔ان کی وفات تک تو سرائیکی زبان کے لیے سرائیکی کا لفظ بولا ہی نہیں جاتا تھا۔

ج آپ کی یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہاں سرائیکی کا لفظ بہت بعد میں مستعمل ہوا لیکن اس زبان کے لیے لفظ ''سرائیکی'' سندھ میں پہلے ہی سے استعمال ہو رہا تھا۔ تاہم، جنوبی پنجاب میں یہ زبان ہر خاص و عام کی بولی تھی اور اب بھی ہے لیکن اس کے لیے ریاستی، بہاولپوری اور ملتانی وغیرہ کا نام استعمال ہوتا تھا۔ سچل سرمست کی سرائیکی کافیاں اس چیز کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔مزید یہ کہ ابوالفضل کی آئین اکبری میں جس ملتانی زبان کا ذکر ہوا ہے وہ یہی سرائیکی زبان ہے جو کہ انڈس ویلی میں بولی جاتی تھی اور خواجہ غلام فرید کی شعری عظمت اس زبان کی مرہونِ منت ہے۔

س کیا پنجاب میں بولی جانے والی ساری زبانیں پنجابی نہیں ہیں؟

ج پنجاب جغرافیائی اعتبار سے بہت سی اقوام کا مسکن ہے۔اس میں پنجابی بولی جاتی ہے جبکہ سرائیکی اور پوٹھوہاری جیسی زبانیں نا صرف پنجاب میں بولی جاتی ہیں بلکہ پنجاب کی جغرافیائی حدود سے باہر دیگر صوبوں میں بھی بڑے پیمانے پر بولی اور لکھی جاتی ہیں۔اور ان قومی زبانوں کی شناخت عوامی اور حکومتی سطح پر تسلیم کی جاتی ہے۔

س آپ کی نظمیں، مضامین اور ساخت کے لحاظ سے بالکل منفرد ہیں اور ان کا ابلاغ فوری نہیں ہے۔اس مشکل پسندی کی وجہ؟

ج جس طرح ہر شخص کے ہاتھوں کی لکیریں منفرد ہوتی ہیں اسی طرح ہر شاعر کی تخلیق کی دنیا مختلف ہوتی ہے۔وہ اپنی دنیا سے مخاطب ہوتا ہے تو اسے ابلاغ کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔مشکل اس وقت آن پڑتی ہے جب قاری سہل پسندی کا شکار ہو۔عروسِ معنی کو بے نقاب دیکھنے کی حسرت میں حسنِ مستور کی دلربائی اسے راستے کی دیوار لگنے لگتی ہے۔

س آپ سرائیکی زبان اور اس کے ادب کا مستقبل کیا دیکھ رہے ہیں؟

ج سرائیکی زبان وادب کا مستقبل واضح اور روشن ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرامز کے تحت سرائیکی زبان وادب پر ریسرچ ہو رہی ہے۔

س مستقبل میں شاعری کی مقبول صنف غزل ہوگی؟ نظم آزاد، نثری نظم یا کوئی اور؟

ج ہر صنف اپنی اپنی جگہ پر فروغ پذیر ہوگی۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ کس صنف کو کتنا اچھا شاعر میسّر ہوتا ہے۔

س ادب میں تنقید کیا اہمیت ہے؟

ج تنقید ہی تو ادب میں نکھار پیدا کرتی ہے۔ اگر تنقید نہ ہو تو ادب جامد ہو جائے گا اور ادب میں آگے بڑھنے کے امکانات معدوم ہوتے جائیں گے۔

س ۹۰ء کی دہائی کے بعد جو شاعری منظر عام پر آئی ہے، آپ اُس سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج نئے ہزاریے کی آمد پر ذرائع ابلاغ کی ترسیل بے پناہ بڑھ گئی ہے جس نے ۹۰ء کی دہائی کے شعراء کو نئے ذائقوں کی شاعری سے روشناس کرایا۔ لہٰذا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۹۰ء کی دہائی کے بعد لکھنے والے اہم ناموں کے ہاں شعری رجحانات میں بین الاقوامی تحاریک کے اثرات باآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔

س ادبی رسائل کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

ج ادب میں نئی نسل کی دل چسپی کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ادبی رسائل کی اہمیت برقرار رہے گی۔

س کیا نیا ادبی منظر نامہ مکمل طور پر فیس بک سے اور انٹرنیٹ سے وابستہ ہو چکا ہے؟

ج فیس بک اور انٹرنیٹ سے رابطے اور رسائی کی سہولت بڑھتی ہے لیکن نئے ادبی منظرنامے میں بھی انہیں کتاب اور ادبی رسائل کا متبادل نہیں کہا جا سکتا۔

س کیا مشاعروں کا انعقاد ہونا چاہیے؟

ج: مشاعرہ ایک روایت اور تربیت کا سلسلہ ہے۔لہٰذا میرے خیال میں مشاعروں کا انعقاد ایک مثبت رجحان ہے۔

س: سرائیکی زبان وادب کو کس طرح بہتر طور پر فروغ دیا جا سکتا ہے؟

ج: سرائیکی زبان کو سب سے پہلے ابتدائی تعلیم کا حصہ بنانا چاہیے تا کہ لوگ اپنی قومی زبان کی اہمیت سے روشناس ہو سکیں۔اس کے ساتھ ساتھ اخبارات کے ادبی ایڈیشن اور ادبی رسائل سرائیکی زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

س: جنوبی پنجاب صوبے کی تحریک آج کل عروج پر ہے۔کیا آپ صوبہ جنوبی پنجاب یا سرائیکی صوبہ یا نئے صوبے بننے کے حق میں ہیں؟

ج: ضرور بننا چاہییں۔بالکل بننا چاہییں۔میں اس حق میں ہوں کہ انتظامی بنیادوں پر نئے صوبے ضرور بننا چاہئیں۔پنجاب ایک بہت بڑا صوبہ ہے جو دنیا کے کئی ممالک سے بھی بڑا ہے،جس کا انتظام کسی ایک مرکز سے درست طور پر نہیں چلایا جا سکتا۔یہی وجہ ہے کہ آج جنوبی پنجاب بے حد پسماندہ اور شدید احساسِ محرومی کا شکار ہے۔جنوبی پنجاب سے آج دو آوازیں اٹھ رہی ہیں۔بہاولپور والے اپنے صوبے کی بحالی چاہتے ہیں تو سرائیکی بجا طور پر اپنا حق مانگ رہے ہیں۔تیسری طرف پوٹھوہار والوں نے اپنی آواز بلند کی ہے۔میرا خیال ہے کہ دو یا دو سے زاید صوبے بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔اس پسماندگی اور احساسِ محرومی ختم ہو گی۔

س: اپنے ادبی سفر سے متعلق کچھ بتائیے اور مستقبل میں کن کتب کے آنے کا امکان ہے؟

ج: ۱۹۷۴ء سے شاعری کا آغاز کیا۔اب تک ۸ کتب شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ ماسوا (اردو نظمیں)

۲۔ قسم ہے کفارے کی (اردو نظمیں)

۳۔ معدوم سے معلوم تک (تاریخ ضلع بہاول نگر)

۴۔ پیریں ٹُر دا شہر (سرائیکی نظمیں)

۵۔ گھان (سرائیکی ناول)

۶۔ پلوتا (سرائیکی ناول)

۷۔ نیندر بھجیاں نظماں (پنجابی نظمیں)

۸۔ نئے ادب کا معمار۔انیس ناگی (مرتب شدہ)

آنے والی کتب: (۱) منتخب سرائیکی افسانوں کے اردو تراجم

(۲) کٹی پوروں سے بہتی نظمیں (اردو)

س کیا کتاب خیال و خواب ہو جائے گی؟

ج قطعاً نہیں ۔ کتاب کا لمس ہی ایک ایسا سحر رکھتا ہے کہ کتاب کبھی خواب و خیال نہیں ہوسکتی۔

س نثری نظم کے جواز میں کیا کہیں گے؟

ج نثری نظم اپنا جواز آپ ہے۔اگر نثری نظم اہم صنف نہ ہوتی تو ن۔م راشد، شہزاد احمد اور محمد اظہار الحق جیسے بڑے شاعر اس صنف میں طبع آزمائی نہ کرتے۔نثری نظم دراصل انسان کی صلاحیتِ کلام کے فطری آہنگ سے قریب تر ہے اور اسی بنا پر الہامی کتب میں بھی یہ آہنگ بکثرت پایا جاتا ہے۔

س نئے لکھنے والوں کے لیے چند نصیحتیں اور مشورے جس سے وہ مستقبل میں اپنی تخلیقات اور ادبی سفر کو بہتر کر سکیں۔

ج مطالعہ کریں۔زیادہ سے زیادہ موضوعات پر کتب پڑھیں۔راتوں رات مشہور ہونے کی دوڑ میں شرکت کرنے کے بجائے ادب شناسی کے لیے محنت اور صبر کا راستہ اختیار کریں۔ میں یہ راستہ اختیار کر کے آج نام وری حاصل کرنے والے یہاں بہاول نگر کے چند شعرا اور ادیبوں کے نام ضرور لینا چاہوں گا۔اِن میں عامر سہیل، ناصر کریم، اعجاز ثاقب، اسد زیدی، یاسر اقبال اور وسیم تاشف شاعری میں جب کہ نثری ادب میں نجم الدین احمد شامل ہیں۔

سلیمان عبداللہ ڈار، ڈاکٹر

س اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

ج میرے خیال میں تو ابھی زندگی شروع ہی نہیں ہوئی۔ میں چاہتا تھا اردو ادب میں ایم فل یا پی ایچ ڈی کروں۔ یونیورسٹی میں چھوٹا سا گھر ہو۔ میں زیادہ امیر نہ بھی ہوتا مگر گھر کے دروازے پر عشق پیچاں کی بیل ہوتی۔ میں پنجاب یونیورسٹی میں نہر کے کنارے بیٹھ کر غزلیں، نظمیں اور افسانے لکھتا۔ ابتدائی زندگی علی پور چٹھہ ضلع گوجرانوالہ میں گزری۔ گوجرانوالہ سے ایف ایس سی کی۔

س آپ نے ادبی زندگی کا آغاز کس صنف سے کیا؟

ج گوجرانوالہ میں ایف ایس سی کے دوران ہمارے اردو کے اساتذہ نے اُردو ادب سے ایسی محبت دل میں پیدا کی کہ غزل لکھنا شروع کی۔ اساتذہ سے اصلاح لیتے رہے۔ کالج کے مجلّہ میں شائع ہوتے رہے۔

س ابتدا میں کس سے متاثر تھے؟

ج کم سنی میں ہی شفیق الرحمٰن اور دوسرے مزاح نگاروں کو پڑھا۔ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا گھر میں اخبار نہیں آتا تھا۔ گلی کی نکڑ پر ایک ٹی اسٹال سے نوائے وقت پڑھتا۔ خصوصاً ''روزنِ دیوار سے'' ایف ایس سی میں مزاحیہ مضامین لکھے۔ شفیق الرحمٰن اور عطاء الحق قاسمی صاحب کی تحریریں تو بس جکڑ لیتی تھیں۔ لڑکپن میں عبدالحمید عدم کو بڑی محبت سے پڑھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ ہمارے قریبی قصبہ تلونڈی موسیٰ خاں کے تھے۔

س شعر و ادب کی طرف رجحان کیسے پیدا ہوا؟

ج: بچپن میں ہی کھیل کود کا کوئی شوق نہ تھا میری کوئی ہم نصابی سرگرمی نہ تھی میرے بھائی غضب کے کرکٹر اور فٹ بالر تھے مگر میں نے کبھی کوئی گیم نہ کھیلی بس رسائل لے کر پڑھتا تھا یا محلے کی ''آنہ'' لائبریری سے بچوں کی دنیا لے کر پڑھتا تو بہت انجوائے کرتا۔ ایف ایس سی میں مرقع اردو نے ایک ایسا دل بستگی کا سامان بہم پہنچایا کہ یہ درسی کتاب پوری کی پوری یاد تھی۔ ایک بار کوئی شعر یا نظم سنتا تو اسی وقت ہو بہو ساری غزل یا نظم زبانی سنا دیتا۔ کالج میں مجھے ٹیوٹریل گروپ کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ جہاں میں ہر ہفتے اپنی تازہ غزل سناتا جس کی اصلاح میں اپنے اردو کے پروفیسر صاحب سے کروالیا کرتا تھا۔ والد گرامی کالج آتے تو اساتذہ سے کہتے کہ میں تو بیٹے کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں آپ اسے شاعر بنا رہے ہیں۔ میں نے تو شاعروں کو بھوکے مرتے ہی دیکھا ہے۔ میرے پروفیسر مسکرا کر ابا جی سے کہتے ''آج کل تو کروڑوں اربوں میں کھیلنے والے شاعر اور ادیب موجود ہیں۔''

س: شاعری میں آپ کس صنف میں لکھتے ہوئے سہولت محسوس کرتے ہیں؟

ج: پچھلے پچیس سال سے مزاح لکھ رہا ہوں۔ اردو ادب میں مزاح لکھنے والے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مزاح لکھنا مشکل گردانا جاتا ہے لیکن مجھے اس سلسلے میں کبھی ذہنی یا قلمی دقت محسوس نہ ہوئی۔ پچھلے دس سال میں اللہ والوں کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہوا۔ میں حضرت واصف علی واصف سے ان کی زندگی میں ملتا رہا۔ نثر پاروں پر مشتمل میری کچھ کتب بھی شائع ہوئیں۔ منہ اور قلم کا ذائقہ بدلنے کے لیے نظم اور غزل بھی لکھی۔ سفرنامے بھی لکھے لیکن سہولت فقاہیہ تحریر ہی میں نظر آتی ہے۔ ویسے بھی ایک مسکراہٹ نفرتوں کے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے تو سوچتا شاید میری تحریر بھی کسی قاری کی زندگی میں یہ معجزہ برپا کر سکے۔

س: موجودہ دور میں ادیب کی کیا ذمہ داری بنتی ہے؟

ج: ادیب معاشرے کا نباض ہوتا ہے۔ ایک Committed ادیب کو اپنی نسل اور قوم کے نوجوانوں کی ذہنی قلبی روحانی معاشرتی اور سیاسی بیداری کے لیے آبیاری کرنا

ہوگی۔ جہاں ہمیں اچھے انجینئرز، ڈاکٹر، وکلاء اور لیڈرز چاہئیں وہاں ہمیں عظیم ادیب، مصور، شاعر، موسیقار اور دانشور بھی چاہئیں۔ زندہ قوموں کی تو یہی روایات ہوتی ہیں۔ اقوامِ عالم میں اگر سر اُٹھا کر کھڑا ہونا ہے تو ہمارے ادیب کو ذمہ دار ہونا ہوگا۔ ہمارا اعظیم ادیب قوم کی سوچوں کا رُخ موڑ سکتا ہے۔ جو ترقی پر منتج ہوگا۔ ایک شاعر پاکستان کا مصور ہو سکتا ہے تو شعراء اور ادباء اسے ایک ترقی یافتہ ملک بھی بنا سکتے ہیں۔

س آپ کے اندر طنز و مزاح فطری طور پر موجود ہے۔ باقی اصناف کی نسبت اس صنف میں کم کیوں لکھا جارہا ہے؟

ج ادب میں مزاح خاصے کی چیز ہے۔ میں نے بچپن میں ذہنی تلذذ کے لیے بھی مزاح نگاروں کو پڑھا۔ پھر کچھ حاصل کرنے کے لیے دوبارہ پڑھا۔ انگلش مزاح نگاروں میں پی جی وڈ ہاؤس کو اور مارک ٹوئن کو پڑھا۔ مارک ٹوئن لکھتے ہیں بچپن میں ہم اتنے غریب تھے کہ راکھی کے لیے کتا نہ رکھ سکتے تھے۔ اس لیے رات کو اگر ہمارے گھر کوئی چور آ جاتا تو مجھے بذاتِ خود اور بقلم خود بھونکنا پڑتا تھا۔ شستہ شگفتہ اور بے ساختہ مزاح لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اسی لیے اس صنف میں کم لکھا جارہا ہے۔

س محبت ایک پٹا ہوا موضوع ہے۔ اس کے متعلق جدید ادبی تخلیقات میں کیا تبدیلی ہے؟

ج محبت کا جو رُخ دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ میں تھا بانکے پان کھا کر سلیم شاہی جوتے اور چوڑی دار پہن کر پالکی میں بیٹھ کر مشاعروں میں بل کھاتی لچکیلی کمر یا کے ساتھ لہراتے ہوئے ناز و انداز سے جاتے تھے۔ وہ دور تو غالب کے بعد ختم ہوگیا اور جب فیض نے کہا کہ

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے تو

تو محبت کا منظر نامہ یکسر بدل گیا۔ اس دور میں محبت کرنے والے نوجوان کو محبوب کی بجائے روزگار اور تنخواہ کی فکر رہتی ہے۔

کس ضرورت کو دباؤں کسے پورا کر لوں
اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے

گل وبلبل کے قصے نظم کرنے والے شاعر کو بھی اب بھوک بیماری جہالت جنگ خودکش دھماکوں اور دہشت گردی کے موضوعات پر لکھنا ہوتا ہے اور یوں محبت اک ثانوی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔ بلکہ اب تو محبتیں کمرشلائز ہوگئی ہیں۔ خلوص عنقا ہوگیا بلکہ رُخصت اتفاقیہ پر چلا گیا۔

س ادب کی ترویج کے لیے قائم اداروں کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

ج میں نے کچھ ملکوں کی سیاحت کے دوران بھارتی سیاحوں کو اپنی کتب پیش کیں تو اُردو بولنے والے اردو فلمیں دیکھنے والے یہ لوگ میری اردو کتب کو پڑھ نہ سکے۔ وہ مردم شماری کے وقت اپنی زبان ہندی لکھتے ہیں۔ بھارت میں تو بہت حد تک اردو کا ''تمت بالخیر'' ہونے والا ہے۔ پاکستان میں پچھلے بیس سال سے انگلش سکولوں نے طلباء کو سپوکن انگلش کا ایسا ہیضہ کروایا ہے کہ نئی نسل میں سے ۹۰ فیصد نوجوان طلباء کو اردو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ان حالات میں مقتدرہ اور اکادمی ادبیات کے علاوہ اورینٹل کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کو شعروادب کی ترویج کے لیے ہنگامی اقدامات اُٹھانا ہوں گے ورنہ اردو ہمارے ہاں بھی ناپید ہوجائے گی۔ اداروں کی کارکردگی ہے ہی نہیں تو اطمینان کہاں ہوگا۔ اردو سائنس بورڈ کو بھی ہمیں فعال بنانا ہوگا۔

س کیا ادیب کو نظریاتی ہونا چاہیے؟

ج جی ہاں! مگر متعصب اور متشدد نہیں ہونا چاہیے۔ ادب کی چاشنی پہلے ہو نظریہ بعد میں ہو یا بین السطور ہو۔ سرسیّد احمد کی طرح نہ ہو کہ وہ مصلح پہلے تھے ادیب بعد میں۔

س ڈاکٹر سلیمان عبداللہ اور ادیب سلیمان عبداللہ میں کیا فرق ہے؟

ج میرے متعلق جیسے عطاء الحق قاسمی صاحب نے لکھا کہ ادیب وہ پہلے سے ہے ڈاکٹر تو بعد میں بنا۔ ڈاکٹر سلیمان عبداللہ دو اور دو چار کہتا ہے۔ ادیب سلیمان عبداللہ دو اور دو بائیس ہوں تو انہیں بھی بجا اور ٹھیک سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان بے ترس ہو کر چیرا لگاتا ہے اور ادیب سلیمان کسی کو ذرا سی تکلیف میں دیکھے تو اس کا دل بھر آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان مریضوں

میں ہو اور ادیب دوست آجائیں تو اس کا ہسپتال ادبی ڈیرے میں کنورٹ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان سپرٹ کی بو میں رہتا ہے ادیب سلیمان بادِصبا اور گلاب کی خوشبو میں خراماں خراماں معطر معطر رہنا چاہتا ہے۔

س موجودہ دور میں اگر ن م راشد فیض اور مجید امجد ہوتے تو کیا انہیں موجودہ مقام مل پاتا؟

ج ن م راشد میرے قصبہ علی پور چٹھہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک یہاں سے کیا جن دنوں ''ایران میں اجنبی'' شائع ہوئی تو علی پور آئے۔ میرے ابا جی ہیڈ ماسٹر تھے۔ انہیں مل کر دسویں کے کمرے میں وہ ڈیسک بھی دکھایا جہاں وہ بیٹھتے تھے۔ پچھلی نصف صدی میں ہونے والی ہوشربا ترقی میں اگر یہ شعراء ہوتے تو صرف تھوڑے عرصہ کے لیے معروف ہوتے۔ پھر گمنامی منہ کھولے انہیں دیکھ رہی ہوتی۔ مثال کے طور پر غالب اگر دو سو سال بعد بھی ادب میں ''اِن'' ہیں تو کیا اب سے دو سو سال بعد پروین شاکر بھی اسی طرح ''اِن'' ہوں گی؟ کبھی نہیں! دنیا جتنی تیزی سے افراتفری اور ''ہرفلی'' میں ہے آئندہ آنے والے دور میں کھیل سیاست یا ادب کے میدان میں معروف ہونے والا بندہ انٹرنیٹ اینڈرائیڈ موبائل آئی کان وٹس ایپ، ٹیب لیٹ اور فیس بک پر صرف ۱۵ منٹ کے لیے مشہور ہوگا اور پھر اس کی جگہ کوئی اور لے لے گا۔ مگر یہ بھی اک حقیقت ہے کہ موجودہ دور ن۔م۔ راشد مجید امجد اور فیض پیدا کر ہی نہیں سکتا۔

س کیا ادیب کا سیاست میں کردار ہونا چاہیے؟

ج جس ملک کی قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت جہلا کی ہو اور ان کی بی اے کی ڈگریاں جعلی نکلیں تو اس ملک میں سیاست کے میدان کو خالی کیوں چھوڑا جائے۔ اس میں ادیب اور شاعر کو ایک دانشور کی حیثیت سے حصہ لینا ہوگا کہ ہمارے سیاسی نظام میں صرف جاگیردار اور ناجائز منافع خور امراء ہی اسمبلی تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر ادیب اس میدان میں آتے رہیں گے تو کسی نہ کسی روز ہماری قوم کو بھی عقل آجائے گی جیسے برطانیہ کی مدر پارلیمنٹ میں یونیورسٹی کے پروفیسرز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوتے ہیں۔ چار سال قوم کی

خدمت کرتے ہیں۔ پھر واپس اُسی یونیورسٹی میں پڑھانے کے لیے چلے جاتے ہیں۔

س آپ کا نظریہ ادب کیا ہے؟

ج منافقت نہ ہو دھڑے بندی نہ ہو ادبی جنگ و جدل نہ ہو۔ نوآموز لکھاریوں کی حوصلہ افزائی ہو۔

س آپ کے خیال میں ادارہ ارژنگ کو وہ کون سا سوال پوچھنا چاہیے تھا جو ہم نے نہیں پوچھا؟

ج میرے خیال میں آپ کو پوچھنا چاہیے تھا کہ اگر مجھے دوبارہ زندگی ملے تو میں کیا بننا پسند کروں گا۔ تو میرا جواب ہوتا میں ڈاکٹر خواجہ زکریا، اشفاق احمد، عطاء الحق قاسمی اور واصف علی واصف بننا پسند کرتا۔ شعر وادب کی ترویج میرا مشن ہوتا۔ یہی میری زندگی ہوتا۔

س قارئین کے لیے کوئی پیغام!

ج میر کارواں بنیں۔

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

ظفر اسلام

س آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی؟

ج میں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر شیخوپورہ میں حاصل کی۔ گریجوایشن بھی اسی شہر کے گورنمنٹ کالج سے کیا۔ بعد میں بسلسلہ روزگار سعودی عرب چلا گیا تو تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔

س آپ کو کب احساس ہوا کہ آپ کے اندر تخلیق کار موجود ہے؟

ج مجھے بچپن سے ہی میوزک سے بہت دلچسپی تھی۔ پھر جیسے بڑا ہوتا گیا تو میرا رجحان فوک میوزک اور صوفیانہ کلام کی طرف بڑھتا گیا لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں خود بھی کبھی لکھوں گا۔ ایک دن میں ویسے رات کے وقت سڑک پر تنہا گھوم رہا تھا کہ چند لائنیں ذہن میں آئیں۔ میں نے ان کو ڈائری میں لکھ لیا۔ پھر ایک روز میرا بھائی جو کہ برطانیہ میں رہتا ہے پاکستان آیا تو میں نے اس کو وہ لائنیں سنائیں تو اس نے بے ساختہ کہا ''یہ تو شاعری ہے'' وہ لائنیں اس وقت تو مجھے یاد نہیں۔ البتہ ڈائری میں آج بھی لکھی ہوئی ہیں۔ بھائی کا بے ساختہ جملہ سن کر مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر تخلیق کار موجود ہے۔

س کیا گھر کا ماحول ادبی تھا۔ عموماً بچے سب سے پہلے گھر کے ماحول کا اثر قبول کرتے ہیں۔

ج والدین اور سب بہن بھائی تعلیم کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس لیے اسکول کی کتب میں جتنا ادب تھا ابتدا میں اُس کا اثر لیا۔ البتہ گھر میں ادبی کتب کبھی نظر نہیں آئیں۔ گھر کے قریب ایک پرائیویٹ لائبریری تھی جہاں میں جا کر کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے پہلے بچوں کا ادب اور پھر بڑے ادیبوں میں نسیم حجازی، عنایت

اللہ، رضیہ بٹ، ابن صفی کی کتب پڑھ لی تھیں۔

س باقاعدہ شاعری کا آغاز کب ہوا؟

ج جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ گریجویشن کے بعد میں سعودی عرب چلا گیا اور الیکٹرونکس کے بزنس سے وابستہ ہو گیا۔ وہاں فیملی کے بہت سے لوگوں کی موجودگی کے باوجود عجیب وغریب سی تنہائی مجھے گھیرے رکھتی تھی۔ لہٰذا میں نے اس تنہائی کا اظہار شاعری لکھ کر شروع کر دیا لیکن میرے اندر یہ بات پہلے سے موجود تھی کہ اس کا کوئی نہ کوئی وزن ہوتا ہے۔ ابتدا میں تو میں اوپر اور نیچے والے مصرعے کے لفظ گن لیا کرتا تھا بعد میں پاکستان آیا تو عروض کے حوالے سے تلاش جاری رہی کہ اس کا پتہ چلنا چاہیے۔ اسی سلسلے میں روحی کنجاہی سے ملاقات ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے بھی ملا۔ بہت مفید مشورے ملے۔ مگر کسک باقی رہی۔ سو اپنے ہی شہر میں جناب صدیق تاثیر سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

س کس صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور پہلی تخلیق کہاں شائع ہوئی؟

ج ابتدا تو غزل سے ہی کی تھی اور زیادہ تر شاعری بھی اسی صنف میں ہے۔ البتہ اب رجحان نظم کی طرف بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ شروع میں اردو شاعری کے بعد پنجابی زبان کو ہی اپنے اظہار کا مستقل وسیلہ بنا لیا۔ کیونکہ اس میں مجھے شاعری کرنے میں سہولت محسوس ہوتی ہے۔ پہلی غزل جمیل پال کے میگزین ''سویر'' میں شائع ہوئی۔

س آپ ادبی گروہ بندیوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج میرے خیال میں یہ فطری ہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خود غرض ہے اور اسی تناظر میں آپ دیکھیں کہ بچے بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور باتوں میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اسی طرح ادیبوں کی لڑائیوں کی بھی بہت سی وجوہات ہیں۔ معاشی مفاد ہیں۔ معاشرتی مفاد ہیں۔ خود نمائی اور پذیرائی کے معاملے میں میڈیا پر نظر آنے کے مسائل ہیں۔ مشاعرے ہیں اس لیے جہاں مفادات کا ٹکراؤ ہو گا وہاں گروہ بندیاں ہوں گی۔ سو مثبت سوچ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انہی گروہ بندیوں میں رہتے ہوئے بھی ایسی ادبی فضا پیدا کی جا

سکتی ہے جس سے بڑا ادب تخلیق پائے۔

س کیا آج کا ادیب عصر حاضر کے تقاضے پورے کر رہا ہے؟

ج عصری ادب تخلیق کرنے کی حد تک تو کر رہا ہے موجودہ صدی کے انسان کو جن مسائل کا سامنا ہے اس کا اظہار، شاعری، ناول اور افسانے کے علاوہ ادب کی دیگر اصناف میں بھی ہو رہا ہے۔ مگر عملی طور پر ادیب اس میں زیادہ کوشاں نظر نہیں آتا۔ اس حوالے سے بھی اُسے سرگرم ہونے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس کے کردار کی اہمیت میں اضافہ ہو۔

س آپ عصر حاضر کا بڑا شاعر کسے مانتے ہیں؟

ج یہ بڑا عجیب وغریب اور اُلجھا ہوا سا سوال ہے۔ بچپن میں آپ کے نزدیک بڑا ادیب وہی ہوتا ہے جسے آپ پڑھ رہے ہوتے ہیں بعد میں جیسے جیسے مطالعہ اور مشاہدہ بڑھتا جاتا ہے آپ کے آئیڈیل بھی بدلتے جاتے ہیں۔ پھر یہ ہے کہ موضوعات کے حوالے سے مختلف موضوعات پر مختلف ادیبوں اور شاعروں کا کام بڑا ہوتا ہے۔ بہر حال جواب کو آسان بناتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ اس وقت میرے پسندیدہ شاعر منیر نیازی ہیں۔ عصر حاضر کے بڑے شاعر کا فیصلہ کسی اور سے کروالیں میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔

س ادبی تقاریب میں کس حد تک شریک ہوتے ہیں؟

ج ادبی تقریبات میں شریک ہونے کا زیادہ شوق نہیں اور پھر آسٹریلیا میں تو تقریبات ہوتی بھی کم اور کبھی کبھار ہیں۔ اس لیے چلا جاتا ہوں۔ صرف اس غرض سے کہ شاید کچھ سیکھنے کو مل جائے۔ کیونکہ بڑے بڑے ادیب آسٹریلیا آتے رہتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے ہم جونیئرز کو سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

س ادب کے فروغ اور ترویج کے لیے میڈیا کے کردار سے مطمئن ہیں۔

ج ادب کے فروغ اور ترویج میں میڈیا کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان میں نیوچینلز کی بھرمار ہے۔ مگر ایسے چینلز بہت کم ہیں جو صحیح معنوں میں اچھے اور تعمیری پروگرام پیش کریں۔ گزشتہ چند دہائیوں میں بڑے

بڑے ادیب اور نابغہ روزگار ہستیاں چلی گئی ہیں۔ ان چینلز نے کسی کی زندگی اور یادوں کو محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فضول پروگرام نشر کرتے رہتے ہیں۔ مگر ادبی پروگراموں کو اہمیت نہیں دیتے۔ لے دے کے پی ٹی وی پر ایک پروگرام نشر ہوتا ہے وہ بھی اتنا معیاری نہیں ہے۔ ادب کے لیے علیحدہ چینلز کی ضرورت ہے۔

س آپ آسٹریلیا میں کب سے مقیم ہیں اور وہاں کی ادبی فضا کیسی ہے؟ وہاں آپ کون سی تنظیم سے وابستہ ہیں؟

ج میں آسٹریلیا میں گزشتہ ۱۸ سال سے مقیم ہوں۔ یہاں کی واحد معروف اور بڑی ادبی تنظیم اردو سوسائٹی آف آسٹریلیا ہے جس کا پہلے ۶ سال رُکن رہا۔ اس کے تحت کافی ادبی پروگرام منعقد ہوئے۔ پھر الیکشن میں اسی تنظیم کا میں جنرل سیکرٹری منتخب ہوا جو کہ گزشتہ چار سال سے ہوں۔ اس کے موجودہ صدر غلام عباس گیلانی ہیں۔

ماہی آرٹس اینڈ کلچر کے قیام کو اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ یہ سفر چند برسوں پر محیط ہے۔ پھر بھی اس کے زیر انتظام بہت سے یادگار پروگرام کرا چکا ہوں۔ اس کے قیام کی وجہ یہ تھی کہ یہاں آسٹریلیا میں انڈین کمیونٹی کے ایسے پلیٹ فارم موجود ہیں جس میں انڈین کلچر کو پرموٹ کیا جاتا ہے اور بالی وڈ کے فن کار یہاں آتے رہتے ہیں۔ تو مجھے خیال آیا کہ ایک پلیٹ فارم ایسا بھی ہونا چاہیے جہاں پاکستانی فنکاروں کی بھی پذیرائی ہو اور یہاں پاکستانی ادب اور کلچر کے لیے کام کیا جائے۔ لہٰذا پاکستانی اسٹیج ڈرامے کو آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں پہلی بار میں نے متعارف کرایا۔ اب تک جو فن کار اس پلیٹ فارم سے یہاں پرفارم کر چکے ہیں ان میں امان اللہ، افتخار ٹھاکر، امانت چن، ناصر چنیوٹی، آغا ماجد، میگھا، ماہ نور، صائمہ خاں، ظفر خاں اور گلوکاروں میں غلام عباس اور صنم ماروی آ چکے ہیں۔ مگر یہاں توقع سے کم Response ملا۔ پاکستانی کمیونٹی کے لوگوں کو فیملی کے ساتھ تقریبات میں شرکت کرنے کی عادت نہیں ہے شاید اس لیے۔ ابھی میں نے مستقبل میں جو تقریبات کرانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے اس میں یہ ہے کہ ایک شاعر اور ایک گلوکار کو یہاں بلایا جائے اور اس کی بھرپور

پذیرائی کی جائے۔ اپریل میں انشاءاللہ آپ اور غلام عباس آ رہے ہیں۔ بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

س مستقبل میں ماہی آرٹس اینڈ کلچر جیسا کوئی اور منصوبہ ہے آپ کے ذہن میں یا کسی اور حوالے سے کام کرنے کا ارادہ ہے؟

ج مستقبل میں چیرٹی آرگنائزیشن بنانے کا پروگرام ہے۔ ویلفیئر کے حوالے سے کام کرنے کا ارادہ ہے۔ خالصتاً پاکستانی رائٹرز کے لیے ان کو میڈیکل کے حوالے سے تخلیقات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے حوالے سے ہم ان کی مالی اعانت کریں گے۔ انشاءاللہ اس کا آغاز جلد ہوگا۔

عاشق رحیل

س اپنی ابتدائی زندگی سے متعلق کچھ بتائیے۔

ج میری پیدائش مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر کے مشہور قصبے نورمحل کی ہے۔ مشہور ہے میں نے اسے اس لیے کہا ہے کہ جب نور جہاں جہانگیر کی ملکہ بنی تو اس نے اس جگہ ایک بہت بڑی سرائے بنوائی تھی۔ جس کا نام نور جہاں محل رکھا گیا تھا۔ اس کے اردگرد آبادی ہوئی تو یہ نور جہاں محل کی بجائے صرف نورمحل ہی رہ گئی۔ یہ ایک لمبی تاریخی داستان ہے۔ جو یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال نورمحل کی سرائے اب تک پورے مشرقی پنجاب میں مشہور ہے۔ یہ قصبہ نورمحل میرا ننھیال تھا۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے اس وقت کے رواج کے مطابق اپنے ننھیال میں ہی پیدا ہوا تھا۔ میرے والد صاحب اس وقت کی ریاست پٹیالہ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں کاشتکاری کرتے تھے۔ ایک تو اس قصبے میں تعلیم وتربیت کا معقول بندوبست نہیں تھا۔ دوسرے مجھے پیدا ہوتے ہی میری والدہ سے ان کی بڑی بہن نے اپنی گود لے لیا تھا۔ کیونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہ میرے والدین کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے اپنے پہلے بچے کو دوسرے کے حوالے کر دیا تھا۔ میرے بعد میرے اور بہن بھائی بھی ہوئے لیکن میں نے اسی قصبے کے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول میں ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ المیہ یہ تھا کہ میری خالہ جنہوں نے مجھے گود لیا تھا وہ بھی بیواؤں جیسی زندگی ہی گزار رہی تھیں۔ کیونکہ ان کے شوہر نے دوسری شادی کی ہوئی تھی اور وہ رہتے بھی شاید کلکتہ یا ڈھاکہ میں تھے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر تک میں اپنے آبائی شہر گیا

بھی صرف دو دفعہ تھا اور میری حقیقی والدہ بھی جب میکے آتیں تو اکثرا کیلی آتی تھیں ۔ اس طرح میں نے اپنے باپ کو خواب میں ہی دیکھے لگتا ہے ۔ میری زبان ''ابا'' کے لفظ سے ہی ناشناس ہے ۔ میری ماں اور میرا باپ میری وہی خالہ رہیں جنہوں نے مجھے اپنی حقیقی اولاد بنا کر پالا ۔ بڑھاپا اور آخری دم تک مجھے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو میں اپنی والدہ اور ماموں کے ساتھ پاکستان آ گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میری حقیقی والدہ بھی اپنی بیماری کی وجہ سے میرے ایک چھ مہینے کی عمر کے بھائی اور مجھ سے چھوٹی بہن کے ساتھ ہمارے پاس ہی آئی ہوئی تھیں ۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی آئیں اور ہم سب لاہور کے علاقہ نیلا گنبد میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے ۔ لاہور آ کر پتہ چلا کہ میرے والد اور دادی صاحبہ کوان کے قصبے میں ہی شہید کر دیا گیا ہے جن کی قبر مجھے پورا مشرقی پنجاب محسوس ہوتا۔

ہم اکتوبر یا نومبر ۱۹۴۷ء کو لاہور آئے تھے۔ چنانچہ اسی سال کسی سکول میں داخلہ لینا ناممکن تھا ۔ ۱۹۴۸ء میں مجھے مسلم ماڈل ہائی سکول موہن روڈ میں آٹھویں جماعت میں داخلہ ملا ۔ اس وقت کی یہ موہن روڈ ''اردو بازار'' بن چکی ہے ۔ یہاں مجھے بہت شفیق اساتذہ کی سرپرستی ملی جن کی شفقت سے میں نے مڈل اور میٹرک کے امتحان بہت نمایاں پوزیشن میں وظائف حاصل کر کے پاس کیے ۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا جس کی دیوار مسلم ماڈل سکول سے ملی ہوئی ہے ۔ یہاں بھی میں نے ہر امتحان میں پورے پنجاب میں اچھی پوزیشن لے کر وظائف حاصل کیے اور ایم اے ریاضی پاس کرنے کے بعد اس کالج کو چھوڑا ۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے انگلینڈ جا کر لندن یونیورسٹی سے بھی ایم ایس سی (ریاضی) کرنے کا موقع ملا ۔ اس ساری تعلیم میں میری ماں کی دُعائیں شامل تھیں ۔ گورنمنٹ کالج جو اب یونیورسٹی بن چکا میں تعلیم حاصل کرنا بڑے فخر کی بات سمجھا جاتا ہے۔ مزے اور خوشی کی بات ہے کہ تعلیم کے دوران میرا کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوا بلکہ میں نے گورنمنٹ سے وظیفوں کی صورت میں پیسے وصول کر کے تعلیم حاصل کی ۔ جس وقت میں

نے تعلیم مکمل کی اس وقت ون یونٹ قائم تھا۔ چنانچہ میں نے سروس شروع کی تو پہلے لاہور میں ہی لیکچرر ریاضی کے طور پر گورنمنٹ کالج گلبرگ میں جگہ مل گئی لیکن چھ مہینے بعد ہی مجھے مانسہرہ بھیج دیا گیا جہاں مرحوم صدیق سالک اور میں ایک ہی مکان میں رہتے رہے۔ وہاں چارسدہ جانا پڑا جہاں محسن احسان مرحوم میرے کولیگ رہے۔ پھر صوابی اور وہاں سے مردان کالج میں ایک ہی سال گزارا تھا کہ ون یونٹ ٹوٹ گیا اور میں ڈیرہ غازی خان کالج سے ہوتا ہوا گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور آ گیا اور یہیں سے ریٹائر ہوا۔ صوبہ سرحد کے قیام کے دوران پشتو سیکھی اور ساتھ ہی پشتو بولنے والی پیاری بیوی ملی جس کا پیار میرے بڑھاپے کا سہارا بنا ہوا ہے۔ جواب کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے لیکن مجبوری تھی۔

س ابتداء میں پنجابی میں لکھنا شروع کیا یا اُردو میں؟

ج لکھنے کی ابتدا میں نے اُردو سے کی۔ میری طبیعت انشائیے کی طرف مائل تھی۔ انشائیے میں جو ہلکا پھلکا طنز و مزاح پیش کیا جاتا تھا وہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی کنہیا لال کپور کی مزاحیہ تحریریں پڑھیں۔ سروس میں آیا تو مشکور حسین یاد صاحب سے میل جول تھا۔ ان کے انشائیے پڑھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کو پڑھا بلکہ ان کی زبان سے بھی سنا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی صاحب کے درمیان جس میں مرحوم انور سدید صاحب بھی شامل ہوتے تھے، ہونے والی ادبی نوک جھونک سے بھی حظ اُٹھاتا تھا۔ اُردو میں میں نے سب سے پہلے انشائیہ ''جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں'' کے عنوان سے لکھا تھا جو کراچی کے ایک اخبار کے ادبی صفحے میں شائع ہوا تھا۔ روزنامہ ''آفاق'' لاہور ہفت روزہ ''اقدام'' اور امروز کے ادبی صفحے میں بھی کچھ انشائیے چھپے۔ اردو میں ہی کچھ افسانے بھی لکھے تھے جن کا بعد میں پنجابی میں ترجمہ کر لیا گیا۔ اسی طرح انشائیہ کا بھی یہی حشر ہوا لیکن دو تین سال پہلے میں نے اپنے اردو انشائیوں کا ایک مجموعہ ''آہٹیں'' کے نام سے چھاپا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے سال میرا حج کا سفرنامہ ''تیرے روبرو'' بھی اردو میں ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ ''راوی'' میں میرا ایک بہت لمبا سفرنامہ ''کاغان کی

سیر'' بھی چھپا تھا۔ جسے بہت پسند کیا گیا لیکن اس کو پڑھ کر مجھے اے حمید کا مقلد کہا گیا جس کی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ اے حمید مرحوم کی تحریروں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ کچھ سال اردو میں طبع آزمائی کی پھر پنجابی زبان کے بہت مخلص لکھاری جناب آصف خان صاحب کے کہنے پر میں پنجابی ماں بولی کی طرف آ گیا اور اب اس کی بھی خدمت کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ اُردو پڑھ بھی رہا ہوں اور ضرورت پڑنے پر لکھ بھی لیتا ہوں۔ کیونکہ آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں۔

س طالب علمی کی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ؟

ج ایف اے پاس کرنے کے بعد بی اے میں داخل ہونے کے لیے درخواست دی۔ حالانکہ ایف اے گورنمنٹ کالج سے ہی پاس کیا تھا لیکن تھرڈ ایئر میں داخلے کے لیے پھر انٹرویو دینا پڑتا تھا۔ انٹرویو دینے کی میری باری آئی تو میں کمرے میں گیا۔ اندر چار پانچ پروفیسر صاحبان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب (جنہیں بعد میں نوبل پرائز ملا تھا) کی سرکردگی میں انٹرویو لے رہے تھے۔ میں بی اے میں ریاضی اے بی کورس کے مضمون لے رہا تھا جس میں حساب ہی حساب پڑھا جاتا ہے۔ میرا داخلہ فارم دیکھ کر عبدالسلام صاحب نے پوچھا ''ریاضی میں کتنے نمبر لیتے رہے ہو؟'' میں نے جواب دیا ہر امتحان میں سو نمبروں میں سے سو ہی لیتا رہا ہوں۔ اس پر انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور اپنے سامنے پڑا ہوا ایک کاغذ اُٹھایا اور اس پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھایا اور کہا ''یہ لو یہ سوال حل کر کے دکھاؤ'' مجھے ایک طرف بٹھا کر اگلا لڑکا بلا لیا۔ سوال دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے تو میں پریشان ہوا لیکن پھر حوصلہ کر کے وہ سوال حل کرنے لگا۔ حل کر کے ڈرتے ڈرتے میں نے وہ کاغذ انہیں پیش کیا تو انہوں نے اس پر بہت بڑا ۱۰۰/۱۰۰ لکھا اور میری کمر پر اپنے ہاتھ سے شاباش دی اور ساتھ ہی کہا کہ تھرڈ ایئر میں تمہاری فیس معاف ہو گی۔ مجھے اپنی کمر پر ان کے اس ہاتھ کا لمس آج تک محسوس ہوتا ہے۔ یہ لمس میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

س ابتدا میں ادبی حوالے سے کن ادیبوں سے متاثر تھے؟

ج: دورانِ تعلیم ہی مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ سکول اور کالج کے لائبریریز سے میری دوستی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ''آنہ لائبریریوں'' کا بھی بڑا رواج تھا۔ لوگ ان لائبریریوں سے ضخیم سے ضخیم کتاب لے کر بھی ایک دن میں ختم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے جاسوسی ناول بہت مقبول تھے۔ پھر عمران سیریز آ گئی۔ عبدالحلیم شرر، قیس رام پوری اور ایم اسلم کی کتابیں شوق سے پڑھی جاتیں۔ اسی زمانے میں نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کی دھوم تھی۔ شروع شروع میں مجھے بھی تیرتھ رام فیروز پوری اور نسیم حجازی بہت پسند تھے۔ عبدالحلیم شرر کا ناول ''فردوسِ بریں'' بھی کئی دفعہ پڑھا تھا۔ نسیم حجازی کے ناولوں کے تو کئی فقرے زبانی یاد ہو جاتے تھے۔ پھر اے حمید کی سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ شوکت تھانوی کی ہر کتاب کی تلاش رہتی تھی۔ ان کے مزاحیہ ناولوں کا بہت لطف آتا تھا۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ اردو تنقید کی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ آل احمد سرور، وقار عظیم، ممتاز حسن اور دوسرے بہت سارے نقاد زیرِ مطالعہ رہے جن کے اب نام بھی یاد نہیں آ رہے۔ پڑھنے کے ذوق میں ذرا نکھار آیا تو کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ غلام عباس، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، گوپال متل اور پتہ نہیں کس کس ادیب کو پڑھا لیکن اردو افسانے کے حوالے سے کرشن چندر اور منٹو بہت محبوب رہے۔ اب اردو میں کوئی قابلِ ذکر ناول لکھا ہی نہیں جا رہا۔ ''اداس نسلیں'' اور ''آگ کا دریا'' پرانے ہو گئے۔ مزاح میں شفیق الرحمٰن اور ضمیر جعفری بہت پسند تھے۔

س: پرانے لاہور کی ادبی فضا اور آج کے لاہور کی ادبی فضا میں کیا فرق ہے؟

ج: پرانے لاہور کی آبادی کم تھی لیکن اس کے باوجود ادبی محفلوں کا چرچا رہتا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس میں سارا دن ادیبوں شاعروں کی گہما گہمی رہتی تھی۔ ٹی ہاؤس میں ادبی دوستوں کی میزیں مخصوص ہوتی تھیں۔ عام آدمی یا چھوٹا موٹا ادیب وہاں جانے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ اس زمانے میں وہاں ادبی اجلاس نہیں ہوتے تھے۔ حلقہ اربابِ ذوق اور حلقہ اربابِ علم جسے ریلوے والوں کا حلقہ بھی کہا جاتا تھا، کے اجلاس وائی ایم سی میں ہوتے تھے اور کچھ

تنظیمیں اپنے اجلاس اور مشاعرے چائنیز لنچ ہوم کے بیسمنٹ میں کرتے تھے۔ اس طرح پنجابی ادبی سنگت کا تنقیدی اجلاس وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں اور پنجابی ادبی پروار کا چائنیز لنچ ہوم میں ہوتا تھا۔ ان کے بعد ایک اور ادبی تنظیم ''حلقہ تصنیف ادب'' کے نام سے شروع ہوئی تو یہ اپنے اجلاس گرین ہوٹل میکلیگن روڈ میں کرتی تھی۔ اب تو ادیبوں اور تنظیموں کی بھرمار ہو چکی ہے۔ ایک ہی وقت میں کئی کئی تنقیدی اجلاس اور مشاعرے ہو رہے ہوتے ہیں۔ جس نوجوان نے بھی ایک غزل یا ایک افسانہ لکھ لیا چاہے وہ کیسا ہو ادیبوں اور شاعروں کی صف میں سمجھا جاتا ہے۔ آج ادب کو نہیں ادیب کو دیکھا جاتا ہے۔ ایسے ایسے لوگ ادبی تنظیمیں چلا رہے ہیں جنہیں ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ان کے دماغ میں چاہے کچھ نہ ہو لیکن جیب میں ضرور ہو۔ اس وقت ادب پڑھنے کا رجحان ہوتا ہے لیکن آج ادیب بھی پڑھتے بہت کم ہیں۔

س پنجابی کے ادیب اردو زبان کے حوالے سے اتنے متشدد کیوں ہیں؟

ج یہ بات میں نے آپ ہی سے سنی ہے۔ میں نے کسی پنجابی ادیب کو اردو زبان پر تشدد کرتے نہیں دیکھا۔ اردو زبان کی جتنی نشوونما پنجاب میں ہوئی ہے کہیں نہیں ہوئی۔ پنجاب کے کونے کونے میں اردو شاعر اور ادیب مل جائیں گے جو بلا دھڑک اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے قصبوں سے اُردو زبان کے ادبی رسالے شائع ہو کر قارئین تک پہنچتے ہیں۔ پنجابی کے ادیب اپنی ماں بولی پنجابی کے حق کے لیے ضرور پرامن مظاہرہ کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں تو آج تک کوئی ایسا واقعہ نہیں جس میں اردو زبان پر تشدد کیا گیا ہو۔ اگر آپ کوئی جانتے ہیں تو بتایئے؟

س کیا پنجابی میں ایسی صلاحیت ہے کہ وہ ہماری گھریلو معاشی اور دفتری زبان بن جائے؟

ج ابھی تو اردو زبان میں بھی ایسی صلاحیت نہیں سمجھی جاتی کہ اسے دفتروں میں جگہ دی جائے۔ حالانکہ عدالت نے بھی اس کے حق میں فیصلہ دیا ہوا ہے کہ اسے دفتری زبان بنایا جائے لیکن متعلقہ لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔ پنجابی زبان ہماری گھریلو اور معاشی

ضروریات تو پوری کر رہی ہے لیکن دفتری صلاحیت رکھنا تو دور کی بات ہے جب تک یہ زبان پرائمری سطح سے پڑھائی جانی شروع نہیں کی جاتی اس میں وسعت اور گہرائی نہیں آ سکتی۔

س: کیا پنجابی میں بہتر ادب تخلیق ہو رہا ہے یا اُردو میں؟

ج: یہ موازنہ بہت مشکل ہے۔ پنجابی ادب بہت کم اور اردو ادب زیادہ تخلیق ہو رہا ہے۔ پنجابی شاعری تو کسی حد تک قابل ذکر ہے لیکن نثر پر تو ایک قسم کا جمود طاری ہے۔ پنجابی کہانی بہت کم لکھی جا رہی ہے۔ پچھلے سالوں میں زاہد حسن نے اردو زبان میں لکھے جانے والے ناولوں سے بھی اچھے ناول لکھے۔ پنجابی شاعری صوفی شاعروں کی گود میں پلی۔ یہ ان شاعروں کی دین ہے۔ پنجابی شاعری میں کافی سی حرفی اور بارہ ماہا جیسی صنف موجود ہے۔ اردو شاعری میں تصوف نظر نہیں آتا۔

س: اب تک آپ کی کتنی کتب شائع ہو چکی ہیں؟

ج: اب تک میری اٹھارہ کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں سے میری دو کتابیں گورمکھی لپی میں انڈیا کے پنجاب سے بھی چھپیں۔ تین کتابیں ایڈٹ کیں۔ پندرہ گورمکھی رسم الخط کی انڈیا اور کینیڈا کے دوستوں کی کتابیں اردو رسم الخط میں شائع کیں۔

س: گلشن ادب کے کتنے برسوں سے لگاتار اجلاس ہو رہے ہیں اور اس کا مختصر تعارف قارئین کے لیے پیش کر دیں۔

ج: اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے گلشن ادب کے مشاعروں کو ہوتے پینتیس سال گزر چکے ہیں۔ اب یہ تنظیم چھتیسویں سال میں داخل ہو گئی ہے۔ ۱۰ اپریل کو اس کا پینتیسواں سالانہ مشاعرہ ہمدرد ہال میں منعقد کیا گیا جس میں پنجاب کے تمام شہروں کے علاوہ صوبہ کے پی کے سے دو شہروں کوہاٹ اور بنوں سے بھی دو شاعر دوستوں نے شرکت کی۔ اس سالانہ مشاعرے میں سو کے قریب شعرا حضرات نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ گلشن ادب کے ماہانہ مشاعرے ہر ماہ کے دوسرے ہفتے میرے غریب خانے پر ہوتے ہیں۔ گلشن ادب پبلی کیشنز کے تحت مختلف لکھاریوں کی اردو اور پنجابی زبان کی سو سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ یہ

کتابیں نو پرافٹ اور نو لاس کے حساب سے چھاپی جا رہی ہیں۔ یہ ادارہ ان دوستوں کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے جو پروفیشنل پبلشرز کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔

س کینیڈا آپ ہر سال جاتے ہیں وہاں کے ادبی ماحول اور یادوں کو قارئین سے شیئر کیجیے۔

ج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہر سال کینیڈا اور امریکہ کا چکر لگتا ہے۔ کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں پہنچ کر یوں لگتا ہے جیسے دوسرے پنجاب بلکہ اصلی پنجاب میں آ گیا ہوں۔ گوروں کی نسبت پاکستانی اور ہندوستانی لوگ پنجابی اور اردو بولتے زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہاں اردو اور پنجابی کی بہت ساری تنظیمیں ادبی پروگرام کرتی رہتی ہیں۔ مشاعرے، مذاکرے اور کتابوں کی رونمائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ دونوں زبانوں کے ریڈیو اور ٹی وی سٹیشنز دن رات اپنی نشریات پیش کرتے رہتے ہیں۔ صرف اسی ایک شہر سے پندرہ سے زیادہ اردو اور تقریباً اتنے ہی پنجابی کے اخبار نکلتے ہیں۔ جو ہفت روزہ ہوتے ہیں اور ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ مجھے اکثر پنجابی انجمنوں کے اجلاس میں جانے کا موقع ملتا ہے۔ ان میں بہت لوگ شرکت کرتے ہیں۔ تین چار تنظیموں کے نام پیش کرتا ہوں۔ ''اقلم فاؤنڈیشن''، ''کینیڈا ساہت سبھا ٹورانٹو''، ''قلم قافلہ'' اور ''پنجابی فاؤنڈیشن'' جس کے کرتا دھرتا لاہور سے گئے طاہر اسلم گورا صاحب ہیں۔ وہ ایک دو سال سے TAG ٹی وی اسٹیشن بھی کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ کینیڈا میں اردو اور پنجابی ادب کو بہت فروغ دیا جا رہا ہے لیکن آپ کے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں تفصیل میں جا سکوں۔ امریکہ کے شہروں میں بھی جہاں جہاں میں جاتا ہوں وہاں کے ادبی پروگراموں میں شرکت ہوتی رہتی ہے۔

س آپ کو اب تک کتنی قومی ادبی ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے؟

ج قومی ایوارڈ بہت بلندی پر پڑے ہوتے ہیں لیکن میرے پاس اتنی لمبی اور مضبوط سیڑھی نہیں ہے کہ میں ان تک آسانی سے پہنچ سکوں یا پھر میں نے قوم کی اتنی خدمت کی ہی نہیں کہ ان تک رسائی ہو۔

س پنجابی کے حوالے سے بہت سی ادبی تنظیمیں ہیں جو کہ ہر پلیٹ فارم پر اپنی ماں بولی

کے لیے آواز بلند کرتی ہیں۔ پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ بھی ہے کیا وجہ ہے کہ پھر بھی عملی طور پر کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔

ج واقعی پنجابی کی بہت ساری تنظیمیں ہیں جو اس زبان کو ترقی دینے کی بہت کوشش کرتی رہتی ہیں۔ پنجابی کتابوں پر ایوارڈ بھی دیے جا رہے ہیں۔ ۲۱ فروری کو جب ''مادری زبانوں'' کا دن پوری دنیا میں منایا جاتا ہے تو کچھ پنجابی سیوک بھی ماں بولی کے حق میں احتجاج کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ پاکستان کے اتنے بڑے صوبے میں جس میں بہت بڑے بڑے اور بھی بہت شہر ہیں لیکن یہ احتجاج صرف لاہور میں ہی ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اپنی زبان وادب کی بہتری کے لیے پورا پنجاب اُمڈ پڑے لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ دنیا میں واحد پنجاب ہی ایسا بدنصیب صوبہ ہے جس کے پرائمری سکولوں میں طالب علموں کو اپنی مادری زبان نہیں پڑھائی جاتی۔ عوام حکومت کے سامنے بے بس ہیں۔ حالانکہ مطالبہ کرنے والے بھی پنجابی ہیں اور مطالبہ ماننے والے بھی پنجابی ہیں۔ پھر بھی مطالبہ نہیں مانا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ عوام اور خواص میں فرق میں کوئی مصلحت ہو۔

س آپ پنجابی کے ادیب کی پہلی ذمہ داری کیا سمجھتے ہیں؟

ج میرے نزدیک پنجابی ادیب کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پنجابی ادب پڑھے بھی۔ ہمارے نوجوان لکھنے کی طرف تو بڑے شوق سے آ جاتے ہیں لیکن جس فیلڈ میں وہ لکھ رہے ہوتے ہیں اُس میں اپنے سینئر ادیبوں کے نام تک سے واقف نہیں ہوتے اور ان کا لکھا ہوا ادب پڑھنا تو دور کی بات ہے۔ چنانچہ میری پنجابی لکھنے والوں سے یہی استدعا ہے وہ کچھ لکھنے سے پہلے اُس سے متعلقہ معیاری ادب ضرور پڑھیں اور کتاب سے ناتا جوڑے رکھیں۔

س پنجابی زبان کا اپنا رسم الخط کیوں نہیں ہے؟

ج کون کہتا ہے کہ پنجابی کا رسم الخط نہیں ہے؟ اس کے تو ایک کی بجائے دو رسم الخط ہیں۔ ایک رسم الخط کو ''شاہ مکھی'' اور دوسرے کو ''گورمکھی'' کہا جاتا ہے۔ گورمکھی میں تو دیگر

لٹریچر کے علاوہ سکھ حضرات کی مذہبی کتاب مقدس ''گوروگرنتھ'' بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی گربانیاں، اشلوک اور اُداسیاں اسی رسم الخط میں ملتی ہیں۔ دوسرے رسم الخط شاہ مکھی میں صوفی اور کلاسیکل شاعروں کا دیا ہوا ادبی خزانہ موجود ہے۔ بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث شاہ، سلطان باہو، میاں محمد، حافظ برخوردار، شاہ فرید اور بہت سے پنجابی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات اس رسم الخط کے ذریعے پیش کرتے ہوئے کوئی دقت محسوس نہیں کی۔ اب جو حضرات پنجابی لکھنا ہی نہیں چاہتے وہ ایسے بہانے ضرور پیش کرتے ہیں کہ پنجابی کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں۔ ہاں کچھ الفاظ ضرور ہیں جن کے لکھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اگر پنجابی کے کچھ ماہر ادیب اس ضمن میں سر جوڑ کر بیٹھیں تو دقت بھی بڑی آسانی سے دور ہو سکتی ہے۔

س: آپ نے زندگی میں کبھی محبت کی ہے۔ کس سے؟

ج: محبت ضرور کی ہے اور ڈنکے کی چوٹ کی ہے لیکن میری محبت وہ نہیں تھی جو پہلی نظر میں ہی ہو جاتی ہے۔ ایسی محبت دوسری نظر میں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ میں نے پہلی نظر میں صرف جائزہ لیا اور پھر اس کی سچائی اور مضبوطی جانچنے میں دو سال لگا دیے۔ چنانچہ آج میری اس محبت کا نتیجہ میرے چار خوبصورت اور فرمانبردار بیٹوں کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان چاروں بیٹوں اور ان کی ماں نے میری زندگی کو جنت بنایا ہوا ہے اور میں اپنے آپ کو خوش قسمت ''عاشق'' سمجھتا ہوں۔ میری بیوی میری شاگرد تھی۔ میں گورنمنٹ کالج چارسدہ میں ریاضی پڑھاتا تھا۔ ایک دن میری بیوی کے والد کالج تشریف لائے اور انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے ریاضی پڑھانے کے لیے کہا جو اس وقت وہاں کے سکول میں پڑھ رہی تھی۔ کالج میں سارے دن میں ۸۰ منٹ کی صرف دو کلاسیں ہوتی تھیں اور پھر کتابیں ہوتیں اور میں۔ چنانچہ وقت کی بہتات دیکھ کر میں نے ان سے حامی بھر لی اور ان کی بیٹی کو ریاضی پڑھانی شروع کر دی۔ وہ ریاضی سے بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس لیے اسے پڑھنے کے علاوہ اور کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی۔ چار پانچ دنوں میں اس نے خوب توجہ سے ریاضی

سیکھی۔ مجھے اس کی نشست و برخاست، بات چیت کا انداز، اُستاد کی عزت اور سب سے بڑی بات اس کا سراپا اچھا لگا اور میں نے اپنے دل میں محبت کا بیج بو دیا جو آہستہ آہستہ سر نکالنے لگا اور دو سالوں میں شجر سایہ دار بن گیا۔ ان دنوں میری شادی کا چرچا ہوا تو میں نے اس لڑکی کے بارے میں کہا۔ والدہ نے بھی لڑکی کو پسند کیا اور اس طرح آج یہ لڑکی میری پہلی اور آخری محبت بن کر میرے پاس بیٹھی ہے۔

س زندگی کا کوئی یادگار واقعہ؟

ج جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو ہندوستان سے پاکستان آنے والے مہاجروں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ٹرک، بسیں اور ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو ریل گاڑی کی چھت پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑتا تھا۔ جب ہماری پاکستان آنے کی باری آئی تو مجھے بھی اپنے ماموں کے ساتھ گاڑی کی چھت پر بیٹھنا پڑا۔ جب کوئی سٹیشن آتا تو اوپر بیٹھنے والے لوگ یا تو لیٹ جاتے یا سر نیچا کر لیتے۔ کیونکہ ریلوے لائن کے اوپر سے گزرنے والی بجلی یا ٹیلیفون کی تاروں سے سر ٹکرانے کا خطرہ تھا۔ میں بھی اس پر عمل کرتا رہا لیکن ایک سٹیشن پر میں اس طرح کرنا بھول گیا۔ چنانچہ اوپر سے گزرنے والی تار میری گردن سے اس طرح ٹکرائی کہ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور میرا پورا جسم گاڑی کی چھت سے نیچے کی طرف لڑھک گیا لیکن میری زندگی ابھی باقی تھی۔ چنانچہ اچانک میری ایک ٹانگ میرے ماموں کے ہاتھ میں آ گئی اور انہوں نے مجھے اُوپر کی طرف کھینچ لیا۔ میری زندگی تو بچ گئی لیکن میری گردن کا بہت برا حال تھا۔ گاڑی نے پاکستان جا کر ہی رُکنا تھا۔ اس طرح اس سفر میں جو تکلیف مجھے ہوئی وہ ابھی تک نہیں بھولی۔

س قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

ج قارئین سے میرا یہی پیغام ہے کہ وہ دل لگا کر پڑھیں بھی۔ ادب کے قارئین کے لیے یہ ایک بہت عمدہ تحفہ ہے۔ تحفے کی قدر کرنی چاہیے۔

کوثر محمود، ڈاکٹر

س اپنے علمی وادبی کام کے حوالے سے کچھ بتائیں۔

ج ابھی تک شاعری کی صرف ایک کتاب ''کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو'' اور موپساں کی فرانسیسی کہانیوں کے اردو ترجمے پر مشتمل ایک مجموعہ بعنوان ''مومی گیند'' زیور طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ باقی بہت سا کام ہے کہ جو ہنوز تشنہ تکمیل ہے۔ بہرحال پنجابی شاعری کا مجموعہ ''چوکھیا دیوا'' مکمل ہے اور اردو شاعری کا مجموعہ ''صبح جمال کی پہلی ساعت'' وہ بھی اشاعت کا منتظر ہے۔ علاوہ ازیں ''اردو شاعری میں خوشبو کا استعارہ'' کے نام سے ایک ضخیم مقالہ اور ''میرے دوستوں کی نظمیں'' کے عنوان سے تنقیدی و توضیحی مضامین کی کتاب بھی تیار ہے۔ دیکھئے کب چھپنے کی نوبت آتی ہے۔

س آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

ج بھئی مجھے کسی نظریے کا تو نہیں پتہ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس نے جس سے جو کام لینا ہے بڑے سلیقے سے لے لیتا ہے اور جس کو پذیرائی دینی ہو اُسے مل بھی جاتی ہے۔ کس سے عجلت کا معاملہ کرنا ہے کس کو وعدۂ فردا پہ رکھنا ہے اس کی بھی اُسے ہی خبر ہے۔ ہمیں بس جو کام جیسا بھی آتا ہے کرتے رہنا چاہیے۔

س کیا آپ سمجھتے ہیں کہ چند افراد نے ادب کے ہوائی جہاز کو ہائی جیک کر لیا ہے؟

ج ویسے مجھے بتائیں کہ ہوائی جہاز کو ہائی جیک کرنے والے کیا ہمیشہ اُسے اپنے زیر تصرف رکھ سکتے ہیں؟ اپنے وقتی مفادات کو پورا کرنے کے بعد وہ اس سے دستبردار ہو ہی جاتے ہیں اور سورج کو کتنی دیر چھپایا جا سکتا ہے؟ اس طرح کے لوگ ہر دور میں رہے ہیں۔

ان کا رویہ بالعموم ایک سا ہی ہوتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ جس طرح دنیا کی تمام ایئر لائنز کے تمام جہاز ہائی جیک نہیں ہو سکتے صرف چند ایک کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے اسی طرح کچھ خوشامدی اور چاپلوس لوگ، ان پڑھ اور کندۂ ناتراش حکام سے کچھ نہ کچھ اپنے استحقاق سے بڑھ کر لے مرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بڑی آسان سی پہچان ہے۔ یہ لوگ کسی سرکاری منصب کو اپنے لیے وجہ فضیلت جانتے ہیں۔ حالانکہ سرکاری مناصب کی قدر و وقعت اہل علم کے قبول کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ یہ مناصب ان کی قدر و منزلت کو بڑھاتے ہیں۔

س گزشتہ کچھ عرصے سے ادبی محافل سے دور رہنے کی کیا وجہ ہے؟

ج پیر و مرشد علامہ اقبال کے بقول:

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایتِ زمانہ

کوئی محفل اس قابل ہوگی تو ہم سر کے بل پہنچیں گے اور کوئی ہمیں اس قابل سمجھے گا تو زبردستی گھسیٹ کر لے جائے گا۔

س کیا گزشتہ کچھ دہائیوں سے پاکستان میں نظم اچھی لکھی جارہی ہے یا غزل؟

ج اچھی نظم بھی لکھی جارہی ہے اور اچھی غزل بھی لکھی جارہی ہے لیکن ہر دو اصناف میں کم کم اچھا لکھا جارہا ہے۔ اکثر لوگ مقبولِ عام روش کو اپناتے ہیں اور بہت کم اپنی روش کو مقبولِ عام بنانے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ بہر حال اس بارے میں کوئی فوری اور قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

س اگر آپ کو چیئرمین اکادمی ادبیات بنا دیا جائے تو پہلا کام ادب کے حوالے سے کیا کریں گے؟

ج اوّل تو یہ ناممکنات میں سے ہے لیکن فرضِ محال ایسا ہو جائے تو پہلا کام یہ ہوگا کہ ادیبوں شاعروں کو یہ بتلانا ہوگا کہ اکادمی ادبیات کا افضل فرضِ منصبی ہے کیا؟

ہماری اکادمی ادبیات شاید فرنچ اکادمی کا ایک بھونڈا چربہ ہے۔ فرنچ اکیڈمی کا

چیئر مین تو کجا، کوئی عام رُکن بھی کوئی غیر ادیب شاعر یا فن کے حوالے سے کوئی ممتاز مقام نہ رکھنے والا نہیں بن سکتا۔

فرنچ اکادمی کے ۴۰ مستقل ارکان ہیں اور یہ تاحیات ارکان ہوتے ہیں اور ان ہی میں سے انتخاب کے ذریعے سیکرٹری یا چیئر مین بنتا ہے۔ کسی رُکن کی وفات یا معذوری کی وجہ سے اُس نشست پر مختلف اُمیدواروں میں انتخاب ہوتا ہے اور صرف اہل علم کو ہی اس منصب کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ ووٹر کی کوئی بھی اہلیت مقرر کر لیں صرف اُنہی کی رائے سے ارکان اور چیئر مین کا انتخاب ہونا چاہیے۔ ہم کسی سرکاری افسر کو ادب کے زوال کا کیسے ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں۔ وہ تو تبدیل ہو کر کل کہیں اور چلا جائے گا اُس کی جگہ کوئی اور خوشامدی، چاپلوس یا نااہل شخص حکام بالا کی اشیر باد "ہمچومن دیگرے نیست" کا ورد کرتا ہوا ایک عرصے تک ادب اور ادیبوں کے سر پر مسلط رہے گا۔

اگر ادیب اور شاعر جمہور اور عوام کے لیے لکھتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے اپنے اندر جمہوریت لانا ہوگی۔ ورنہ سب کچھ ایسا ہی چلتا رہے گا جیسا کہ ہو رہا ہے۔

س اگر آپ کو ہفت زبان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ فرانسیسی زبان سے اُردو میں براہِ راست بہت کم تراجم ہوئے ہیں۔ "مومی گیند" کے بعد آپ نے فرانسیسی سے مزید تراجم کیے ہیں۔ ان کی کچھ تفصیل بتائیں۔

ج موپساں کی کہانیوں کے تراجم "مومی گیند" کے بعد میں نے موپساں کی مزید کئی کہانیوں کے تراجم کیے ہیں۔ "مومی گیند" کے اگلے ایڈیشن کی ضخامت پہلے سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔

واقعی فرانسیسی سے اُردو میں براہ راست تراجم بہت ہی کم ہوئے ہیں۔ غالباً اس وقت زندہ ادیب شاعروں میں ناچیز کو ہی یہ فضیلت حاصل ہے۔

علاوہ ازیں وولٹیر (اصل تلفظ وولتیغ) کے کچھ منتخب مضامین کا ترجمہ بھی ہوا پڑا ہے۔ دیکھیے کب چھپنے کی نوبت آتی ہے اور کون ہمیں چھاپتا ہے۔ نیز کچھ فرانسیسی نظموں کے تراجم

بھی کیے ہیں لیکن تا حال ابھی نہیں چھپے۔ علاوہ ازیں اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے ایک اور مشققتی کام شروع کیا ہے۔ اس کے کچھ خدوخال واضح ہوتے ہیں تو پھر اس پر بھی بات ہوگی۔

س آپ کی شاعری میں کچھ عرصے سے ''خوشبو'' بہت شور مچا رہی ہے۔ آپ نے خوشبو پر کتنے اشعار کہہ رکھے ہیں۔ نیز اردو شاعری میں خوشبو کے موضوع پر بھی آپ نے کام کر رکھا ہے۔ وہ کہاں تک پہنچا؟

ج ''خوشبو کا سفر'' اُردو شاعری میں خوشبو کے استعارے کے حوالے سے شاید میری ادبی زندگی کا واحد اور دلچسپ ترین کام تھا کہ جس نے تقریباً ۵ سال تک مجھے اپنے حصار میں ایسے لیے رکھا کہ واقعتاً دین دنیا کے کسی اور کام کی طرف دھیان گیا ہی نہیں۔ اس کا آغاز ایک نظم ''خوشبو کا کھیل'' کے تجزیے سے ہوا جو ۱۵/ ۲۰ صفحات پر مشتمل تھا لیکن یہ مقالہ پھیلتے پھیلتے ۷۰۰ سے زائد صفحات تک چلا گیا۔ اس میں دو سو صفحات سے زائد کا مقدمہ ہے کہ خوشبو دراصل ہوتی کیا ہے؟ ہم اسے کیسے محسوس کرتے ہیں؟ ہمارے احساسات و جذبات سے خوشبو کا کیا تعلق ہے؟ ہمارے نفسیاتی اور جنسی رجحانات میں خوشبو کیا کردار ادا کرتی ہے؟ زمانہ قدیم سے لے کر ہندو اساطیری روایات، قدیم تاریخ سے پیرس کی پرفیوم انڈسٹری تک اور ایک باب اروماتھراپی یعنی خوشبو سے مختلف بیماریوں کا علاج وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں میر تقی میر سے لے کر آج کے ۳۵۰ جدید شعراء کا منتخب کلام، خوشبو کے موضوع پر ۲ ہزار سے زائد اشعار اور نظموں کا حوالہ اور تقریباً ۱۲۵ صفحات کے حوالہ جات ہیں اور پس نوشت کے عنوان سے کچھ منفرد واقعات کا بیان ہے جو خوشبو کے سلسلے میں ناچیز کے مشاہدے میں آئے۔

بہر حال یہ کام اتنا دلچسپ تھا کہ ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ میری محویت کا کیا عالم تھا۔

غالباً دسمبر کا کوئی دن تھا۔ میری اہلیہ رات ۱۰ بجے کے قریب رات کا کھانا لے کر

آ ئیں۔ میں اس دن ''غیر محسوس انسانی خوشبو'' یعنی ''فیرومون'' کا باب لکھ رہا تھا۔ میں نے اہلیہ سے کہا کہ کھانا سائیڈ ٹیبل پر رکھ دو۔

صبح ۷ بجے جب بچوں کو سکول تیار کروانے کے لیے میری اہلیہ دوبارہ میرے کمرے کے سامنے سے گزریں تو استفسار کیا کہ آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟ تو میرے منہ سے نکلا، اچھا کون سا کھانا؟ یعنی ۹ / ۸ گھنٹے ساتھ ہی رکھے ہوئے کھانے کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔

بہر حال ان ۵ سالوں میں غیر محسوس طریقے سے میری شاعری میں خوشبو کا ذکر ہوتا چلا گیا اور معلوم شعراء میں خوشبو کے موضوع پر تادم تحریر میرے اشعار کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یعنی ۳۵۰ سے زائد ہے۔ دوسرے نمبر پر شبہ طراز کے ۳۰۰ کے قریب اشعار ہیں۔ پھر نذیر قیصر کے ۹۵ کے قریب اشعار ہیں اور پھر پروین شاکر ہیں کہ جن کے ہاں صرف ۶۰ کے قریب مقامات پر خوشبو کا حوالہ ملتا ہے۔ مجھے اپنے اشعار کے بارے میں تو کوئی دعویٰ نہیں لیکن تعداد میں یقیناً سرِ دست سب سے زیادہ ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بڑے بڑے ناموں کے ہاں خوشبو کے موضوع پر صرف ایک آدھ شعر ہی برآمد ہوا اور وہ بھی کوئی تاثر چھوڑے بغیر لیکن نئی غیر معروف شعراء نے خوشبو کو ایسے ایسے زاویوں سے دریافت کیا کہ سبحان اللہ، مثلاً ثمینہ راجہ کہتی ہیں:

چمن میں جب کہ یہ خوشبو کی اصل جانتے تھے
تو سادھوؤں کی طرح پیڑ مسکرائے گئے

جی! خوشبو پر کتاب کمپوز ہو کر تیار ہے لیکن کوئی پبلشر اسے چھاپنے کو تیار نہیں لیکن اس کے جستہ جستہ حصے اسلامی یونیورسٹی اور دیگر جرائد میں چھپ چکے ہیں۔

س اقبال پر بھی آپ نے تحقیقی کام کیا ہے۔ اس کے بارے میں بتایئے؟

ج اقبال پر تقریباً ۷۰ کے قریب چھوٹے چھوٹے تشریحی و توضیحی مضامین لکھنے کا ارادہ تھا۔ ۲۰ / ۱۵ لکھے بھی گئے لیکن اقبال کچھ اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ کچھ لکھنے

کے بجائے اس سے حظ اُٹھانے لگتا ہوں اور کام وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ مثلاً اقبآل پر قرۃ العین طاہؔرہ کے اثرات پر لکھ رہا تھا تو جب طاہؔرہ کا یہ شعر نظر سے گزرا تو بس قلم چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گیا۔ آگے کچھ لکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

تو چہ فلس ماہیٔ حیرتی، چہ زنی ز بحرِ وجود دم
بنشیں چو طاہرہ دم بدم بشنو خروشِ نہنگ لا

ایک مقام پر حضرت علامہ نے طاہرہ کے ایک شعر ملمع کا ایک خوبصورت ترجمہ کیا لیکن بہت کم لوگوں کی اس پر نظر پڑی۔

بندہ و خواجہ در ہم آویزند
لاعبید یرا ولا ارباب
(طاہؔرہ)

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
(اقبآل)

بس یہ سلسلہ فترت کا شکار ہے دیکھئے کب اشارۂ غیبی ہوتا ہے۔

س حال ہی میں آپ نے ترکی، ایران اور متحدہ عرب امارات کا دورہ کیا ہے۔ سنا ہے کہ آپ ان مقامات کا سفرنامہ لکھ رہے ہیں؟

ج جی حضرت، ہمارے پیرومرشد سائیں جی کے توسل اور اعانت سے قونیا میں مولانا روم اور شمس تبریزی کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ بہت کچھ دیکھنے اور گھومنے پھرنے کا ارادہ تھا لیکن جب قونیا پہنچا تو جو وقت میسر تھا وہ تمام وقت مولانا کے مزار پر بس بیٹھا رہا اور مقام اقبال (علامہ اقبال کا علامتی مزار جو مولانا روم کے مزار کے پہلو میں) کی سرشاری میں گم رہا، نہ کسی اور کی طرف دیکھنے کا خیال آیا اور نہ کہیں اور جانے کی ہمت پڑی۔

بہر حال مولانا روم کی زیارت اور اقبآل کے تکیے کو بوسہ دینا شاید اس تمام سفر کا ماحصل

تھا اور یقین کیجیے کہ تقریباً دس منٹ ایسے تھے کہ مجھے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ تھی۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جانا ہے؟ سب سوالات بے معنی تھے۔

بہر حال ۷۰ کے قریب صفحات لکھے ہیں لیکن قونیا کے قریب پہنچتے پہنچتے ہمت جواب دے گئی۔ بس کچھ نہیں لکھا تھا۔ دیکھئے کب اجازت ملتی ہے یا کب توفیق ہوتی ہے۔

س وہاں کیا محسوس کیا؟

ج الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ بس وہ محسوسات کی دنیا ہے۔ جیسا کہ آپ کسی خوشبو کو کتنا بیان کر سکتے ہیں؟ اسے بس محسوس ہی کیا جا سکتا ہے لیکن اتنا ضرور شیئر کروں گا کہ وہاں جا کر تمام علائق دنیا ختم ہو کر رہ گئے۔ بالکل ایک خالی سلیٹ بچی ہے نہ کہ شاید جس پر ماسوا کچھ بھی تحریر نہیں۔ ایسے ایسے لوگ کہ جن سے جدا ہونے کا تصور ہی محال تھا۔ اب ان کا ہونا نہ ہونا بالکل برابر ہے اور بقول حافظ شیرازی:

تلقین درسِ اہل نظر یک اشارت است
کردم اشارتے و مکر نمی کنم

س ایران میں کہاں کہاں گئے؟

ج مشہد کے قریب طوس ہے۔ وہاں فردوسی کی زیارت کی۔ وہاں سے ۱۲۰ کلومیٹر کے قریب نیشا پور ہے وہاں حکیم عمر خیام اور فرید الدین عطار اور حیدر یغما کے آستانے پر حاضری دی۔ ایک رات مشہد میں امام رضا کے ہاں گزاری اور ایک دن تختِ جمشید میں شاہانِ سلف کے انجام سے عبرت کشید کی۔

اور ایک دن اصفہان، نصف جہان کے مقولے کی صداقت پر صادر کرنے میں گزرا اور ایک پورا دن، رئیس المتغزلین سعدیؔ شیرازی اور بلبل شیراز حافظ شیرازی کی چوکھٹ پر جبین نیاز کو جھکائے رکھا۔

ایران میں فارسی شعراء کی جو قدر و منزلت ہے کاش اس کا عشرِ عشیر بھی ہمارے ہاں ہوتا۔ حافظ، سعدی، عمر خیام، فردوسی ان کے مزارات آرائش و جہاں میں ہمارے کسی بھی

خوبصورت ترین پارک سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ وہاں خوبصورتی، فرحت اور جمال کی فراوانی ہے اور یہاں اول تو کسی شاعر کے مرقد کا کسی کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو وہاں خاک ہی اُڑتی ہے۔ اقبالؔ جیسے نابغہ روزگار کو ہم نے شاہی مسجد کے ساتھ ایک ذیلی اور غیر اہم حیثیت دے رکھی ہے۔

آپ یقین کریں کہ اقبالؔ کے نام پر ناچیز کو سوار کرانے کے لیے ایران میں ایک کلوز فلائٹ کو 10 منٹ کے لیے روکا گیا اور جہاں جہاں اور جس جس نے اقبال لاہوری کا نام سنا تو 'سلام بر اقبال' درود بر اقبال' کے کے تہنیتی کلمات سے خیر مقدم کیا۔

اور ہم نے اقبالؔ کے مزار کو خاردار کانٹے والی تاریں لگا کر عام زائرین کا داخلہ بند کر دیا۔ کیونکہ دہشت گردی کا خطرہ ہے تاکہ عوام کا اقبالؔ سے رہا سہا تعلق بھی ختم کیا جاسکے۔

حضرت جی ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ ہم دوست بلکہ چاروں درویش ایک رات جاوید منزل پر گزاریں۔ وہاں اقبالؔ کے بارے میں باتیں کریں اور ان کی موجودگی کو محسوس کریں۔ جاوید منزل کو 24 گھنٹے کھلا رکھنے میں کیا اندیشہ نقص امن ہے؟

چھوڑیں بات لمبی ہوتی جائے گی

س فرانسیسی کے کلاسیکی کام کے علاوہ آج کے جدید زمانے کے لٹریچر اور خاص طور پر شاعری سے بھی اُردو خواں طبقہ کو متعارف کروانے کا آئیڈیا کیسا ہے؟

ج بہت اچھا آئیڈیا ہے لیکن کاش میرا دن ۲۴ گھنٹے کے بجائے ۲۶/۲۵ گھنٹے کا ہوتا تو شاید یہ بھی ممکن تھا پہلے سے جاری کام تکمیل پذیر ہوتے دکھائی نہیں، کوئی نیا پراجیکٹ شروع کرنا خود سے اپنے متعلقین سے اور اپنے پروفیشن سے زیادتی ہے۔ ادب سے گھر کا چولہا نہیں جلتا۔

حسن عباسی کی دوست مندا کرانتا سین کے تعاون سے کچھ بنگالی شاعرات کا اُردو میں ترجمہ کرنے کا آغاز کیا تھا۔ وہ میرا پراجیکٹ بھی ادھورا پڑا ہے۔ ہر چند کہ کچھ شاعرات کا ترجمہ ہوا بھی۔ مثلاً مندا کرانتا سین تسلیمہ نسرین وغیرہ۔

س آپ کی پنجابی شاعری بھی خاصے کی چیز ہے۔ پنجابی مجموعہ کب دے رہے ہیں؟

ج حضرت جی! اُردو شاعری کو کس نے پڑھا ہے یا سراہا ہے کہ پنجابی شاعری کو بھی پلّے سے خرچ کر کے چھاپا جائے، مفت تقسیم کیا جائے اور پھر بھی اسے کوئی نہ پڑھے۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ پنجابی شاعری کو سکھ دوستوں نے بہت پسند کیا ہے لیکن یہاں کسی کے نوٹس میں بھی نہیں کہ ہمارا پنجابی سے کچھ تعلق ہے بھی کہ نہیں لاہور میں ہی پنجابی کانفرنس بھی ہوئی۔ صوفی کانفرنس بھی ہوئی اور مشاعرے تو آئے روز ہوتے رہتے ہیں لیکن پنجابی کے کرتا دھرتا لوگوں کی ترجیحی فہرست میں ہمارا نام شاید ہے ہی نہیں یا کہیں بالکل آخر میں ہے۔ بہر حال یوٹیوب پر کچھ چیزیں موجود ہیں جن سے ہماری پنجابی دربار میں حاضری تنقید کے لگتی رہتی ہے۔

اگر آپ تناسب کی بات کریں تو اُردو شاعری کے حوالے سے اگر کوئی ایک شخص جانتا ہے تو پنجابی کے حوالے سے دس جانتے ہیں اور فرانسیسی تراجم کے حوالے سے ۱۰۰ لوگوں نے تعریف و تحسین کی ہے۔

س کیا وجہ ہے کہ ۲۰/ ۱۸ کروڑ کی آبادی والے ملک میں کتاب ۵۰۰ کی تعداد میں چھپتی ہے اور وہ بھی نہیں بکتی؟

ج اسے نرم سے نرم الفاظ میں بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ علم و ادب کی اس سے بڑھ کر بے توقیری اور کیا ہوگی کہ ایک نغمہ نگار کو لوگ پانچ سو ہزار دے کر بھی ناخوش ہیں اور اسی نغمے کو کوئی بے سُرا گلوکار گا کر ایک لاکھ کما لیتا ہے اور اسی نغمے پر رقص کرنے والی کروڑ سے زیادہ سمیٹ لیتی ہے۔ میں آپ کی توجہ پھر اکادمی ادبیات کی طرف لانا چاہوں گا کہ اس کا اصل کام اردو زبان و ادب کی ترویج ہے۔ اگر وہ اپنا کام نیک نیتی سے کریں گے تو کتاب کی اشاعت از خود بڑھ جائے گی۔ اسی ملک میں ہیری پوٹر کی کتاب بے اندازہ تعداد میں بکی ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ آج بھی شاعری کی سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والی اور بکنے والی کتاب ''دیوانِ غالب'' ہی ہے۔

یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ اقبالؔ آج بھی "جملہ حقوق محفوظ ہیں" کی زد میں ہے۔ جبکہ قانونی طور پر اقبالؔ کی کسی تصنیف کو جملہ حقوق کے نام پر اشاعت عام سے روکا نہیں جا سکتا۔

میں پھر کہوں گا کہ ایک بے سرا قوال نجی محافل میں ۵ / ۴ گھنٹے کی پرفارمنس کے کم از کم ۵۰ / ۴۰ لاکھ لیتا ہے اور حکومتی سطح پر ہم تمغہ امتیاز کے ساتھ محض ۵ لاکھ دے کر حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہیں۔

میں نے ارب پتی علم وادب کی شخصیت کو مشورہ دیا تھا کہ اگر تم اپنے ایوارڈ کی کوئی قدر ومنزلت چاہتی ہو تو میرٹ کے کے علاوہ تمہارے ایوارڈ کے ساتھ کی رقم کم از کم حکومتی سطح سے دوگنا زیادہ ہونی چاہیے لیکن اُس نے دیگر معاملات دوگنی تو کیا بیس گنا زیادہ رقم خرچ کی لیکن ایوارڈ کی رقم کو محض ۵۰ ہزار تک ہی محدود رکھا اور یہ پیسے آمد و رفت کے اخراجات میں صرف ہو گئے۔

س موجودہ لکھنے والے اچھے ادیب وشاعر تو درکنار اچھے قاری بھی نہیں ہیں۔ ان کو کیا مشورہ دیں گے؟

ج آپ نے اپنے سوال میں ہی اس کا جواب دے دیا ہے۔ ہر اچھے ادیب شاعر کو لازماً ایک اچھا اور متنوع موضوعات کا قاری ہونا چاہیے۔

ایک ماسٹر لیول کی تعلیم یافتہ خاتون نے میری ذاتی لائبریری کی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ نے واقعی یہ سب کتابیں پڑھ لی ہیں؟ تو میں نے جواباً کہا کہ نہیں ابھی خرید کر جمع کر رہا ہوں دیکھیے پڑھنے کی نوبت کب آتی ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی اچھی کتاب نظر آ جائے تو میں فوراً اس خوف سے بھی اُسے خرید لیتا ہوں کہ شاید یہ کتاب کل کلاں کو نہ مل سکے۔ اب تک دو سو سے زائد کتابیں خرید رکھی ہیں کہ جن کو ابھی پڑھنا ہے۔ ابھی شیراز سے دو جلدوں میں فردوسی کا شاہنامہ تقریباً پاکستانی ۹ سو روپوں میں خرید کر لایا ہوں۔ یہاں ایکسپو سنٹر میں ایک پرانی کتابوں والے کی منت کی کہ مجھے شاہنامہ بارہ ہزار میں دے دو لیکن وہ پندرہ ہزار سے کم پر راضی نہ

تھا۔ اُس دن میرے پاس صرف بارہ ہزار روپے تھے۔ پندرہ ہزار ہوتے تو میں نے خرید لینا تھا لیکن شیراز کے بس سٹینڈ پر چائے کا کپ پی رہا تھا تو مجھے سٹال پر شاہنامہ نظر آ گیا تو یقین کیجیے کہ ان دوکانداروں نے میرے ساتھ تصویریں بھی بنوائیں اور چائے کے پیسے بھی نہیں لیے اور تقریباً مفت میں (ایرانی کرنسی پتہ نہیں کتنی تھی) ۱۰ ڈالر میں سے کافی سارے ریال واپس کر دیے۔ بعدازاں حساب کیا تو پاکستانی ۹ سو روپے سے بھی کم بنتے تھے۔

س: آپ کا ادبی مطمع نظر کیا ہے؟ ادبی تراجم سے کیا حاصل کرنے کا مقصد ہے؟

ج: مطمع نظر تو بڑی مبہم سی اصطلاح ہے اور غالباً میرا مطمع نظر کوئی ہے بھی نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ دنیا میں جو بھی ترقی یا پیش رفت ہوئی، جتنے بھی ذہنی اُفق وسیع ہوئے ہیں صرف اور صرف ترجمے کی بدولت ہوئے ہیں۔ مثلاً ہم عبرانی زبان قطعاً نہیں جانتے۔ تو عبرانی زبان میں ادبی شعری تخلیقات سے کیسے واقف ہو سکتے ہیں۔ کیا یہودی علم اور ٹیکنالوجی میں کسی سے کم ہیں۔ اس سے استفادہ ترجمے کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔

اور تو اور اگر کوئی شخص عربی یا سنسکرت نہیں جانتا تو ترجمے کے بغیر اُسے کیسے بتایا جا سکتا ہے کہ قرآن اور ویدوں میں کیا کیا علم و حکمت اور ادب کے جہان آباد ہیں۔

س: آپ ایک طرف ڈینٹل سرجن ہیں۔ موسیقی، شاعری، مختلف زبانیں ہیں، تراجم ہیں کیا آپ ان سے انصاف کر رہے ہیں؟

ج: سچی بات تو یہ ہے کہ کسی ایک سے بھی انصاف نہیں ہوا۔ دن تو وہی ۲۴ گھنٹے کا ہے۔ اہل خانہ کا شکوہ بھی بجا ہے کہ ہمیں وقت نہیں دیتے۔ مریض شاکی ہیں کہ زیادہ وقت شاعری اور موسیقی کو دیتے ہیں۔ موسیقی سے وابستہ افراد کب کے ہمارا جہلم تو کیا برسی بھی کرا بیٹھے اور اہل ادب نے ازخود یہ فرض کر لیا ہے کہ ہمارے پاس علم و ادب کے لیے قطعاً کوئی وقت نہیں ہے اور واقعتاً جس طرح کی ادبی سرگرمیاں ہو رہی ہیں وہ محض وقت کا ضیاع ہیں۔ بس جتنی توفیق ملتی ہے کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ نہ صلے کی پرواہ ہے نہ ستائش کی تمنا۔

س: ہر شخص کا کوئی نہ کوئی سورس آف انسپائریشن Source of Inspiration ہوتا

ہے۔ آپ کو یہ فیض کہاں سے ملتا ہے؟

ج ہر زبان کا اعلیٰ ادب آپ کے اندر ایک تخلیقی تحریک کو بیدار کرتا ہے۔ اسی طرح ہر اچھا چہرہ، خوبصورت منظر ادب پارہ آپ کے ذوقِ جمال کو نکھارتا ہے اور جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے اسی طرح اچھے لوگوں کی صحبت آپ کے قلم کو جلا بخشتی ہے۔ پیر و مرشد سلیم گورمانی کی علمی گفتگو سے ہمیشہ قلب ونظر روشن ہوئے۔ عباسی صاحب کے مصرعے پر ہمیشہ گرہ لگانے کی خواہش ہوئی اور سمندر منصوری سے تو ہمیشہ سنجیدہ کام پر تو تکار ہوتی رہی ہے۔

س جتنا کام آپ کر چکے ہیں آپ اُس سے مطمئن کس حد تک ہیں؟

ج جہاں تک ذاتی اطمینان کی بات ہے تو بالکل مطمئن نہیں لیکن یہ بات سچ ہے کہ جو کچھ بھی کیا پوری محنت اور ایمانداری سے کیا اور قبولیت عامہ نہ میرا مسئلہ ہے اور نہ میرے بس میں ہے۔

س ادیبوں شاعروں کو اور عام قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج ادیبوں شاعروں سے درخواست ہے کہ تخلیقی سطح پر تو وہ اردو کی ثروت مندی کے لیے کام کر رہے ہیں لیکن کم از کم اپنی کسی ایک تخلیق کا دنیا کی کسی دوسری زبان میں ترجمہ کریں اور دنیا کی کسی بھی زبان کی کم از کم ایک تخلیق کا اُردو میں ترجمہ ضرور کریں۔ انگریزی تو ہر دوسرا ادیب شاعر مناسب حد تک جانتا ہے۔ ورنہ علاقائی زبانیں تو کم از کم ہماری توجہ کی طالب ہیں اور آخری بات اُردو لکھنے پڑھنے اور بولنے پر مت شرمائیں۔ بلکہ اسے وجہ افتخار سمجھیں اور علاقائی ادب بھی ہمارا ہے اور ہم ہی اس کے والی وارث ہیں اور اگر آپ اپنے ماں باپ کی طرح اپنی مادری زبان کی عزت نہیں کریں گے تو کوئی اور ان کو عزت نہیں دے گا۔

لبنیٰ صفدر

س ادب کی فی زمانہ کیا اہمیت ہے؟

ج جس طرح ماضی کے ادب سے ہمیں پچھلی دنیا کے نہ صرف حالات وواقعات سے آگاہی ہوتی ہے۔ بلکہ اس وقت کے جغرافیائی، معاشی، معاشرتی وسیاسی اُتار چڑھاؤ بھی ہم پر آشکار ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں ادب کسی بھی معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ماضی میں جھانکنے والا ایک روزن ہے۔ مہذب قومیں اپنے ماضی سے پیوست رہتی ہیں اور ان کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔ زبان وبیان کی لطافتوں سے لے کر جذبات واحساسات کی واردات ہمیں بہترین ادب نے ہی مہیا کیے ہیں۔ دنیا کے اُتار چڑھاؤ میں بہت سی چیزوں میں تغیر وتبدل رونما ہوتا رہتا ہے لیکن ادب کی اہمیت وکردار کبھی نہیں بدلتے۔ آج کا حال کل کا ماضی ہوگا۔ ادب کی جو قدر وقیمت ہم نے یا ہمارے آباؤ اجداد نے محسوس کی اور اُس سے استفادہ حاصل کیا آنے والی نسلیں بھی کریں گی۔ اگر ہم مسلمانوں کی ہی بات کرلیں تو مسلمانوں کی یہ ادبی روایت اور اُس میں ادب کا کردار پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک جاری ہے۔ وہ ایک ادیب ہی تھا جس نے اعلان کیا کہ کافروں کے ”الزام کے مطابق اگر حسینؑ کافر ہیں تو ہم بھی کافر ہیں“ یہی ثابت قدمی اور وفا شعاری رموزِ عشق سے آگاہ کرتی ہے۔ ادب کی اہمیت آج، کل اور ہمیشہ رہے گی۔

س کیا غزل اپنے ممکنہ امکانات تلاش کرچکی ہے؟

ج جہاں پہ تلاش کا سفر تمام ہوجائے وہاں سے نئی راہیں نکالنے کی جستجو مرجاتی ہے۔ میرؔ وغالبؔ نے اُردو غزل کو نیا رنگ ڈھنگ دیا۔ غزل میں متنوع موضوعات پیش کیے اور

غزل عوام وخواص میں مقبول تر ہوگئی۔ پھر یکے بعد دیگرے شعراء نے غزل میں نت نئے تجربات کیے۔ حسرت موہانی سے لے کر احمد فراز اور آج تک غزل میں تجربات جاری ہیں۔ امکانات تو ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ جدیدیت نے غزل کو نئی کروٹ بٹھایا۔ غزل کے ساتھ پیش آنے والے تعصبات غزل کو نقصان نہیں پہنچا سکے۔ مختلف الموضوع ہونے کی وجہ سے اسے ''نیم وحشی'' صنفِ سخن قرار دیا گیا لیکن ہر دور میں ایک بڑا غزل گو شاعر پیدا ہوتا رہا جو اس کی بقا کا باعث بنتا رہا۔ ہر غزل کے پس منظر میں مسلسل سوچ اور ذہن وشعور کی کئی سطحیں کارفرما ہوتی ہیں۔ ہمہ گیر ادراک اور ذاتی تجربات غزل کے موضوعات کو وسیع کرتے رہتے ہیں۔ مختصراً یہی کہوں گی۔ امکانات کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے اور اسی میں صنفِ سخن کی زندگی اور بقا کا راز پوشیدہ ہے۔

س آپ کے تھیسز کا عنوان ''پاکستانی غزل اکیسویں صدی میں'' ہے۔ اس سے متعلق قارئین کو کچھ بتائیں۔

ج ہم جدید شعرا اور غزل کو موضوعِ بحث تو بناتے رہتے ہیں لیکن جدید شعرا اور ان کے کلام کو ابھی تک کسی نے یکجا نہیں کیا تھا۔ اگرچہ چند ایک کتب مل جاتی ہیں جن میں کچھ شعرا کا کلام اکٹھا کیا گیا ہے لیکن میرے ریسرچ ورک میں دورِ جدید کے تمام اچھا لکھنے والے شامل ہیں خواہ ان کا تعلق دور دراز کے مضافات سے تھا۔ اس کے علاوہ چاروں صوبوں سے یکساں شعرا کو بغیر کسی تخصیص کے شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ نئے لکھنے والوں نے موضوعات اور نت نئے اسلوب اور زبان و بیان کے جو تجربات کیے اُن کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات نے موضوعات کو بھی بدلا ہے اور نئے قوافی و ردیف سے بھی آشنائی فراہم کی ہے۔ ہر شاعر کے کلام کے ساتھ اس کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے جو کہ اس کی موجودہ رہائش اور کام کے متعلق ہے۔ یہ لسٹ سینکڑوں میں ہے جن کا تعارف نہیں دیا جا سکا۔ ان کے اشعار بطور تعارف دیے گئے ہیں۔ کیونکہ لسٹ اتنی طویل ہوگئی تھی کہ سب کے بارے میں تفصیل سے لکھنا دشوار تھا۔ ادب کے قاری کے لیے اس ریسرچ

ورک میں نہ صرف جدید شعرا کا مکمل تعارف بآسانی دستیاب ہے بلکہ 70 کی دہائی کے بعد لکھنے والے تمام اہم ناموں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ایک تو غزل کے فی زمانہ بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ کو پہچانا جا سکتا ہے۔ بلکہ غزل کو جدیدیت کے ساتھ اکیسویں صدی تک لانے والے تمام شعراء کے کلام سے استفادہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

س تراجم کی کیا اہمیت ہے۔ ماضی میں غیر ملکی ادب جس مقدار میں اُردو میں ترجمہ ہوا اب ویسی صورت حال نظر نہیں آتی۔ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج تراجم کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا اور اُس کی وجہ اُردو ادب میں کتب کا بہت کم ذخیرہ ہونا تھا۔ اُردو کتب نایاب تھیں۔ لہٰذا دوسری زبانوں سے بے شمار کتب کو اُردو میں ترجمہ کیا گیا جس سے اردو دان طبقہ کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ کتب آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً دیگر زبانوں سے تراجم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح دوسرے ممالک میں تخلیق کیے گئے ادب اور ادبی رجحان سے قاری کو آشنائی ہوئی۔ اس طرح آپ اپنے اور دوسری زبانوں میں ادبی توازن کا موازنہ بھی کر سکتے ہیں۔ نت نئے امکانات اور موضوعات کو جانتے ہیں۔ تخلیقی عمل میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور دلچسپی بھی۔ ماضی قریب میں ترجمہ کو دوئم درجہ کا کام مانا جاتا تھا اور اسے تخلیقی و ادبی کام ماننے سے بھی گریز کیا جاتا تھا لیکن اب خیالات بدل چکے ہیں۔ لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ اس طرح دوسری تہذیبوں، روایات اور ثقافت سے متعارف ہوا جا سکتا ہے۔ پھر ایک انسانی گروہ کے تجربات دوسرے انسانی گروہ تک پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ صرفی و نحوی ساخت سے آگاہی ہوتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کو ایک باقاعدہ زبان کے مقام پر فائز کرنے میں بھی تراجم کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ اگر سقراط، افلاطون اور دیگر کی قیمتی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ نہ ہوتا تو یہ قیمتی سرمایہ روم و یونان کے پرانے کھنڈرات میں دب کر کبھی کا فنا ہو چکا ہوتا۔ آج بھی نہ صرف ادبی کتب کے تراجم ہو رہے ہیں بلکہ کاروباری حضرات بھی اپنی مطلوبہ کتب کے تراجم کرواتے ہیں۔

مقتدرہ جامعہ کراچی اور جامعہ پنجاب کا وسیع کام لائبریریوں میں موجود ہے۔ ترجمہ شدہ کتب کو پڑھانے کے لیے ایک مخصوص فضا کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

س کیا ادیب کو روایت شکن ہونا چاہیے یا روایت پرست؟

ج روایت شکنی کا آغاز تحریک علی گڑھ سے ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے ہندوستان پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے اور ڈاکٹر صیوتی گھوش، ملک راج آنند، ڈاکٹر محی دین تاثیر اور سید سجاد ظہیر اس تحریک کا حصہ بنے۔ ہٹلر نے جب ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو قید کیا تو اس کے اثرات فاشزم کی صورت میں پوری دنیا کے ادب پر بھی اثر انداز ہوئے۔ ہندوستانی ادباء نے بھی محسوس کیا کہ پچھلی دو صدیوں میں جو ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے وہ ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے۔

اب ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنانے کا دور تھا۔ ترقی پسند تحریک نے روایات اور قدامت کے بت کو پاش پاش کیا۔ ادب خود کو معاشرے سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا ایک ادیب کو وقت کے ساتھ خود کو بدلتے رہنا چاہیے۔ ادیب بننے کے لیے کسی حد تک روایت پرست ہونا چاہیے لیکن بڑا ادیب بننے اور خالص اور اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے روایت شکن ہونا بھی ضروری ہے۔ روایت پرستی ٹھہرے ہوئے تالاب کی مانند ہے جس پر کائی جم جاتی ہے۔ جبکہ روایت شکنی بہتے ہوئے پانیوں جیسی ہے۔ اسی طرح ادب اور خاص طور پر شاعری پر جو جمود طاری ہے قدیم موضوعات کو آج بھی من و عن پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں بھی جدت لانے کی مزید ضرورت ہے۔ نہ صرف شاعری کے موضوعات بلکہ ہیئت کے نئے تجربات بھی ہونے چاہئیں۔

س تنقید کسی بھی تخلیق اور تخلیق کار کے لیے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ؟

ج تنقید کا مقصد کسی بھی ادبی پارے کی صحیح اور مکمل تفہیم ہے۔ اگر فن پارہ اعلیٰ اور معیاری ہے تو اُس کی تحسین ہونی چاہیے اور اگر اس میں کچھ سقم باقی ہے تو ان کی نشاندہی کر کے تحریر کو مزید بہتر بنانے کی تجاویز دی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ تنقید برائے اصلاح ہو نہ کہ تنقید

برائے تنقید۔

قدیم و جدید دونوں تنقید کا دیس منصب بھی رہا ہے اور مقصد بھی۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری سے جدید تنقید کا آغاز کر دیا تھا۔ شاعری کی طرح تنقید میں بھی نت نئے امکانات کی گنجائش ہمیشہ باقی رہی ہے۔ تنقید کا مطلب بھی ''کھرے اور کھوٹے کو پرکھنا'' ہے۔ تنقید اور تخلیق دراصل ایک دوسرے کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ارسطو کی ''بوطیقا'' صدیوں تک تخلیق فن کے لیے مشعل راہ بنی رہی۔ تنقید کا مقصد صرف تخلیقات کا محاکمہ کرنا نہیں بلکہ تخلیق کے اصول دریافت کرنا بھی ہے۔ انصاف پر مبنی تنقید فن کو سنوارتی ہے اور فنکار کی رہنمائی اور اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ تنقید کا مقصد حوصلہ شکنی ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ حوصلہ افزائی اور رہنمائی ہے۔ لہٰذا با مقصد اور مبنی بر انصاف تنقید تخلیق اور تخلیق کار دونوں کے لیے سودمند ہے۔

س اردو غزل میں اتنی مایوسی اور اُداسی کیوں ہے؟

ج عاشق اور معشوق روز اوّل سے اردو غزل کے دو اہم کردار رہے ہیں جہاں عشق کی کیفیات ہوں وہاں ہجر و فراق کے قصے بھی ہوتے ہیں۔ ہماری زیادہ تر شاعری چونکہ عشق و محبت کے قصوں پر مشتمل ہے تو غم و الم کے واقعات و احساسات بھی اس کا حصہ بنے اور آج تک بنے ہوئے ہیں۔ غالب نے میر کے تصورِ مایوسی اور رنج و الم کو اپنی خوش طبعی کے باعث توڑا۔ رنج و الم کے مضامین کو بھی ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح پیش کیا کہ دل میں درد رکھنے والے بھی زیر لب مسکرا کر اس سخن کا مطالعہ کرنے لگے۔ دوسرے معاشی و سماجی حالات و واقعات کے ساتھ سیاسی حالات بھی شاعر کے مزاج پر اثر انداز ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ سماجی و سیاسی حالات ادب و شاعر کو لاشعوری طور پر متاثر ضرور کرتے ہیں اور اس کی تحاریر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ غزل جدید دور میں داخل ہوئی تو جام و مینا اور گل و بلبل کے فرضی تصورات سے نکلی۔ اب زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے سامنا کرنے کا وقت تھا۔ الغرض قیامِ پاکستان سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ اور افغانستان سے لے کر روس کے زوال تک ہر رنج و غم کو

بھی غزل نے اپنے دامن میں سمیٹا۔ ۶۵ اور ۷۱ کی جنگوں کا اثر بھی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ۷۰ء کی دہائی میں کچھ شعرا کے ہاں اساطیری، مذہبی اور تہذیبی رجحان نمایاں ہے۔ جس میں جنگ و جدل، وطن سے دوری اور مذہبی و تہذیبی انحطاط کے مضامین کثرت سے موجود ہیں۔ لہٰذا مایوسی اور اُداسی کا رنگ ان وجوہات کی وجہ سے آج بھی غزل پر نظر آتا ہے۔ اُمید اور حوصلہ کی فضا اگرچہ بہت کم کم ہے اور اس کے رنگ ابھی مدھم ہیں لیکن نوجوان نسل کے ہاں اُمید کی کمی بھی نہیں ہے۔

س کیا آپ پاکستانی اُردو غزل کو ہماری تہذیب وثقافت کا آئینہ دار سمجھتی ہیں؟

ج جی ہاں بالکل سمجھتی ہوں۔ ہر ادیب اور شاعر اپنے معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جیسے دوسری زبانوں کا ادب پڑھنے سے ہمیں وہاں کی تہذیب وثقافت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح اُردو ادب نے بھی اپنے تہذیب وثقافت کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ آپ ولی دکنی سے ہی اس کا جائزہ لے لیجیے۔ جنہوں نے شاعری کے ذریعہ وہاں کی تہذیب وثقافت سے ہمیں روشناس کرایا۔ ہر معاشرے کی پہچان اُس کی تہذیب وتمدن ہے۔ تو نہ صرف شاعروں بلکہ ادیبوں نے بھی اپنے ناولوں اور افسانوں میں اس کی عکاسی کی ہے۔ پھر خواہ یہ تہذیب و تمدن اسلامی تھا یا روایات اور کلچر پر مبنی۔ شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری نے نہ صرف تہذیب وتمدن کی پاسداری کا بیڑہ اُٹھایا۔ بلکہ آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کیا۔ علامہ اقبال کا نظریہ وطنیت، بھی اسی کا عکاس ہے۔ اسی طرح علاقائی رسم ورواج بھی ناولوں اور شاعری کے ذریعے تمدن کی نمائندگی کرتے ہیں۔

س آپ کے چھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کے ہاں جو شعری ارتقاء ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج ادیب یا شاعر کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ مطمئن ہو جانا دراصل فن کی موت ہے۔ سیکھنے کا عمل مرتے دم تک جاری رہتا ہے۔ ارتقا مسلسل سفر کا نام ہے۔ بالکل شروع کی کتب شائع ہوئیں تو کم عمر تھی۔ لہٰذا اس وقت کی شاعری میں بھی کچا پکا رنگ نظر آتا ہے۔ آپ جوں جوں

سفر طے کرتے ہیں آپ کی سوچ میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔آپ کا مشاہدہ بڑھتا ہے آپ چیزوں کو کئی سمتوں سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔اب مناظر اور اشیاء اور طرح سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔زندگی اپنی حقیقتوں کے ساتھ آپ پر آشکار ہونے لگتی ہے۔لہٰذا سوچ بدلنے کے ساتھ ساتھ نظریات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ماحول بدلے یا سوچ آپ کی تحاریر پر لامحالہ اس کے اثرات تو مرتب ہوتے ہیں لہٰذا ایسا ہی ہوا۔میں سمجھتی ہوں شاعری بھی سوچ اور وقت کے ساتھ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھنے لگتی ہے۔اب جذبات سے ہٹ کر فکروسوچ کے رنگ گہرے ہونے لگتے ہیں۔شروع کی شاعری میں ایک ٹین ایجر کی سوچ نمایاں ہے اور آخری کتاب تک زندگی کی تلخیوں نے اپنی جگہ بنالی۔معاشرے میں ہونے والی ناانصافیاں عشق ومحبت پر بعض اوقات غالب آجاتے ہیں۔اسی تناظر میں عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر بھی اشعار لکھے۔جہاں تک مطمئن ہونے کی بات ہے تو میں بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں۔بہت کچھ ادھورا ہے، بہت کچھ کہنا باقی ہے۔

س غزل، آزاد نظم اور نثری نظم میں آپ کے نزدیک کون سی صنف مستقبل میں شعری حوالے سے اہم ہے؟

ج غزل صدیوں سے مقبول صنف سخن رہی ہے اور آج بھی غزل لکھی اور پڑھی جارہی ہے۔لیکن روایت شکنوں نے اس طلسم کو توڑ کر آزاد نظم اور نثری نظم کی طرف رجحان کیا۔غزل میں ہر شعر میں الگ مضمون کو باندھا جاسکتا ہے۔دو مصرعوں میں بات بیان کرنا گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے لیکن مدت سے غزل میں قدیم موضوعات آج بھی اُسی تواتر سے استعمال ہوتے چلے آرہے ہیں۔اگرچہ آزاد غزل اور نثری غزل کے ، تجربات بھی کیے گئے۔جو ہمارے ہاں رواج نہیں پاسکے۔غزل کا آنگن ہمیشہ سے مخالفتوں اور دشمنوں کے وار کے باوجود پر بہار رہا۔غزل کی آنچ دھیمی ہوتی ہے اور اسے بآسانی گایا جاسکتا ہے۔لیکن دوسری طرف اس بات کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ غزل ایک جز ہے۔جبکہ نظم کو کل قرار دیا گیا ہے۔نظم دوسری زبانوں سے اردو ادب میں وارد ہوئی۔اس حقیقت سے

انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظم کا دامن زیادہ وسیع ہے اس میں لکھنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ لفظیات سے لے کر موضوعات تک آپ کو وسیع کینوس فراہم کرتے ہیں۔ جبکہ بہت سی باتیں غزل کی تنگی داماں کے باعث بیان کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ قافیے اور ردیف سے رہائی نظم ہی کی بدولت ملی۔ مغربی شاعری کے زیر اثر اردو شاعری میں ہیئتوں کے نت نئے تجربات کا نتیجہ آزاد نظم ہے۔ اگر چہ نثری نظم کی طرح شروع میں آزاد نظم کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اظہار خیال کی آزادی کی خوبی نے آہستہ آہستہ اس کو رواج دیا اور اس کو پسند کیا جانے لگا۔ سب سے زیادہ بحث و مباحثہ نثری نظم کے حوالے سے ہوا۔ ایک بڑا طبقہ تو اس کو شاعری ماننے کو تیار ہی نہیں۔ معنوی اور لفظی آہنگ لیے ہوئے کوئی نثر پارہ شاعرانہ رنگ میں رچا بسا ہو تو اُسے شاعری کہا جا سکتا ہے۔ اگر اسے نظم کہنا بھی پسند نہیں اور نثر بھی نہیں تو اس کا مناسب نام شاعری تو ہو سکتا ہے شعر کے لیے تخیل کی ندرت، معنوی بلندی، بلاغت و فصاحت درکار ہوتی ہے لیکن نثری نظم میں بھی ان کا اہتمام ہوتا ہے۔ میں اسے شاعری کی تیسری جہت سمجھتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آنے والا دور نثری نظم کا دور ہوگا۔

س اُردو بان میں نثری نظم کی صنف میں اب تک کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ جیسا کہ آزاد نظم میں میراجی، ن-م-راشد، اور مجید امجد کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ کیا یہ محدود امکانات کی صنف ہے؟

ج جی نہیں نثری نظم محدود امکانات کی صنف تو نہیں ہے۔ بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ اس میں کچھ کہنے کے امکانات سب سے زیادہ ہیں۔ اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس میں سرقہ اور توارد کے خطرات بھی موجود نہیں ہیں۔ یہ ایک منفرد اور ذاتی تخیل کی ایجاد ہے۔ تشبیہات و استعارات سے بھرپور اس صنف کو نجانے شاعری کیوں تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے۔ اگر چہ شاعری تشبیہات و استعارات اور تخیل سے پروان چڑھتی ہے۔ تو کیا ہمیں نثری نظم میں اس کی فراوانی میسر نہیں ہے؟ باقی یہاں تک کوئی بڑا شاعر نہ ہونے کی بات ہے۔ تو میرا خیال ہے ابھی ہمارا قاری اور ادیب اس کو اپنانے سے کچھ گریزاں ہے۔ مخالفتوں کے خوف سے

شاید یہ فن اس طرح اُبھر کر سامنے نہیں آ رہا لیکن آپ دیکھیں کہ آج اکثر شعراء خوبصورت نثری نظمیں تخلیق کر رہے ہیں۔ اگرچہ اعتراضات کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ انگریزی سے اُردو میں رواج پائی۔ دراصل حقیقت کچھ اور ہے۔ ٹیگور کی ''گیتانجلی'' کے توسط سے ہی انگریزی شاعری میں نثری نظم تشکیل پائی۔ نثری نظم آہستہ آہستہ ہماری روایت کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ جس طرح آزاد نظم کو شروع میں مسائل کا سامنا رہا۔ بعد میں قاری نے اسے اپنایا تو اس میں بڑے شعرا پیدا ہوئے۔ یقیناً نثری نظم کو اپنانے کے بعد اس میں بھی بڑے شعرا اُبھر کر سامنے آئیں گے۔

س کیا اُردو زبان کی عمر ۲۰۱۵ برس رہ گئی ہے۔ جیسا کہ ہمارے کچھ ادیب کہہ رہے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج یقیناً حالات پہلے سے بدلے ہیں۔ ذریعہ تعلیم زیادہ تر انگریزی میں ہے اور انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں کو مہذب سمجھنے کی سوچ ہمارے ہاں کافی پختہ ہے۔ پھر تیز رفتار ترقی کا مقابلہ کرنے اور ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے لیے انگریزی کی اہمیت کو بہت زیادہ خود پر طاری کر لیا گیا ہے۔ اردو دان اگرچہ کم ہوئے ہوں گے۔ مگر حالات اتنے بھی حوصلہ شکن ہرگز نہیں ہیں۔ آج بھی کروڑوں لوگ اُردو بولتے اور سمجھتے ہیں اور ایسا صرف پاکستان میں ہی نہیں ہے بلکہ دیگر ممالک کی یونیورسٹیز میں اُردو کے شعبے کام کر رہے ہیں۔ اردو زبان شوق سے سیکھی جاتی ہے۔ اگر اُردو متروک ہونے والی ہوتی تو کئی ممالک میں اُردو کے شعبے اس جاں فشانی سے کام نہ کر رہے ہوتے۔ ہماری یونیورسٹیز میں لاکھوں طلبا اُردو لٹریچر پڑھ رہے ہیں۔ بی اے تک اُردو لازمی تعلیم کے طور پر آج بھی پڑھی جا رہی ہے۔ یہ ہماری قومی زبان ہے۔ دور دراز اور پسماندہ علاقوں میں بھی لوگ اُردو کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ جبکہ انگریزی کو سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ تو ایسی صورت میں ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اُردو ختم ہونے والی ہے۔ آج بھی اُردو کی ہزاروں کتابیں چھپ رہی ہیں اور ان کو خریدنے اور پڑھنے والے بھی موجود ہیں۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کی

کتنی کتب چھپ رہی ہیں؟ اُردو دنیا کی تیسری بڑی عالمی رابطہ زبان ہے۔ اسے بآسانی ختم نہیں کیا جاسکتا۔

س کیا ادبی رسائل کی اہمیت اب ختم ہوچکی ہے اور اس کی جگہ سوشل میڈیا نے لے لی ہے؟

ج اگرچہ سوشل میڈیا نے جہاں اور کئی نقصانات پہنچائے ہیں وہیں ادب میں بھی کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ آج ایک کلک پر قاری کو ہر طرح کا مواد پڑھنے کے لیے بآسانی دستیاب ہے۔ سفر کے دوران، انتظار گاہوں میں، پارکوں اور دفتروں میں وہ جہاں چاہے اپنی پسندیدہ کتب یا رسائل کا مطالعہ بآسانی کرسکتا ہے۔ ایسا زیادہ تر نوجوان نسل میں ہے۔ لیکن پرانے اور نئے بہت سے لوگ اب بھی کتب بینی کے شائق ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ جو مزہ کتاب پڑھنے میں ہے وہ سوشل میڈیا پر نہیں ہے۔ اگرچہ سوشل میڈیا پر بے بہا غیر معیاری ادب نے اپنی جگہ بنالی ہے لیکن معیاری اور ادبی رسائل سالوں سے اپنی اہمیت آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج بھی بے شمار ادبی جرائد شائع نہ ہو رہے ہوتے۔ یہ ہوا ہے کہ سوشل میڈیا پر بغیر اُجرت کے پڑھنے والوں کو جرائد و کتب خرید کر پڑھنا دشوار لگتا ہے۔ خریدنے کا رواج کم ہوگیا ہے لیکن ادبی رسائل آج بھی تواتر سے شائع ہورہے ہیں اور قاری تک پہنچ رہے ہیں۔

س کتاب کا مستقبل آپ کیا دیکھ رہی ہیں؟

ج جی جیسا کہ ادبی رسائل کے حوالے سے گفتگو ہوچکی ہے یہی حال کتب کا بھی ہے۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے کتب خرید کر پڑھنے کا رواج کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج مصنف کتاب کو تحفے میں دینے پر مجبور ہے۔ کیونکہ مارکیٹ میں کتابیں اب اُس طرح سے فروخت نہیں ہوتیں جیسی آج سے چند برس قبل ہوا کرتی تھیں۔ کتاب کا مستقبل زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ فٹ پاتھوں پر نہایت ارزاں نرخ پر کتابیں اپنے قاری کی منتظر نظر آتی ہیں۔

س آپ نوائے وقت کی مستقل کالم نگار ہیں۔ ایک اچھے کالم کی کیا خوبیاں ہوتی ہیں؟ اور کالم نگار میں کیا خوبیاں ہوں؟

ج دوسری اصناف کی طرح کالم نگاری میں بھی جدت آئی ہے۔اب ہر موضوع کو کالم میں سمویا جا سکتا ہے۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، علاقائی، اخلاقی غرض ہر طرح کی بات کالم میں بآسانی کہہ کر لاکھوں لوگوں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی حالات و واقعات کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔تو ایک اچھے کالم نگار کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات و واقعات پر کڑی نگاہ رکھے۔ میں سمجھتی ہوں قلم کا جہاد بہت طاقتور ہے۔حق اور سچ کی بات کہہ کر کالم نگار مکمل جہاد کرتا ہے۔حقائق تلخ ہوں بغیر خوف وخطر اپنے نظریات کا اظہار کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں صحافت آزاد ہے۔اب زرد صحافت کا دور نہیں رہا۔ کچھ بھی کہنے اور لکھنے کی مکمل آزادی ہے۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ ایک اچھا کالم لکھنے کے لیے موضوع کا انتخاب بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بات مدلل اور اہم ہو۔قاری کو سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔ تلخ بات کو بھی نرم اور مہذب انداز میں کہنا چاہیے۔

س کہا جاتا ہے کہ کالم کی عمر ایک دن ہوتی ہے۔تو کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

ج ہر روز جتنی تیزی سے دنیا کے حالات اور واقعات بدلتے ہیں اتنی ہی تیزی سے خبروں کا سینریو بھی بدل جاتا ہے۔ ہر روز نیا واقعہ نیا مسئلہ ہوتا ہے جس پر ہمیں غور وفکر بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کا مناسب حل بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔صرف کالم ہی نہیں شاید ہر خبر کی مدت آج ایک ہی دن ہوتی ہے۔لیکن دوسری طرف بہت سے کالم جہاں شوق سے پڑھے جاتے ہیں وہیں ان میں فکر و بچار کے پہلوؤں کو یاد رکھا جاتا ہے۔ضروری نہیں کہ کام کو شعر کی طرح یاد رکھا جائے۔ نفس مضمون اور کہنے والے کا نظریہ یاد رہنا چاہیے۔ایک بات لاکھوں لوگ پڑھتے ہیں اور ہر چیز اپنا لاشعوری طور پر اثر تو چھوڑ ہی جاتی ہے۔ تو یہی چھوڑے ہوئے اثرات ہی کالم کی زندگی ہیں نہ کہ الفاظ اور محض نفسِ مضمون۔بعض اوقات کالم کی ایک سطر پوری کتاب کا خلاصہ بن جاتی ہے۔

س کیا کالم جلدی میں لکھا جانے والا ادب ہے۔ عموماً یہی کہا جاتا ہے۔ کیا یہ واقعی ادب کی صنف ہے یا نہیں؟

ج: جو کالم نگار روزانہ کی بنیاد پر کالم نویسی کو ایک پیشہ کی صورت اختیار کر کے لکھنا شروع کر دیتے ہیں اسے تو واقعی جلدی میں لکھا جانے والا ادب ہی کہا جائے گا۔ اس طرح معیار پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ اچھا اور معیاری کالم لکھنے کے لیے گہرے مشاہدہ اور مطالعہ کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ نیز الیکٹرک میڈیا سے نشر شدہ خبروں اور تجزیوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ کالم کے لیے وقت اور مطالعہ دونوں چاہئیں۔ میں سمجھتی ہوں کالم لکھنا آسان نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مشکل ہے۔ اگر واقعی آپ کالم نگاری سے انصاف کر رہے ہیں۔ کالم میں چونکہ ذاتی رائے ہوتی ہے آپ اسے مضمون کی صورت دے دیتے ہیں۔ ہم نے چونکہ صرف سیاسی حالات پر ہی لکھنے کو کالم تسلیم کر لیا ہے۔ اگر چہ دوسرے ممالک میں ایسا نہیں ہے۔ اس میں ادبی مضامین و دیگر بھی ہوتے ہیں جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسے ادب کی صنف قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابن انشا نے فکاہیہ کالم لکھے۔ بعض اوقات ایک کالم مکمل ادبی شہ پارہ ہوتا ہے۔ ہمارے نامور قدیم ادباء نے بھی کالم لکھے۔

س: کیا شاعر کی طرح کالم نویس بھی پیدائشی ہوتا ہے؟

ج: میں سمجھتی ہوں کہ شاعر ہو یا رائٹر وہ پیدائشی ہی ہوتا ہے۔ لکھنے کی صلاحیت محض سیکھنے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ آپ شاعری کر رہے ہیں یا ادب میں کچھ اور تخلیق کر رہے ہیں تو بنیادی چیز تخیل ہے۔ کالم میں بھی مشاہدہ اور تخیل اکٹھے ہوتے ہیں۔ آپ اپنی تخیل کی آنکھ سے ان چیزوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں جو عام انسان کی آنکھ سے اوجھل رہتی ہیں یا اُس طرف ان کی توجہ نہیں جاتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کا مشاہدہ بہت اچھا ہو۔ وہ غور و فکر سے چیزوں کی حقیقت سے بھی آشنا ہوں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان خیالات کو لکھنے کی صلاحیت بھی ان میں موجود ہو۔ لکھنا ایک خداداد صلاحیت ہے۔ آپ کے اس تخیل، الفاظ اور ویژن کا خزانہ موجود ہو تو ہی آپ کچھ لکھ سکتے ہیں۔ الفاظ کی بناوٹ کے لحاظ سے مدلل نفسِ مضمون کو بیان کرنا فطری صلاحیت ہے۔

س: ہمارے اکثر شعراء نے کالم نویسی شروع کر دی ہے۔ کیا وہ اپنی شاعری سے

غیر مطمئن ہیں یا جلد شہرت چاہتے ہیں؟

ج دیکھیں جیسا کہ میں نے کہا کہ لکھنا ایک قدرتی صلاحیت ہے۔ شاعر کی طرح کالم نویس بھی پیدائشی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک اچھا شاعر ایک اچھا کالم نویس تو بن سکتا ہے لیکن ایک اچھا کالم نویس ایک اچھا شاعر نہیں بن سکتا۔ اس لیے شعرا نے کالم نویسی بھی شروع کر دی ہے۔ کیونکہ ان میں لکھنے کی صلاحیت قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ غزل اور دیگر شاعری چونکہ محدود موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور کالم میں نہ صرف آپ ہر طرح کے مضمون پر کھل کر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں بلکہ آپ نتائج، نظریہ اور حل بھی ایک ہی تحریر میں پیش کر دیتے ہیں۔ جبکہ شاعری میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ شعرا شاعری سے غیر مطمئن نہیں ہیں بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کالم میں وسیع سطح پر خیالات کا اظہار انہیں ذہنی تسکین بہم پہنچاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ شہرت کی خاطر ایسا کرتے ہوں تو اگر وہ اچھا کام کر رہے ہیں تو شہرت حاصل کرنے کی خواہش میں قباحت بھی کیا ہے اور یہ خواہش کس شاعر کو نہیں ہوتی خواہ وہ کالم نہ بھی لکھ رہے ہوں۔ دوسری طرف زیادہ طبقہ شاعری سے زیادہ اخبار اور کالم پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے تو ایسے میں یہ ایک اچھا میڈیم ہے۔

س ہمارے ادبی ماحول میں ایک شاعرہ کو نام بنانے کے لیے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ج خواتین کو جہاں دوسرے شعبہ جات میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی طرح ادبی ماحول میں اپنی شناخت بنا کر چلنا بھی اُتنا ہی مشکل ہے۔ ماحول خواہ پہلے سے زیادہ ایڈوانس ہو چکا ہے۔ بظاہر لگتا ہے عورت پہلے سے زیادہ آزاد فضا میں سانس لے رہی ہے لیکن ابھی تک اُسے گھرداری کی ذمہ داریوں میں کئی شوق قربان کرنے پڑتے ہیں۔ ابھی تک مرد اُس کی ذاتی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ اس کا کردار گھر، مرد اور بچوں تک ہی محدود سمجھا جاتا ہے۔ بظاہر کامیاب لکھاری عورت کی ذاتی زندگی میں جب آپ

جھانکیں گے تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس مقام تک آنے کے لیے بہت کچھ سہا ہے۔ سب کچھ جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہوتا نہیں ہے۔ جس طرح ملازمت کے لیے باہر نکلتے وقت عورت کو مرد کی مختلف ذہنیت سے واسطہ پڑتا ہے خاص طور پر جہاں وہ مردوں کے ساتھ کام کر رہی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ادبی ماحول میں بھی اُسے درپیش ہے۔ ادبی دنیا میں مرد کا ذہن اور سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں۔ اُس کی ذہنی اپروچ خاص طور پر عورت کے حوالے سے ایک عام مرد کی سوچ سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ ایک جینوئن شاعرہ کو اپنی جگہ بنانے کے لیے نہایت احتیاط سے سوچ سمجھ کر ہر قدم اُٹھانا پڑتا ہے۔ دھیرے دھیرے صبر اور حوصلے کے اس سفر کے بعد وہ اپنے کام سے اپنا نام بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

س بطور شاعرہ اُسے صنف نازک ہونے کی وجہ سے رعایتی نمبر بھی تو ملتے ہیں؟

ج آپ کسی جینوئن رائٹر یا شاعرہ کے لیے ایسا نہیں کہہ سکتے۔ وہ اگر اپنی جگہ بناتی ہے تو محض اپنے کام اور اپنی محنت کی وجہ سے۔ آج جن کا نام ہے ان کے کام کو سراہا جاتا ہے اور تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ بتائیں کہ کتنی نان جینوئن شاعرات ہیں جنہوں نے شہرت حاصل کی اور پھر یہ شہرت تادیر قائم بھی رکھ سکیں۔ رعایتی نمبر انہی متشاعرات کو ملتے ہیں جن کو مقبول کرنے میں خاص ادبی گروہ یا مبنی بر مفادات رکھنے والے کسی شاعر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں زیادہ اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتی لیکن رعایتی نمبرز متشاعرات کے حصے میں ہی آتے ہیں۔ آج کا قاری خاصا باشعور ہے۔ وہ اچھا کلام پڑھتا ہے اور اسے داد دیتا ہے۔ آج ہماری بہترین شاعرات کو نمبرز اُن کے صنف نازک ہونے کے باعث نہیں ملے۔ انہوں نے اپنے کام سے خود کو منوایا ہے۔

س اپنے خاندانی پس منظر، تعلیم اور ادبی سفر سے متعلق قارئین کو کچھ بتائیں۔

ج میرا تعلق سرگودھا کی جٹ زمیندار فیملی سے ہے۔ میرے والد صاحب مرے کالج سیالکوٹ کے پڑھے ہوئے تھے۔ باقی افراد بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ میری والدہ بھی پڑھی لکھی ہیں۔ لہٰذا گھر کا ماحول والد صاحب کے حوالے سے ادبی بھی رہا۔

کلامِ اقبال کا زیادہ تر حصہ انہیں زبانی یاد تھا۔ زمیندار تھے، مزارع رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا وقت کی فراوانی کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا۔ کچھ وراثت اور کچھ گھر کے ماحول کی وجہ سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق قدرتی طور پر تھا۔ ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ پھر منہاج یونیورسٹی سے ایم فل اُردو کی ڈگری حاصل کی۔ اس سے قبل بی ایڈ، ایم ایڈ اور کمپیوٹر سائنسز میں بھی ڈگریاں لیں۔ ایل ایل بی کیا اور بعدازاں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے شریعہ لاء میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ رجحان زیادہ اردو لٹریچر کی جانب تھا۔ اسی وجہ سے ایم فل کیا۔ ادبی سفر کا آغاز تو شاید چھٹی کلاس سے ہو چکا تھا۔ بے ساختہ بچوں کے لیے نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ کبھی آسمان اور ستاروں پر کبھی موسموں پر۔ پھر مختصر اقتباسات لکھے۔ مختلف جرائد میں تحریریں بھیجیں اور سالوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی دوران ایک مقامی پرچہ کے لیے فیچرز اور کالم بھی لکھے۔ مختصر افسانوں کا بھی شوق رہا اور کچھ مختلف پرچوں میں چھپے۔ ۲۰۰۴ء میں شاعری کی پہلی کتاب ''تمہیں تو میرا ہونا تھا'' منظر عام پر آئی۔ یکے بعد دیگرے پانچ مزید کتب شائع ہوئیں جن میں ''محبت آئینہ کرلو'' ''یہ ہجر ہے یا وصال ہے''، ''بارشوں کے موسم میں''، ''خوشبو ہے وہ صندل کی'' اور ''تم محبت کا استعارہ ہو'' شامل ہیں۔ کافی عرصہ سے نوائے وقت کی مستقل کالم نگار ہوں۔ عامر بن علی اور حسن عباسی کے ساتھ ماہنامہ ارژنگ کے لیے کام کرتی ہوں۔

س کیا ادیب یا شاعر کی تخلیقات کو اس کی اپنی زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے یا معاشرے کا؟

ج اگرچہ لکھنے کا آغاز ذاتی کیفیات کے کتھارسس کے لیے ہوتا ہے لیکن ایک حساس شاعر یا ادیب اپنے اردگرد ہونے والے مسائل کو بھی اُسی شدت سے محسوس کرتا ہے جس طرح اپنے ذاتی غم یا مسائل کو۔ اگر ایک ادیب اپنے ذاتی تجربات کو تحریر میں سموتا ہے تو یقیناً ایسے تجربات یا حالات سے اور بھی بے شمار لوگ گزر چکے ہوتے ہیں گزر رہے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے پڑھنے والے کو وہ اپنی کہانی محسوس ہوتی ہے۔ ذاتی وجوہات کے باوجود ایک غم یا ایک خوشی بعض اوقات پورے معاشرے یا ایک بڑے طبقے کی نمائندگی بھی کرتی

ہے۔ایک اچھے ادب کو تخلیق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی ذات کے خول سے باہر آ کر کائناتی وسعتوں میں پھیلے ہوئے درد و غم کو محسوس کیا جائے اور اپنی تحاریر کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ بہت سے لوگ تحریر کے ذریعے اپنی بات یا دکھ کہنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ایسے میں ادیب پر اپنے علاوہ معاشرے کی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ہمارا بہترین ادب ایسے افسانوں، ناولوں اور شاعری پر مشتمل ہے جس میں ذاتی نہیں معاشرتی عکاسی کی گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہر اچھے لکھاری نے اپنے گرد ہونے والے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ ۶۵ اور ۷۱ کی تحاریر دیکھ لیں۔اس کے علاوہ مختلف تحریکوں کے ذریعے تخلیق ہونے والا ادب نہ صرف اپنے معاشرے بلکہ سرحدوں کی قید سے نکل کر تشکیل پایا۔ علامہ اقبال کی شاعری سے بڑی کیا مثال ہوگی۔لہٰذا بہترین ادیب کو ذاتی واردات سے آگے کا سوچ کر معاشرتی مسائل کا ترجمان ہونا چاہیے۔

س نئے لکھنے والوں کے لیے چند مفید مشورے جس سے اُن کو مستقبل میں فائدہ ہو۔

ج اچھا لکھنے کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔آپ کی تمام صلاحیتیں اور آپ کا عمدہ تخیل بھی اُس وقت تک بے کار ہے جب تک آپ دوسرے ادبا اور شعرا کا مطالعہ نہیں کرتے۔اس سے آپ کا نہ صرف وژن بہتر ہوتا ہے بلکہ آپ کو پتہ چلتا ہے کہ اچھے ادیب کی کیا خوبیاں ہیں۔ نئے لکھنے والوں کے لیے یہی کہنا چاہوں گی کہ کتب بینی کی عادت اپنائیں۔اپنے سینئرز کے ساتھ بیٹھیں، ان سے بات کریں۔ یقین کریں ایک عالم کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرنا کئی کتابیں پڑھنے سے بہتر ہے۔اس کے علاوہ اگر کچھ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کسی کو دکھاتے رہیں اور مزید بہتر کرنے کے لیے مشورے لیتے رہیں۔ سیکھنے سے تحاریر میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

محمد سعیداللہ صدیق

س اپنے بچپن سے متعلق کچھ بتائیں۔ آبائی شہر، والدین، تعلیم؟

ج ۱۷ جنوری کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی صبح کو موذن کی اذان کے ساتھ ہی میری پیدائش ہوئی۔ میں اپنے والد شیخ محمد قمرالدین مرحوم کی پہلی اور آخری نرینہ اولاد تھا۔ لاہور میرا آبائی شہر ہے۔ میرے آباؤ اجداد کا تعلق اسی تاریخی شہر سے ہے۔ میرے دادا حافظ تاج الدین مرحوم اپنے دور کے جید حافظ قرآن تھے۔ ان کے دور میں شبینوں کا بہت رواج تھا۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ملک بھر (برصغیر پاک و ہند) اور خصوصاً پنجاب میں شبینوں کا بہت اہتمام ہوتا۔ میرے دادا ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور ۱۸-۱۸ پارے سناتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کا بے حد احترام و اکرام تھا۔ میری پیدائش سے بہت عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ میرے آٹھ چچا تائے اور پھوپھیاں تھیں۔ ان میں سے ایک چچا اور دو پھوپھیاں میں نے دیکھی تھیں۔ باقی سب میری پیدائش سے قبل فوت ہو گئے تھے۔ میری غالباً چار سال کی عمر تھی جب میرے چچا حافظ فخرالدین بھی انتقال کر گئے۔ وہ مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔

میری ابتدائی تعلیم بنات المسلمین گرلز ہائی اسکول سے ہوئی جہاں سے پرائمری پاس کی۔ یہاں پرائمری کے بعد لڑکوں کو پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں داخلہ کی وجہ یہ تھی کہ بڑی ہمشیرہ یہاں پڑھتی تھیں۔ اس لیے والد صاحب ہم سب کو اکٹھا سکول چھوڑ کر آتے۔ پھر چھٹی کلاس میں مسلم ماڈل ہائی سکول میں داخل کروایا گیا۔ یہ اس زمانے میں سنٹرل ماڈل سکول کے بعد دوسرا بڑا اسکول تھا۔ ہمارے محلہ میں مولوی عبدالحق صاحب مرحوم رہتے

تھے۔ جو اسی سکول میں اُستاد تھے۔ میرے والد کے ملنے والوں میں تھے۔ ان کے توسط سے سکول داخل ہوا۔ پھر ان کا تبادلہ اسلامیہ ہائی سکول مصری شاہ ہوگیا تو نویں کلاس میں انہوں نے میری ٹرانسفر بھی وہاں کروادی۔ پھر میٹرک اسی سکول سے کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج میں داخلہ ہوا اور گریجویشن یہاں سے کی۔

س آپ کے والدین کا آپ کے مستقبل سے متعلق کیا سپنا تھا۔ وہ آپ کو کیسا انسان دیکھنا چاہتے تھے؟ اور ان کا آپ کے ساتھ سلوک کیسا تھا؟

ج مڈل کے امتحان کے بعد اپریل میں میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ یہ ایسا سانحہ تھا جو میرے لیے غیر متوقع تھا۔ اگرچہ انتقال سے ۲/۳ سال قبل بستر علالت میں گزارے لیکن ان کی موجودگی ایک گوناگوں اطمینان کا باعث ہوتی۔ میرے والد مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے اور کاروبار کے سلسلہ میں جہاں کہیں جاتے میں ان کے ساتھ ہوتا اس طرح بلاک بنانے، پرنٹنگ کے مراحل کے متعلق بنیادی معلومات بچپن میں معلوم ہوچکی تھیں۔ ابھی جدید ٹیکنالوجی شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے کلر پرنٹنگ کا انحصار عمدہ بلاک پر ہوتا۔

مجھے اپنے والدین سے بے حد شفقت و محبت ملی۔ گھر میں تربیت کا بڑا حصہ میرے والد صاحب کا تھا۔ ان کا ہی حکم چلتا۔ سونے کا نوالہ اور شیر کی آنکھ والا محاورہ ان پر بڑا فٹ ہوتا۔ مجھے زندگی میں ایک دوبار جھوٹ بولنے پر سرزنش ہوئی۔ ایک بار چھت پر پتنگ اُڑا رہا تھا والد نے منع کر رکھا تھا کیونکہ چھت کے کنارے کوئی دیوار نہ تھی اور گرنے کا شدید خطرہ تھا۔ والد صاحب چھت پر آ گئے تو انہوں نے پوچھا کہ چھت پر کیسے چڑھے تو میں نے جھوٹ بول کر بہن کا نام لیا۔ بعد میں انہوں نے کسی طرح مجھے اُگلوالیا اور میں نے بتایا کہ میں خود چڑھا تھا تو انہوں نے میری بہن سے معذرت کی جس کو میرے جھوٹ بولنے پر سخت ڈانٹ پڑی تھی۔ والدہ تو سراپا شفقت تھیں۔

میرا والد کے ساتھ ۱۰/۸ سال کی عمر تک رابطہ رہا۔ پھر وہ علیل ہوگئے اور پھر دنیا سے پردہ پوشی کر لی۔ اس لیے میں نہیں جانتا کہ ان کے دل میں میرے مستقبل کے متعلق کیا سپنا تھا۔ البتہ جس طرح بچپن میں اپنے ساتھ رکھتے ہر جگہ لے کر جاتے تو وہ یہی چاہتے ہوں

گے کہ ان کے کاروبار کو سنبھالوں۔

س آپ کے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ تو کیا آپ اس ماحول میں گھٹن محسوس کرتے تھے؟

ج میرے والد صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ مذہبی شخصیت تھے۔ ان کے مراسم ہر مکتبہ فکر کے علمائے کرام کے ساتھ تھے لیکن ہمارے گھر میں گھٹن بالکل نہیں تھی۔ ہر طرح کی آزادی تھی۔ سختی تھی تو صرف نماز کی پابندی کی جائے۔ خود میرے لباس کے معاملہ میں والد صاحب نے شیروانی سلوا کر دی۔ کیونکہ خود شیروانی پہنتے تھے لیکن میں نے سوٹ اور ٹائی پہنی تو انہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ اس لیے ہمیں گھٹن کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ہماری تربیت پر توجہ دی۔ اگر کسی کو ملنے گئے تو شام تک گھر واپس لوٹ آنا۔ رات گئے باہر نہیں گھومنا، اپنے ساتھ مذہبی پروگراموں میں لے کر جانا۔ پھر شالامار باغ کا میلہ، اقبال پارک میں نمائش فو غیرہ تو دکھانے لے جاتے اس طرح بڑا بیلنس رکھا ہوا تھا۔

س آپ کے قریبی دوست بچپن میں کون کون سے تھے اور آپ کو اپنے دوستوں کی کیا خصوصیات پسند ہیں؟

ج گھر سے باہر فضول نکلنے کی اجازت نہ تھی اس لیے کوئی خاص دوست نہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں مختلف اداروں میں تعلیم حاصل کی تو کلاس فیلو تبدیل ہوتے رہے۔ میری پرورش خواتین میں زیادہ ہوئی اس لیے میرے اندر شرماہٹ کا عنصر زیادہ ہے اور اس کمی کو آج بھی محسوس کرتا ہوں۔

س کتابوں کے روزگار سے کیسے وابستہ ہوئے۔

ج کتابوں کا روزگار وراثت میں ملا۔ بچپن میں والد کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری آ پڑی۔ اگرچہ ابتدائی چند سال میرے کزن نے اس کام کو سنبھالا جو بچپن سے میرے والد کے ساتھ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سکول سے آ کر کام کرتے جیسے پوسٹ آفس پارسل بک کروانا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک دن شدید گرمی میں سکول سے آیا تو میرے کزن نے پارسل دیے کہ بک کروا کر آؤ پوسٹ آفس بند ہو جائے گا۔ مجھے بھوک لگی تھی۔ میں نے

والدہ سے شکایت کی تو انہوں نے نہایت شفقت سے سمجھایا کہ اب ذمہ داری آ پڑی تو اس کو نبھانا ہوگا اور آگے جا کر تم نے مکمل کاروبار سنبھالا ہوگا اس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار کرتی۔

س اُس وقت اردو بازار کی صورت حال کیا تھی؟

ج ہمارا مکتبہ موچی دروازے میں تھا۔ اُردو بازار کے کئی تاجر اور کئی دیگر قریبی شہروں کے تاجر جو ہر ہفتہ اردو بازار آتے ان کا اصرار تھا کہ ہم اردو بازار میں ایک برانچ قائم کریں۔ اُردو بازار کے ایک تاجر ابولیث صاحب کا تقاضا سب سے زیادہ تھا میں ابھی تعلیم حاصل کر رہا تھا لیکن ان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ اتفاقاً لیث صاحب کے قریب دو دو کانیں نئی تعمیر ہوئیں اور وہ جس مالک کی تھیں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی بیوہ نے لیث صاحب کے ذمہ کرایہ دار تلاش کرنے کی ذمہ داری ڈال دی۔ اب ان کا دباؤ مزید بڑھ گیا تو میں نے اپنے ماموں کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ تو وہ میرے ساتھ دوکانیں دیکھنے گئے اور طے پایا کہ لے لی جائیں۔ میں ان دنوں گریجویشن کے آخری سال میں تھا اور امتحانات کی وجہ سے کالج سے فری ہو گیا تھا۔ اس دوران دوکان لے لی اور فائنل امتحان دوکان شروع کرنے کے بعد دیا۔

اُردو بازار میں اس زمانے میں تھوڑی دوکانیں تھیں۔ اسلامی کتب کی تو صرف ۱۰/۸ ہوں گی۔ زیادہ تر اسٹیشنری اور سلیبس سے متعلقہ تھیں لیکن رفتہ رفتہ یہاں بہت بڑی مارکیٹ بن گئی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ایشیا کی سب سے بڑی تو غلط نہ ہوگا۔ کم و بیش ۴ ہزار دوکانیں ہیں۔

س ابتداء سے لے کر ۲۰۱۹ء تک کتابوں کے عروج و زوال کی مختصر کہانی قارئین سے شیئر کریں۔

ج جب میرے والد مرحوم اشاعت کا کام کرتے تو اس وقت عام مطالعے کی کتاب کے ایڈیشن ۲ سے ۵ ہزار کی تعداد میں شائع ہوتے۔ پھر رفتہ رفتہ تعداد میں کمی آ گئی۔ اگرچہ نمبر آف بکس بہت بڑھ گئے لیکن تعداد اشاعت کم ہو گئی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تعداد اشاعت آبادی اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی لیکن اس کا رجحان کمی کی طرف ہوا جو ایک

افسوس ناک بات ہے۔

س: کتاب کلچر کے زوال کی بنیادی وجوہات کیا ہیں؟

ج: میرے نزدیک کتاب کلچر اور مطالعہ کے زوال کے بہت سے اسباب ہیں۔آج کل نئی نسل میں جدید ٹیکنالوجی کا بہت زیادہ استعمال ہے۔ بلکہ اس کے استعمال کے اثرات اس حد تک ہو چکے ہیں کہ ماں باپ، عزیز و اقارب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری عمر کی نسل پھر بھی کسی حد تک مطالعہ کی عادی ہے۔ اس زوال کے اندر ہم سب شریک ہیں۔ مطالعہ کی عادت بچپن سے ہوتی ہے۔ہم نے بچے کو کبھی نہیں کہا کہ کتاب خریدے یا کسی کو سالگرہ میں تحفہ کے طور پر کتاب دے۔ ہم بچوں کو سینکڑوں روپے کی فاسٹ فوڈ لے کر دیتے ہیں لیکن کبھی کتاب خریدنے کو نہیں کہتے۔

آج کا اُستاد بھی طالب علم کو کتاب خریدنے کی ترغیب نہیں دیتا۔ بلکہ اکثر اساتذہ خود ہی مطالعہ نہیں کرتے یہاں ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم کے حوالے سے کہوں گا وہ بتاتے کہ میں جب پنجاب یونیورسٹی میں پرنسپل تھا تو لائبریری کا ایک سروے کروایا کہ ایک سال میں کتنے اساتذہ لائبریری سے کتاب جاری کرواتے ہیں تو صرف Stat کے ایک اُستاد کے علاوہ کسی نے بھی کتاب جاری نہ کروائی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ من حیث القوم اس زوال میں سب شریک ہیں۔

س: بطور پبلشر آپ کا کن نامور ادیبوں سے تعلق رہا۔اس کا احوال بیان کریں۔

ج: یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ ہمارے مکتبہ سے علمائے کرام، ادباء، شعرا کی ایک بڑی تعداد کا رابطہ رہا اور ہے۔ کئی لوگوں کی پہلی کتاب شائع کر کے ان کو متعارف کروایا۔ مثال کے طور پر مولانا کوثر نیازی کی پہلی کتاب ''زرگل'' عاصی کرنالی کی ''رگِ جاں'' شائع کی۔ ہمارے مکتبہ سے ایک رسالہ ماہنامہ ''تعمیر انسانیت'' شائع ہوتا رہا۔ جس میں بطور مدیر کوثر نیازی صاحب کام کرتے رہے۔ جو ۱۹۶۴ء میں بند ہو گیا۔ رابطوں کی ایک طویل فہرست ہے کس کس کا ذکر کروں۔

س: حفیظ تائب اور مظفر وارثی سے متعلق کچھ بتایئے۔

ج: کراچی میں میرے ملنے والے انتہائی محترم شمیم احمد صاحب تھے۔ جو کراچی میں ادبی تقریبات کا انعقاد کراتے۔ وہ عالمی مشاعرہ کرواتے جو بے حد معیاری ہوتا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ مشاعرہ کی باقاعدہ ٹکٹ ہوتی اور اس آمدنی سے شعراء کی خدمت کی جاتی۔ لاہور سے مظفر وارثی صاحب کو بلاتے، ان کے ساتھ شمیم صاحب کے کافی مراسم تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تم وارثی صاحب کی کتب شائع کرو میں انہیں تمہارے پاس بھیجوں گا۔ اس طرح ایک دن وارثی صاحب تشریف لائے اور اشاعت کتب کا معاملہ طے پا گیا۔ ایک طویل عرصے تک ان سے تعلق رہا۔ ARY نے نعت کے حوالے سے ایک پروگرام ریکارڈ کیا جو ان کی زندگی کے بارے میں غالباً آخری پروگرام تھا۔ وہ شدید علیل تھے اور بڑی مشکل سے اس میں شریک رہے۔ اس گفتگو میں چند باتیں مجھے بھی کہنے کا موقع ملا۔

شاد باغ لاہور سے حاجی رفیق اشرفی صاحب میرے والد صاحب کے پاس تشریف لاتے۔ ایک دفعہ ان کے ساتھ حفیظ تائب بھی آئے۔ یہ ساٹھ کی دہائی کا زمانہ ہے۔ غالباً تائب صاحب کا کوئی مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا تھا۔ تو اشرفی صاحب نے ان کا تعارف بطور شاعر کروایا۔ اردو بازار میں آنے کے بعد تائب صاحب کبھی کبھی تشریف لاتے۔ بڑی شفقت سے ملاقات ہوتی۔ ایک بار انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ''القمر انٹرپرائز'' سے ان کی کتب شائع کروں جو اس وقت مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھیں۔ (یاد رہے کہ ۱۹۸۳ء میں القمر انٹرپرائزز کے نام سے ادارہ قائم کیا جو پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ سے بھی رجسٹرڈ ہے۔ اس کے زیراہتمام زیادہ تر ادبی، سیاسی کتب شائع کی ہیں) میں نے فوری حامی بھر لی اور اب تک ان کی کتب شائع کر رہا ہوں۔ تائب صاحب بہت پارسا اور محبت کرنے والے تھے۔ ان کے بھائی عبدالمجید منہاس صاحب نے کمال حق ادا کیا اور ان کے کام کو زندہ رکھنے کے لیے ''حفیظ تائب فاؤنڈیشن'' بنائی ہے۔ ان کے نواسے نعمان تائب صاحب کمال محنت سے ان کے علمی سرمایہ کو ترتیب دے رہے ہیں۔

س: آپ اچھا خاصا ادبی ذوق رکھتے ہیں مگر تقریبات میں شرکت نہیں کرتے اس کی

کوئی خاص وجہ؟

ج: سکول کے زمانے میں بچوں کے لیے چند کہانیاں لکھیں جو اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند کہانیاں میری چھوٹی بہن نے اخبارات میں سے کاٹ کر محفوظ کی ہوئی تھیں۔ جو میں نے ''دلچسپ کہانیاں'' کے عنوان سے بچوں کے لیے ایک چھوٹی سی کتابی شکل میں شائع کیں۔ کالج کے زمانے میں ''مجلس علوم اسلامیہ'' سوسائٹی کا تین سال تک مسلسل ناظم اعلیٰ رہا۔ غالباً یہ ایک ریکارڈ ہے۔ کیونکہ یہ عموماً ایک سال کے لیے ہوتا ہے۔ پھر کالج کے میگزین ''کریسنٹ'' کی مجلس ادارت میں شامل رہا۔ ادبی تقریبات میں شرکت کے لیے وقت ہی کم ملتا ہے اور پھر اگر شامل ہو جاؤں تو اکثر ادیب اپنی کتاب چھپوانے پر اصرار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ہر ایک کی کتاب شائع نہیں کی جا سکتی۔

س: اگر آپ پبلشر نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟

ج: میں اگر پبلشر نہ ہوتا تو پھر بھی پبلشر ہی ہوتا۔ کیونکہ میری تربیت اسی فیلڈ میں ہوئی۔ البتہ ایک بات طے ہے کہ میں ملازمت اختیار نہ کرتا۔ کیونکہ مجھے تجارت ہی پسند ہے۔

س: زندگی میں کچھ غیر معمولی واقعات جس سے خدا پر ایمان پختہ ہوتا ہے، پیش آئے ہوں تو؟

ج: بنیادی طور پر بچپن کی تربیت اس انداز میں ہوئی کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور یقیناً ہے بھی لیکن جب آپ پریکٹیکل لائف میں آتے ہیں تو بہت اونچ نیچ آتی رہتی ہے لیکن بعض واقعات آپ کے ایمان کی پختگی کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ سفر میں روانگی کے وقت سفر کی دعا ضرور پڑھوں۔ میں چھٹی یا ساتویں کلاس میں ہوں گا کہ سائیکل پر جا رہا تھا۔ سائیکل چلاتے ہوئے بیک سائیڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ آگے جا کر فٹ پاتھ سے ٹکرایا اور گر پڑا۔ تیز رفتار ٹریفک میں صرف اللہ نے بچایا ورنہ کوئی بھی گاڑی کچل سکتی تھی۔ اسی طرح جب نیا نیا اردو بازار آیا تو کراچی کے اداروں کا مال رکھنا شروع کیا۔ ایک ایجنٹ نے اطلاع دی کہ فلاں دن میں بل کی رقم لینے آؤں گا۔ میں نے اس کی رقم کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مگر وہ نہ آیا تو میں وہ رقم گھر لے گیا۔ اگلے دن میں دوکان پر

پہنچا تو سوچا کہ اس کی رقم میں لاک میں رکھ دوں تو وہ رقم کہے کہ مجھے ہاتھ نہ لگا۔ گھر سے آتے ہوئے وہ رقم کہیں گر گئی۔ یہ نقصان میرے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنا اور میں ڈپریشن میں چلا گیا۔ اب جو بندہ مجھ سے پوچھے تو رام کہانی سنا دوں۔ چند دنوں کے بعد ایک بزرگ تشریف لائے انہوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ رقم تم گھر سے لائے۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا جہاں سے کمایا وہاں سے اللہ اور دے دے گا۔ جسے وہ رقم ملی شاید وہ تم سے زیادہ ضرورت مند ہو۔ اس بزرگ نے مجھے ذہنی طور پر مطمئن کر دیا۔ ابھی اس واقعہ کو چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے کہ مجھے دو صد بلیک بورڈ چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں سٹیشنری کا کام نہیں کرتا۔ آپ کسی اسٹیشنری والے سے رابطہ کریں۔ کہنے لگے تم ہی کر کے مجھے بتاؤ۔ مختصر یہ کہ میں نے کافی کوشش کے بعد کارخانہ تلاش کیا جہاں یہ بنتے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ جلدی جلدی بھی ہم ہفتے میں دس عدد دے سکتے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو ۲۰ ہفتے لگ جائیں گے۔ بہر حال میں نے اس صاحب کو ساری صورت حال بتائی اور ریٹ بھی زیادہ دیا تا کہ یہ سر دردی نہ ہو۔ انہوں نے فوری ریٹ قبول کیا اور رقم ایڈوانس دی اور جلد آرڈر مکمل کرنے کو کہا۔ میں نے کارخانے والے کو ایڈوانس رقم دی اور کہا زیادہ کاریگر لگا کر فوری تیار کر دو۔ دو ماہ میں مکمل مال سپلائی کیا اور جو منافع کمایا وہ میری گمشدہ رقم سے زیادہ تھا۔ ظاہر ہے یہ رقم پبلشنگ سے ہٹ کر تھی اس طرح کے کئی ایک واقعات زندگی میں آئے جو یقیناً رب پر ایمان کی پختگی میں اضافہ کرتے ہیں۔

س کتاب کا کھویا ہوا وقار کیسے بحال ہو سکتا ہے۔ کیا کتب بینی کا رجحان دوبارہ فروغ پا سکتا ہے؟

ج کتاب کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لیے آج کل سوشل میڈیا اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ لوگوں کو اور خصوصاً نوجوان نسل کو کتاب کے مطالعے پر زور دینا چاہیے۔ ہمارے ڈرامے اور دیگر پروگرام ایجوکیشن اور کتاب دوستی پر مبنی ہونے چاہئیں۔ یہ کام ابتدائی کلاسوں سے ہونا چاہیے۔

س کیا آپ کتاب اور ادب کے حوالے سے قائم حکومتی اداروں کی کارکردگی سے

مطمئن ہیں؟

ج حکومت نے ادب کے حوالے سے کئی ادارے قائم کیے جیسے "مرکزی اردو بورڈ" تھا جس کا موجودہ نام "اُردو سائنس بورڈ" ہے۔ اس کو اشفاق احمد صاحب نے قائم کیا اور بے پناہ محنت کی۔ حتیٰ کہ لاہور میں اپنی عمارت ہے لیکن انہوں نے لاکھوں روپے ماہوار کرایہ پر جگہ لی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کس کو Obliged کیا جا رہا ہے۔

س حکومت کو کیا اقدام کرنے چاہئیں، پبلشرز کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور قاری کا کیا کام اور منصب ہونا چاہیے؟

ج حکومت کو میرٹ پر ڈائریکٹر لگانا چاہیے۔ یہ نہ ہو سائنس کا شعبہ ہو اور وہاں شاعر لگا دو یا فنونِ لطیفہ کا بندہ ہو تو وہ سائنس کا آدمی لگا دیا جائے۔ میرٹ پر ادارے کا ڈائریکٹر لگے تو وہ بہتر کارکردگی دکھا سکتا ہے۔ جیسے مجلس ترقی ادب میں تحسین فراقی صاحب کے آنے کے بعد کافی بہتر کام سامنے آیا۔

پبلشرز کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کتابوں کی پائیرسی ختم کرے، قیمتوں کو ایک مناسب حد تک رکھے۔ دوکانداروں کو کمیشن زیادہ دینے کے چکر میں کتابوں کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ نہ کرے اور معیار کو بہتر کرے۔ ایک زمانے تک کتابوں پر دوکانداروں کو ۲۰ سے ۲۵ فیصد تک کمیشن دیا جاتا تھا اور عام گاہک کے لیے کوئی رعایت نہ تھی لیکن اب یہ کمیشن ۷۰ سے بھی زائد چلا گیا۔ میرے خیال میں یہ عام قاری کے ساتھ زیادتی ہے اور زیادہ قیمت کی وجہ سے خریدار کم ہو گئے ہیں۔ قاری کو چاہیے زندگی کی دیگر ضروریات کے ساتھ "کتاب" کو بھی اس میں شامل کریں اور اپنے بجٹ میں ہر ماہ کتابیں ضرور خریدے اور اگلی نسل کو بھی اس کی عادت ڈالیں۔

س اپنی پسند کی کوئی تحریر یا غزل؟

ج یہ میری کمزوری ہے کہ مجھے اشعار بہت کم یاد رہتے ہیں۔ اسلم کولسری مرحوم کا ایک خوبصورت شعر یاد آ گیا۔

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے

کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

ممتاز مفتی نے ''لبیک'' لکھی اس میں سے ایک اقتباس بے حد پسند ہے:

''میرے اللہ کی شان نرالی ہے کہ اس نے اپنے کوٹھے کی تعمیر اس قدر منفرد کروائی، جس میں نہ کوئی ڈھب ہے نہ ڈھنگ ہے اور اس بے ڈھبے بے ڈھنگے کالے کوٹھے میں جاذبیت اس قدر کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کہ زائر کی نگاہیں اس پر اس حد تک مرکوز ہو جاتی ہیں کہ وہ عظیم مسجد، خوبصورت اور پر ہیبت دیواریں عظیم الشان محرابیں نگاہ میں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ کالا بے ڈھبا کوٹھہ اُبھرتا ہے۔ اُبھرے چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ تمام کائنات اس کی اوٹ میں آ جاتی ہے۔''

س مکتبہ تعمیر انسانیت کا سفر تا حال......؟

ج مکتبہ تعمیر انسانیت کا قیام میرے والد شیخ محمد قمر الدین مرحوم نے کیا تھا۔ قیام پاکستان سے کئی سال قبل اس کی بنیاد رکھی۔ ویسے پبلشنگ کے کام میں وہ اس سے بہت پہلے سے منسلک تھے۔ پہلے عید کارڈ، قطعات اور طغرے شائع کرتے۔ اس زمانے میں فحش تصاویر والے عید کارڈ شائع ہوتے۔ میرے والد نے قرآنی آیات، اسلامی تاریخی عمارات، اعلیٰ اخلاقی اشعار سے مزین قطعات شائع کر کے ایک نیا ٹرینڈ دیا۔ الحمدللہ وہ اتنے پاپولر ہوئے کہ نہ صرف پاک و ہند بلکہ ہمسایہ ممالک ایران، ترکی میں اس کی نقل شائع ہوئی اور یوں میرے والد ''موجد اسلامی قطعات'' کے حوالے سے پہچانے جانے لگے۔ اس کے بعد سورۃ یٰسین مترجم، رنگہ بلاکوں کے ذریعے شائع کی اور پھر آہستہ آہستہ کتب کی جانب آئے۔ ۱۹۵۱ء میں سید مودودی کی شہرہ آفاق تفسیر تفہیم القرآن شائع کی جس پر بے انتہا محنت کی اور اس کے ترجمہ و تفسیر کو ایک نیا انداز دیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد عید کارڈ قطعات کا کاروبار قریب قریب ختم کر دیا اور صرف تفہیم القرآن کی اشاعت میں مگن ہو گئے اور یوں ناشر تفہیم القرآن بن گئے۔ ۱۹۶۸ء میں رحلت فرما گئے۔ سید مودودیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مکتبہ کو ایک مضبوط بنیاد بنا گئے۔ الحمدللہ آج مکتبہ ان کے لگے ہوئے پودے کو تناور

درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ سیرت رسولؐ پر شائع کردہ کتب ادارہ کا خاص موضوع رہا۔ مکتبہ کے زیر اہتمام مختصر موضوعات پر سینکڑوں کتب شائع کیں اور کئی کتب پر صدارتی ایوارڈ بھی حاصل کیے۔ دنیا کے ہر خطے میں جہاں جہاں اردو پڑھنے والے موجود ہیں ہماری کتب وہاں پہنچیں۔ ہمارے خوش ذوق قارئین ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔

س ادب کی کتب خاص کر شاعری کی کتب کا مستقبل کیا دیکھ رہے ہیں؟

ج اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید ٹیکنالوجی نے کتب کی فروخت کو متاثر کیا ہے۔ اس طرح آج کتاب کا سنجیدہ قاری بھی سہولت پسند ہو گیا ہے اور کتاب کی تلاش میں دکانوں کا رُخ نہیں کرتا بلکہ جو مواد اُسے یوٹیوب یا گوگل پر مل جاتا ہے اُس سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب پڑھنے کا رُجحان بالکل ختم ہو گیا ہے۔ بک فیئرز میں اب بھی کتاب پڑھنے والے کھنچے چلے آتے ہیں۔ ایک چھت کے نیچے ان کو ورائٹی مل جاتی ہے تو وہ اس سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ رہا ادبی کتب کا سوال تو تحقیقی اور تنقیدی کتب اب بھی فروخت ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے قائم ہو گئے ہیں اور وہاں تحقیقی کام ہوتا ہے۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاتے ہیں تو لامحالہ ادبی کتب کے حوالوں کے بغیر ان پر کام کرنا مشکل ہے۔ البتہ شاعری کی کتب اب بالکل فروخت نہیں ہوتیں۔ کیونکہ یہ پہلے بھی تفریح کے زمرے میں آتی تھیں اور اب لوگوں کے پاس موبائل میں تفریح کے لیے بہت کچھ ہے۔

منصور آفاق

س آپ بیک وقت شاعر، کالم نویس، ڈرامہ رائٹر اور ناول نگار ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان اصناف کے ساتھ آپ انصاف کر پائے ہیں؟

ج چراغ جب کمرے میں جلتا ہے تو اس کی روشنی مختلف چیزوں سے ٹکرا کر مختلف شیڈز بناتی ہے۔ اب کون سا شیڈ زیادہ خوبصورت ہے اس کا فیصلہ تو آنکھ کرتی ہے چراغ نہیں۔"

س آپ کی شاعری پڑھ کر لگتا ہے آپ روایتی غزل سے غیر مطمئن ہیں اور جدید غزل میں لفظیات، مضامین اور ردیف قافیہ کی سطح پر نت نئے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ کیا ہمارے بعض ناقدین کی طرح آپ بھی روایتی اُردو غزل کو مردہ سمجھتے ہیں؟

ج قطعاً نہیں روایتی شاعری ہی اس وقت تک اردو زبان کی بڑی شاعری ہے۔ مگر یہ طے شدہ بات ہے کہ یہ ماضی سے متعلق ہے اور میں حال کی بڑی شاعری کی تلاش میں نکلا ہوا مسافر ہوں۔

س ظفر اقبال نے غزل میں زبان کے حوالے سے جو تجربات کیے کیا آپ ان کو درست سمجھتے ہیں یا اپنے تجربات کو؟

ج اس میں کوئی شک نہیں کہ ظفر اقبال نے ایک نیا راستہ دکھایا۔ اس راستے پر کون کس طرح سفر کرتا ہے یہ اپنی اپنی ہمت کی بات ہے۔

س کیا آپ اردو میں ۷۰ کی دہائی کے بعد لکھی جانے والی نظم کو زیادہ توانا سمجھتے ہیں یا غزل کو زیادہ مضبوط گردانتے ہیں؟

ج ستر کی دہائی کہیں یا اس سے تھوڑا سا پہلے۔ نظم اور غزل دونوں میں حیرت انگیز تبدیلی

آئی۔ نظم کو جو نیا موڑ مجید امجد نے دیا اس پر کئی کئی بستیاں آباد ہو گئیں اور غزل کو جو مزاج شکیب جلالی اور ظفر اقبال نے دیا وہ ہمارے زمانے کا اجتماعی لہجہ قرار پایا۔

س: شاعری کے فروغ میں مشاعرے کا کیا کردار ہے؟

ج: ماضی میں بہت زیادہ تھا جب ذرائع ابلاغ محدود تھے۔ اب اس کی حیثیت ایک کلچرل ایونٹ کی ہے۔

س: دیوانِ منصور کا خیال کیسے آیا؟

ج: آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

س: آپ نے استغاثہ کے عنوان سے طویل نظم لکھی۔ پھر غالباً ۱۰۰۰ صفحات پر مشتمل ناول لکھا مگر دونوں کتابیں کئی برسوں سے شائع نہیں ہوئیں۔ کیا آپ اپنی تخلیقات سے غیر مطمئن رہتے ہیں؟

ج: میں آج تک اپنی کسی تخلیق سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوسکا۔

س: آپ ادب میں اور ادیبوں میں محاذ آرائی کی سیاست کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: ادب میں محاذ آرائی مثبت عمل ہے ادیبوں میں محاذ آرائی منفی عمل ہے۔

س: میانوالی کے شاعر کو لندن میں تنہائی محسوس نہیں ہوتی؟

ج: شاعر کی باطنی دنیا اتنی وسیع ہوتی ہے کہ اسے کہیں بھی تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔

س: آپ کا تعلق کس ادبی گروہ سے ہے؟

ج: ''اس گروہ سے جو ابھی وجود میں آنا ہے۔''

س: کیا ادیب کا سیاست میں بھی کردار ہونا چاہیے؟

ج: جس ادیب کا اپنے عہد کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں وہ ادیب نہیں۔ اس کا ادب چڑیا خانے کی حکایات پر مبنی دوسری دنیا کا بھٹکا ہوا شوق تو ہوسکتا ہے ادب نہیں۔

س: لفظوں کو غیر متروک قرار دینے کا اختیار کس کے پاس ہے؟

ج: صرف بولنے اور لکھنے والوں کے پاس۔

س: کالم میں بالکل الگ منصور آفاق نظر آتا ہے۔شاعر منصور آفاق کو خود سے الگ کیسے کرتے ہیں؟

ج: ذرا سا جھیل کی گہرائی میں اتر کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔تہہ میں ایک ہی طرح کی مٹی پڑی ہوئی ہے۔

س: آپ کی زندگی کا نصب العین کیا ہے؟

ج: زمین پر انسان، انسان بن کر رہنا شروع کر دے۔

س: زندگی میں کون سا دور آپ کے لیے مشکل ترین دور تھا۔

ج: ہر وہ دور جس سے میں گزر رہا تھا۔"

س: آپ کانفرنسوں کا انعقاد بھی کرتے ہیں اور سلطان باہو کے حوالے سے آپ کا کافی کام کتابی صورت میں سامنے آیا۔اس کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

ج: سلطان باہو فارسی زبان کے ایک شاعر اور نثر نگار ہیں۔ایک فلسفی ہیں۔مگر وقت نے انہیں صرف پنجابی کے شاعر کی حیثیت دے رکھی ہے۔میں نے کوشش کی ہے ان کی مکمل شخصیت زمانے کے سامنے آئے۔

س: مستقبل کے حوالے سے آپ کا لائحہ عمل یا نصب العین کیا ہے؟

ج: مستقبل میں کیا ہونا ہے۔یہ آسمانوں پر کہیں لکھا ہوا ہے اور میں ابھی اسے پڑھنے کے قابل نہیں ہوا۔

س: خواتین کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: وہی جو مردوں کی شاعری کے متعلق ہے۔

س: آپ کا شمار عہد جدید کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے ادبی حلقوں میں تو آپ کو کافی پذیرائی ملی۔حکومتی سطح پر اس کا اعتراف نہیں کیا گیا کوئی خاص وجہ؟

ج: حکومتی سطح پر زیادہ تر انہیں کو پذیرائی ملتی ہے جو اس طرف متوجہ ہوتے ہیں۔اپنا

مزاج ایسا نہیں ہے۔

س آپ نے فیض اور فراز کے حوالے سے موازنہ کیا اور بطور دلیل طویل مضمون لکھا۔ کیا واقعی احمد فراز بڑے شاعر ہیں فیض سے یا دوستی نبھائی ہے آپ نے؟

ج میں ابھی یہی سمجھتا ہوں۔ پوری ایمان داری کے ساتھ۔

س ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

ج تھوڑا سا وقت اپنے ساتھ بھی گزارا کرو۔

س سچ سچ بتائیں اب تک آپ نے کتنی محبتیں کی ہیں اور کتنی لڑکیوں نے آپ سے محبت کا اظہار کیا ہے؟

ج اللہ کا بہت کرم رہا ہے۔ دونوں طرف کوئی کمی نہیں رہی۔

محمد عاصم بٹ

س اپنی ابتدائی زندگی سے متعلق کچھ بتائیں۔ والدین بچپن، تعلیم۔

ج ابتدائی زندگی اندرون شہر میں گزری۔ انھیں گلیوں اور بازروں کی کہانیاں میں اپنی کہانیوں اور ناولوں میں بیان کرتا رہتا ہوں۔ گورنمنٹ کالج (یونیورسٹی) لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور دی نیوز لاہور میں نوکری کر لی۔ پھر جنگ پبلشرز منتقل ہو گیا۔ پھر اسلام آباد چلا گیا۔ وہاں مقتدرہ قومی زبان میں نوکری کی۔ این جی اوز کے ساتھ چند سال کام کیا اور پھر اکادمی ادبیات پاکستان میں ملازمت حاصل کی۔ پچھلے دس برسوں سے اکادمی ادبیات پاکستان سے وابستہ ہوں۔ چار ایک برسوں سے اکادمی کے لاہور کے دفتر میں ریذیڈنٹ ڈائریکٹر ہوں۔

میرے والدین امرتسر سے آئے تھے پاکستان کی آزادی کے وقت۔ یہاں وہ گوال منڈی میں آئے اور پھر اندرون شہر میں چلے گئے۔ بچپن سوتر منڈی اندرون لوہاری دروازہ میں گزرا، یا پھر محلّہ مولیاں میں۔ آج کل رہائش کیولری گراؤنڈ کے علاقے میں ہے۔

بچپن ہی سے کھیل کود سے رغبت رہی۔ کراٹے میں اورنج بیلٹ جیتی۔ جوگنگ کا ایک عمر میں جنون تھا اور میلوں روزانہ بھاگتا تھا۔ کبھی چند دوستوں نے مل کر کہ سب اتھلیٹ تھے اور محلے دار بھی، پورے شہر کو پیدل سر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ بیڈمنٹن بھی کبھی بہت کھیلا۔ موسیقی کی باقاعدہ تربیت لی۔ لیکن پھر دھیان ادب کی طرف ہو گیا تو یہ تمام مشاغل چھٹ گئے۔

لکھنے کا آغاز چھوٹی عمر میں کیا۔ قدرتی طور پر شاعری سے آغاز کیا۔ کالج کے زمانے تک شاعری میں طبع آزمائی کرتا رہا۔ لیکن طبیعت میں شعر لکھنے کی طرف جھکاؤ رفتہ رفتہ کم ہوا۔ کالج میں جب ایک رومانی صدمے سے گزرا تو کہانی کی راہ پکڑی۔ سوچا کہ شاعری کے لیے مستقل ایسی کیفیت کی ضرورت ہے کہ جس میں جذبہ غالب ہو، اور آپ اس کی سرخوشی میں مبتلا ہوں۔ فکشن نگار زمین سے جڑا ہوتا ہے، وہ ایسی آسائش سے محروم رہتا ہے۔ 90 کی دہائی میں چھپنے کا آغاز ہوا۔ پہلی کہانی 89 میں ماہ نو میں چھپی۔ لکھتا زیادہ ہوں، چھپتا کم ہوں۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔ کہانیاں لکھیں اور پھر ناول لکھنے کی راہ پکڑ لی اور اب تک پکڑی ہوئی ہے۔

س ناول لکھنے کا واقعہ کیا ہوا؟ کیا کہانی اظہار کے لیے قابل اطمینان نہیں لگی؟

ج پہلا ناول ایک کہانی ہی سے پھوٹا تھا۔ میں نے کہانی لکھی تو وہ بیس ایک صفحوں پر پھیل گئی۔ اور احساس ہوا کہ اس میں ہر منظر اور کردار پھیلنے کو اتاؤلا ہو رہا ہے۔ تو اسے پھر سے لکھا اور اس بار اس کی ضخامت مزید بڑھ گئی تو اسے میں نے پھیلنے دیا حتی کہ یہ ایک ناولٹ اور پھر ناول کی صورت اختیار کر گئی۔

ناول لکھنے کا واقعہ یہ ہے کہ میں ایک ادارے میں کام کرتا تھا جو ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی تھی۔ تو ایک دن کچھ دیر ہوگئی، رات گئے دفتر سے نکلا تو ساتھ والا پلازے کی پارکنگ ویران تھی۔ اور سڑک بھی سنسنان تھی۔ سارے میں خانہ بربادی کا تاثر بھرا ہوا تھا تو خیال آیا کہ کیا مزہ آئے اگر ابھی لائٹیں جلیں اور معلوم ہو کہ یہ سب کچھ محض ایک سجا ہوا سیٹ ہے۔ اس میں حقیقت کوئی نہیں ہے۔ تو کیا ہو؟ بس اسی خیال نے ایک منظر تشکیل دیا میں نے اسے لکھا اور اس منظر کے پٹارے میں سے کردار اور واقعات برآمد ہوتے گئے، ناول بنتا گیا۔

لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ کہانی یا افسانے کی نسبت ناول لکھنا کوئی بڑا کام ہے۔ نہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کہانی کہنا زیادہ مہارت کی شے ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ

نفاست، اور چابکدستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان پر زیادہ گرفت، اور بیان کی چستی درکار ہوتی ہے۔ خاص احتیاط کرنا ہوتی ہے کہ منظر میں وہی باتیں بیان کی جائیں جن کا تعلق کہانی سے ہے۔ پھر کہانی میں موڑ واضح ہونے چاہئیں، اور اس کا انجام بھی معنی خیز اور دلچسپ ہو۔ اس کے مقابلے میں ناول میں کئی طرح کی چھوٹ ہوتی ہے۔ اس میں ڈھیلا ڈھالا پن چل جاتا ہے۔

س اپنی ملازمت سے متعلق کچھ بتایئے؟

ج ایم اے کرنے کے بعد کوئی سال ڈیڑھ سال بے کاری کا گزارا۔ پھر کسی کی وساطت سے معلوم ہوا کہ دی نیوز میں رپورٹروں اور سب ایڈیٹروں کی بھرتی ہو رہی ہے۔ فوراً وہاں پہنچا، ٹیسٹ دیا اور منتخب کر لیا گیا۔ ترجمہ کے شعبہ میں رکھا گیا جہاں اردو خبروں کی انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ یوں صحافت میں باقاعدہ داخلہ ہوا، پھر فیچر بھی لکھے۔ انٹرویو بھی کیے۔ پہلی کتاب 'دوسرا آدمی' انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ سال ایک کے بعد اخبار چھوڑ دیا لیکن اس کے بعد سے اب تک کسی نہ کسی طور صحافت، رسالوں کی ادارت اور کتابوں کی نشرو اشاعت سے وابستہ رہا ہوں۔ اس دوران میں فرائیڈے ٹائمز، آج کل، فرنٹیئر پوسٹ وغیرہ کے لیے بھی کام کیا۔ غیر سرکاری فلاحی اداروں کے لیے بھی یہی اشاعت وغیرہ سے متعلق کام کیا۔ اکادمی میں بھی شعبہ اشاعت اور ادبی رسالے سے وابستہ رہا۔

س آپ نے بطور مدیر ''ادبیات'' کیا خاص کام کیا؟

ج اکادمی میں ادبیات کا مدیر بنا تو خیال آیا کہ کچھ مختلف کام کیا جائے۔ عام پرچے تو سبھی تیار کرتے ہیں، خاص پرچے تیار کرنا مختلف کام ہو سکتا ہے تو پھر سارا زور خصوصی شماروں کی تیاری پر دیا۔ یوں بھی اکادمی کے پاس رسالہ چھاپنے سے متعلق اتنے وسائل ہیں کہ میں نے سوچا کہ اتنے وسائل کے ساتھ عام پرچہ نکالنا تو کوئی بات نہیں ہے۔ خصوصی پرچے بہت سے نکالے حتی کہ نثری نظم پر بھی خصوصی پرچہ تیار کیا جو شاید اردو

میں اس موضوع پر کسی بھی رسالے کا پہلا اتنا ضخیم خصوصی شمارہ ہوگا۔ مختلف موضوعات اور شخصیات پر خصوصی شمارے تیار کرنے میں ایک طرح کی مہم جوئی ہوتی ہے۔ اور ادب میں مہم جوئی مجھے بہت مرغوب ہے۔ آسان کام ہو تو اس سے دل جلد اچاٹ ہو جاتا ہے۔ رسالوں میں میرا خیال ہے کہ خصوصی شماروں کی قدر و قیمت محدود نہیں ہوتی۔ خصوصی شمارے پرانے ہونے کے باوجود اپنی اہمیت نہیں کھوتے۔

س اپنی کتب کے بارے قارئین کو آگاہ کیجیے۔

ج دو مجموعے اب تک شائع ہوئے۔ اشتہار آدمی اور دستک۔ ایک اور بھی مجموعہ مکمل ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی چھپا نہیں۔ میں اب اپنی تمام کہانیوں کا جو سو کے قریب ہیں، ایک انتخاب شائع کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں صرف پندرہ کہانیاں شامل ہوں گی اور باقی میں تلف کر دوں گا۔ یہ انتخاب میرے دوست عرفان جاوید کر رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ کیا کہانیاں اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ زندگی کو جیسے دلچسپ انداز میں کہانیوں کی صورت میں پیش کیا جا سکتا اور اس پر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے، اس کے اثرات دوسروں پر مرتب کیے جا سکتے ہیں، ویسے کسی بھی دوسری صنف کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ زندگی کو جوں جوں آپ بڑے فریم میں دیکھنے کی کوشش کریں گے، یہ اپنی معنویت اور کشش کھو دے گی۔ اس کی تمام تر خوبصورتی اس کی جزئیات میں ہے۔ اور لمحہ گزرتی زندگی میں ہے۔ جسے کہانیاں پیش کرتی ہیں۔

س کہانی سے ناول کی طرف کیسے آئے؟

ج جی میرا تیسرا ناول 'بھید' بھی شائع ہو چکا ہے۔ کہانیوں سے ناول کی طرف آنے کی وجوہات تب واضح نہیں تھیں لیکن اب پیچھے مڑ کر دیکھنے پر احساس ہوتا ہے کہ کوئی ضرورت مجھے ناول کی طرف لائی اور وہ ضرورت ایک وسیع تر بیانیہ کی تلاش تھی جو جدید زندگی اور انسانی صورت حال کی پیچیدگیوں کو اپنے اندر سمو سکے اور تمام جدید رنگوں اور ذائقوں کو بیان کرنے کے اہل ہو۔ میں کہانیاں بھی لکھتا ہوں لیکن اظہار کی جیسی وسعت

ناول کا بیانیہ دیتا ہے، ویسی کہانیوں میں ممکن نہیں ہے ناول اور افسانے میں کچھ غزل اور نظم جیسا رشتہ ہے۔ ایک میں ہر شے بہت تنگ سک ہوتی ہے، اور حتی کہ اس کی جمالیات بھی آپ کو بہت کھینچ کر رکھتی ہے۔ آپ کے اظہار پر بندشیں بہت ہوتی ہیں لیکن نظم میں بہت سے سہولتیں مل جاتی ہیں۔ اسی طرح کہانی میں زندگی کو بیان کرنے کے لیے زیادہ چابکدستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان بھی زیادہ نپی تلی ہو، بیان چست ہو اور مشاہدہ نہایت بامعنی اور مخصوص۔ کہانی میں منطقی ڈھانچے کا بھی آپ اہتمام کریں جو آپ کے سچ یا جھوٹ کو جیسا بھی وہ کہانی میں بیان ہوا ہے، پڑھنے والے پر سو فیصد سچ ثابت کرنے کے لیے کافی ہو۔

لیکن میرا مزاج مجھے ناول کی طرف لایا۔ میرا مسئلہ کہانی نہیں ہے، زندگی ہے۔ زندگی میں سے کہانی پھوٹتی ہے لیکن اصل کہانی ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہے۔ افسانے میں آپ کو اس کا ڈھیلا پن دور کر کے اسے کسنا پڑتا ہے۔ ناول کے بیانیہ میں آپ کے پاس گنجائش ہوتی ہے کہ آپ اسے ویسے ہی پیش کر دیں جیسی کہ یہ ہے۔

میرے ناول کے موضوعات اندرون شہر کی ثقافت، انسانی ذات کی داخلی بھول بھلیاں، زندگی کا اسرار اور حقیقت کا خوابناک رخ ہے۔ جسے آپ حقیقت کا دوسرا رخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو حقیقت ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے لیکن سامنے دکھائی نہیں دیتا۔ تو میرے ناول دائرہ اور بھید میں جادوئی حقیقت نگاری آپ کو دکھائی دے گی۔ تیسرا ناول ناتمام البتہ ایک سماجی مسئلے پر بنی گئی کہانی ہے۔

س کیا اُردو میں کہانی اور ناول کا مستقبل تشویش ناک ہے؟

ج اردو میں کہانی اور ناول کا مستقبل ہرگز تشویش ناک نہیں ہے۔ جہاں تک کہانی کا معاملہ ہے تو پوری دنیا ہی میں کچھ معاملہ اور ہو گیا ہے۔ اس کی کیا وجوہات ہیں، یہ تفصیل سے زیر بحث لائے جانے کے لائق نقطہ ہے۔ مارکیٹ کی قوتیں بھی ہو سکتی ہیں جو اپنے تجارتی مقاصد کے تحت ادب میں دنیا بھر میں ناول کے چلن کو عام کر رہی ہیں۔ وہ مختصر

کہانی کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں۔ بہرحال ناول کا مستقبل پاکستان میں اور دنیا بھر میں بہت روشن دکھائی دیتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ ناول کی طرف آ رہے ہیں۔ خاص کر شاعروں کی ایک بڑی تعداد ناول نگاری کی طرف مائل ہوئی ہے۔ جو ایک خوش آئند بات ہے۔

س اُردو میں اچھے ناولوں کی تعداد کم ہے اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج اردو میں بلاشبہ اچھے ناولوں کی تعداد کم ہے۔ اس کی وجوہات یقیناً بہت ہیں۔ اردو زبان کی کتنی عمر رکھتی ہے۔ اس پر نثر کی عمر اور بھی کم ہے۔ اردو ناول کو تو ابھی سوا سو سال بھی نہیں ہوا ہوگا۔ پھر بھی ہمارے پاس عالمی معیار کے اتنے ناول تو ہیں کہ ہم اعتماد کے ساتھ انھیں کہیں پیش کر سکتے ہیں۔ دوم ناول کے لیے جن تہذیبی اور علمی عناصر کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی یہاں ہمیشہ سے قلت ہے۔ ہمارا مزاج جو ایک گرم ملک کا مزاج ہے، ناول نگاری کے لیے موافق نہیں ہے۔ برصغیر میں خاص کر مسلمانوں کو اپنی حکومت کھودینے کے بعد جن مخدوش حالات سے گزرنا پڑا، وہ بھی ایک وجہ بنی یہاں اردو میں ناول کے فروغ میں رکاوٹ کی۔ لیکن ناول پر کبھی زوال نہیں آیا۔ یہ مسلسل ارتقا کی صورت میں ہے۔ اور ہمارے پاس تارڑ اور مرزا اطہر بیگ تک ناول نگاروں کی ایک کہکشاں موجود ہے۔

س اُردو کے چند بڑے ناول نگاروں کے نام؟

ج یہ ایک مشکل سوال ہے۔ لیکن بہرحال قرۃ العین حیدر، پریم چند، عبداللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ، انتظار حسین، عصمت چغتائی، کرشن چندر، بانو قدسیہ، ایک طویل فہرست ہے جو ہمارے بڑے لکھنے والے ہیں۔ انھوں نے اردو ناول کو بہت ثروت مند بنایا۔ میں نے اس سوال کو اس لیے مشکل کہا کہ یہ فہرست کبھی تسلی بخش انداز میں مکمل نہیں ہو سکتی۔ خاص کر نئے لوگ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ ابھی میں اقبال خورشید کا ناولٹ دیکھ رہا تھا، مختلف ہے۔ اختر رضا سلیمی، نجم الدین احمد، کاشف رضا، رفاقت حیات، آمنہ

مفتی وغیرہ اچھے نئے لکھنے والے ہیں اور ناول میں نئے تجربات کر رہے ہیں۔

س: آپ نے تراجم بھی کیے۔ یہ آپ کا شوق ہے یا معاشی ضرورت؟

ج: ترجمے کی طرف میں ذاتی دلچسپی کی وجہ سے آیا۔ میں ہر اس تحریر کو اردو میں ترجمہ کرنے کا عادی تھا جو مجھے انگریزی میں اچھی معلوم ہوتی تھی۔ تو میں نے کہانیوں وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ یونہی کا فکا کہانیاں کا ترجمہ کیا۔ لیکن پھر اس سے معاش کا سلسلہ بھی جڑ گیا۔ تو اسے جاری رکھنے میں معاشی ضرورت زیادہ کارفرما ہوئی۔ اب تک میرے کیے ہوئے ڈیڑھ درجن سے زائد تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

لیکن ترجمہ نگاری کی طرف آنے کی اصل وجہ ادبی تربیت تھی۔ ترجمہ کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ اسی راستے پر چل کر وہ تمام سفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اصل مصنف گزرا تھا۔ آپ اس کی تحریر کو اس کی کیفیت سمیت ترجمہ کرتے ہیں اور یوں آپ کی اپنی تربیت ہوتی ہے۔ ایذرا پونڈ نے ہیمنگوے کو تخلیقی بنجر پن کے دنوں میں ترجمہ کرنیکا مشورہ دیا تھا۔ کیوں کہ اس کا کہنا تھا کہ شکاری ہر وقت شکار نہیں کھیلتا لیکن اپنے ہتھیاروں کو مسلسل چمکاتا رہتا ہے تاکہ شکار آئے تو اس سے کوئی چوک نہ ہو۔ ترجمہ کرنا اپنے ادبی ہتھیاروں کو چمکائے رکھنے کا عمل ہے۔

س: آپ کو کن علوم سے دلچسپی رہی؟

ج: بنیادی دلچسپی تو ادب ہی سے ہے لیکن معاملہ ادب تک محدود نہیں ہے۔ تاریخ سیاست، صحافت، نفسیات، فلسفہ وغیرہ موضوعات ایسے ہیں جن سے مجھے ہمیشہ سے رغبت ہے۔ سری علوم بھی ان میں شامل کر لیں۔ ان سب موضوعات پر کچھ نہ کچھ تحریریں اور کتابیں ترجمہ کی ہیں۔ میری ایک کتاب 'سو عظیم آدمی' بہت معروف ہے۔ اسے مائیکل ہارٹ نے لکھا تھا اور حضرت محمد ﷺ کا نام اس نے سرفہرست لکھا تھا۔ تو عیسائی دنیا میں بہت احتجاج ہوا کہ یسوع مسیح کا نام نبی کریم کے نام مبارک کے بعد میں کیوں رکھا گیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو ترجمہ کیا تو اسے بہت پسند کیا گیا، آج بیس برسوں سے یہ

ترجمہ مسلسل چھپ رہا اور بک رہا ہے۔

س کتاب کی فی زمانہ اہمیت کیا کم ہو رہی ہے؟

ج کتابیں آپ کو دوسروں کے تجربات تک آسان رسائی دیتی ہیں۔ پھر ان میں تجاویز بھی ہوتی ہیں کہ آپ کس طرح اپنی اپنی جگہ زندگی کی صورت حال پر قابو پا سکتے ہیں۔ کتابیں آپ کے دکھ کی شدت کو کم بھی کرتی ہیں اور آپ کی خوشیوں کو دوبالا کرنے میں آپ کا ساتھ دیتی ہیں۔ آپ کو ایک پرسکون زندگی گزارنے کی بھی راہ دکھاتی ہیں۔ آپ کو ایسے زمانوں میں پھرا لاتی ہیں اور ایسے تجربات سے گزار سکتی ہیں جن سے آپ غیر شناسا ہوتے ہیں۔

کتابیں آپ کے کردار اور اخلاق کی بھی تہذیب کرتی ہیں۔ کتابیں پڑھنے والے کے ہاں منطق کے لیے زیادہ لچک ہوتی ہے اور وہ مکالمہ کا رجحان رکھتا ہے۔ اس میں انتہا پسندی کا امکان کم ہو جاتا ہے اور وہ دوسرے کے ساتھ رہنے کے دوسروں کی نسبت زیادہ لائق اور موافق ہوتا ہے۔ کتاب کا مطالعہ آپ کی سوچ کی درست سمت میں ساخت پرداخت کرتی ہے۔ کیوں کہ آپ جو کچھ پڑھتے ہیں وہ منطقی تسلسل میں بندھا ہوتا ہے حتی کہ جملے کی گرائمر بھی۔ تو ایسی ہی آپ کی سوچ بھی ہوتی جاتی ہے۔ کتابیں معاشروں کے چہرے بدل سکتی ہیں۔ کتابوں کو فروغ دینا اصل میں معاشرت اور تہذیب کو فروغ دینا ہے۔ اور ان اقدار کی ترویج کرنا ہے جنھیں ہم بنیادی انسانی اقدار کے طور پر جانتے ہیں جیسے انسان دوستی، تحمل برداشت، نیک نیتی، ایثار، محبت وغیرہ۔

س ادب کیا ہے؟

ج ادب نقدِ زندگی ہوتا ہے۔ ادیب زندگی کے نقاد ہوتے ہیں اور اس کی کجیوں کو نشانہ بنا کر دوسروں کی توجہ کو اس طرف مبذول کرتے ہیں۔ یہ زندگی کے لیے ایک ماڈل نمونہ بھی پیش کرتا ہے۔ ادب ہی ہے جس کے پاس ایک خواب ہو سکتا ہے جس کی تعبیر وہ معاشرے میں مثبت تبدیلی کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ادب ہی وہ راستہ ہے جس

کے ذریعے انسان دوستی، بھائی چارہ اور محبت جیسی عالمی انسانی اقدار کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ ادب نہ ہو تو معاشرہ بھی اپنا چہرہ دیکھنے اور اسے سنوارنے کی اہلیت حاصل کرنے کے قابل نہ ہو پائے۔

س کتاب کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟

ج ہمارے ملک میں کتاب کا حال کچھ اچھا نہیں ہے۔ کتابیں چھاپنے والے کتابوں کی فروخت سے خوش نہیں ہیں۔ مصنف کو کوئی نہیں پوچھتا۔ شاعر پھر بھی کچھ کما لیتے ہیں۔ نثر میں مصنف کو مالی فائدہ کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی یہاں کتاب اور مصنف کے ایک بہتر مستقبل کی امید کی جا سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ سوچ کی جتنی آزادی کہیں ہوگی، وہاں کتاب اور مکالمہ کا چلن بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ پھر یہ بھی ہے کہ کتاب پڑھنے کی عادت بچپن سے ہی پڑتی ہے۔ اور اسے یونہی سکھایا جاتا ہے جیسے آپ کسی بچے کو رات کو دانت صاف کر کے سونے کی عادت ڈالتے ہیں۔ تو یہ پورا نظام ہے جس کے ذریعے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے کہ وہ کتاب پڑھیں۔ سکولوں اور گھروں میں اس کی تربیت ہوتی ہے۔ آئندہ جو زمانہ آ رہا ہے وہاں ایک کم پڑھے شخص اور کتاب سے لگاؤ نہ رکھنے والے شخص کے لیے زندگی آسان نہیں رہ جائے گی۔ اب تک سڑک پر آپ جائیں تو وہاں جگہ جگہ ہدایات لکھی ہوتی ہیں، کوئی کام کرنا ہو تو اس کے ساتھ دستاویزات جڑی ہوتی ہیں۔ آج خواندگی لازمی ہو گئی ہے۔ کتاب خواندگی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ ہمارے ملک میں کتاب کے کلچر کو مارشل لاء کے زمانوں میں خاص طور پر دبایا گیا کیوں کہ یہ واحد ذریعہ ہے جو روشنی کا استعارا بنتی ہے اور ایسے نظریات اور خیالات کو آپ کے درمیان جگہ بنانے کی کا موقع دیتی ہے جو بدیسی ہوتے ہیں یا جو آپ کے نقطہ نظر سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ جمہوری معاشرے کو فروغ دیتی ہیں۔

س ادبی رسالہ کی اشاعت کا تجربہ کیسا ہے؟

ج رسالے کے مدیر تو آپ بھی ہیں۔ اور ہم دونوں یہ جانتے ہیں کہ یہ مالی طور پر

سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ ادب اب تک ہمارے ملک میں مالی طور پر گھاٹے کا سودا ہے۔ کوئی ادیب ایسا نہیں ہے جو کہے کہ وہ صرف ادب کے ذریعے ہی روزی روٹی کما سکتا ہے یا کماتا ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں پیشہ ور ادیبوں کی قلت ہے جو کل وقتی ادیب ہو، اور اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں۔ جو ادیب ایسے ہیں انھیں پھر اپنی معاشی خوش حالی کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ آپ کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ دونوں طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ جو ادبی رسالہ چھاپ رہا ہے، میرے خیال میں وہ بڑا کمال کر رہا ہے۔ بلکہ میں تو اسے ادبی جہاد کہوں گا۔ رسالے کا مدیر ادبی مجاہد ہے۔ جو جہالت، اور کم علمی کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے اور ادب کی روشنی کو عام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

س ادیب کی ذمہ داری کیا ہے؟

ج کسی لکھنے والے کی ادبی ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ سچ لکھے۔ چاہے یہ کیسا ہی کڑوا ہو اور چاہے اسے لکھنے سے اسے خود ہی نقصان کا اندیشہ ہو۔ سچ لکھنا اس کی مجبوری بھی ہے۔ اگر وہ دل پر اثر کرنے والا ادب لکھنا چاہتا ہے جو کسی بھی اچھے اور بڑے ادب کی بنیادی خاصیت ہے تو سچ ہی اس کے لیے واحد راستہ ہے جو اس کے الفاظ میں روشنی اور تاثیر بھر سکتا ہے اور وہ لفظ کاغذ پر جی اٹھیں گے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو گرمائیں گے۔ آج کتنے لوگ ہیں جو یہ دعوی کریں کہ وہ سچ لکھ رہے ہیں، وہ مصلحت کوشی کو کسی خاطر میں نہیں لاتے۔ جو ادب جھوٹ پر بنیاد رکھتا ہے، اس کی تاثیر میں کمی ہو جاتی ہے۔ سچا حرف اپنی خوش بو اور ذائقے سے اپنا تعارف کرواتا ہے اور اثر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

س ہمارے ہاں ادبی کیسے کیسے ہیں؟

ج ادبی رویوں سے آپ کی مراد اگر ادیبوں کے رویے ہیں تو یہ اور بات ہے، اور اگر ہم بات کریں کہ ادب کے رجحانات میں آنے والی تبدیلی کی، تو یہ اور بات ہے۔ ادیبوں کے رویوں پر میں بات نہیں کروں گا۔ یہ ملے جلے اور ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پسندیدہ ناپسندیدہ۔ ان کی خیر ہے۔ یہ انسانی خوبصورتی اور بدصورتی ہے۔ ادیب

عام لوگ نہیں ہوتے، کوئی بھی تخلیق کار چاہے وہ موسیقار ہو، یا مصور یا کچھ بھی اور، وہ عام انسان نہیں ہوتا۔ جہاں تک ادب میں ظاہر ہونے والے رویوں کی بات ہے تو ان میں کچھ بڑی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آتی۔

س کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ادیب کے برعکس گلوکاروں اور اداکاروں کو زیادہ پذیرائی ملتی ہے؟

ج ایسا ہمیشہ سے ہے۔ گانے والے اور اداکار معمولی فن کار نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ فن آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے لیے بھی طویل ریاضت اور تپسیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے ادب لکھنے کے لیے ادیب کو فکر اور قلم کی ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن چوں کہ وہ براہ راست عوام سے جڑے ہوتے ہیں اس لیے ان کی پذیرائی زیادہ ہوتی ہے۔ لکھنے پڑھنے کا رجحان لوگوں میں کبھی بہت زیادہ نہیں ہوا۔ تو اسی لیے لکھنے پڑھنے والوں کی قدر بھی کبھی معاشرے میں بہت زیادہ نہیں رہی۔ لیکن اب خاص طور پر ادب کو یہاں جو نامقبولیت ملی ہے، اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ ادب کے فروغ کے وسیلوں پر پہلے چھلنیاں لگی ہوتی تھیں اور کمزور ادب اور ادیب ان چھلنیوں سے گزر کر آگے نہیں آپاتا تھا۔ لیکن اب ایسی کوئی چھلنی باقی نہیں رہی اور نہ ہی اچھے اور برے ادیب کی پہچان باقی رہی ہے۔

س سرقہ کے بارے آپ کا کیا خیال ہے؟

ج یہ بات بھی ہمیشہ سے موجود رہی ہے کہ ادب میں سرقہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ سرقہ، نقل اور اخذ کرنے اور متاثر ہو کر لکھنے میں بہت فرق ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کچھ پڑھتے ہوئے آپ کو کوئی خیال سوجھتا ہے۔ لیکن اگر آپ دوسرے کے خیال کو اپنے نام کے ساتھ بیان کرتے ہیں، تو یہ زیادتی ہے۔ سرقہ شاید یہ ہوگا کہ آپ کسی شے کو من وعن نقل کر دیں لیکن نام اس پر اپنا دیں۔ خیر یہ باتیں اب پہلے جتنی نہیں رہی ہیں۔ گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے اور ایسے سافٹ ویئر بڑی تعداد میں سامنے آئے ہیں

جو سرقہ وغیرہ کو پکڑ لیتے ہیں۔ لوگ بھی عالمی ادب سے زیادہ آگاہ ہو گئے ہیں۔ تو سرقے والی بات پہلے کی طرح اب چھپی نہیں رہ سکتی۔ پھر بھی آپ چاہے سرقہ کریں، لیکن لکھیں ضرور۔ لکھنے سے لکھنا آہی جاتا ہے۔

س آپ کی کہانیوں کے خاص موضوعات کیا ہیں؟

ج میرے خاص موضوعات نہیں ہیں۔ میرے لیے زیادہ اہم کردار ہوتے ہیں، اور ان کی زندگیاں جب کہ ہر کردار کے ساتھ بھی موضوعات جڑے ہوتے ہیں۔ میرے ناولوں میں اور کہانیوں میں اسرار ہے، اور زندگی کے عجب کو دریافت کرنے کی کوشش ہے جو زندگی کا حصہ ہوتا ہے لیکن وہ اس کے معمول میں شامل ہو کر اوٹ میں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو شے بھی کرداروں میں یا جگہوں میں عجیب ہے، مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ میں نے سادہ حقیقت نگاری اور تحیر آمیزی اور طلسماتی حقیقت نگاری کے عناصر کو آپس میں ملانے کی کوشش کی ہے۔ میرے تینوں ناول ایسے تجربات سے بھرے ہوئے ہیں۔

س کیا مستقبل میں مزید ناول لکھنے کا ارادہ ہے؟

ج مستقبل میں مزید ناول لکھنے کا ارادہ ہے۔ خواہش ہے کہ جب تک زندہ رہوں لکھتا رہوں اور اچھا لکھوں، یاد رہ جاؤں۔

ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر

س اپنے شہر، بچپن اور ابتدائی تعلیم سے متعلق کچھ بتائیں۔

ج ضلع جھنگ کے ایک دور افتادہ دیہات میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ پرائمری سکول کوٹ مرزا میں حاصل کی۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول شورکوٹ سے کیا۔ باقی تعلیم جھنگ، فیصل آباد، اسلام آباد اور ملتان کے تعلیمی اداروں سے حاصل کی۔ پوسٹ ڈاکٹریٹ کے لیے ہائیڈل برگ جرمنی گیا۔ بچپن مختلف اوقات میں مختلف طرح سے یاد آتا ہے۔ ان دنوں وہ سب کھلی فضائیں شدت سے یاد آتی ہیں، جو شہر میں آنے کے بعد دیکھنے کو کم کم ملتی ہیں۔ گھر کا صحن وسیع، کچا اور درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ سکول میں بھی کھلی جگہ، کسی درخت بلکہ درختوں کے نیچے زیادہ دیر بیٹھتے تھے۔ کھیلنے کے لیے میدان کا تصور ہی نہیں تھا۔ ہم خود کسی خالی جگہ کو اپنی مرضی سے میدان بنا لیتے تھے۔ تب گرمیوں میں خصوصاً رات دیر تک ہم کھیلتے رہتے تھے۔ عمر کے پہلے سولہ سترہ برس کمروں سے زیادہ کھلی جگہوں پر بسر ہوئے۔ ایف۔ ایس سی تک پڑھنے کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔ تب چند گنے چنے طالب علم ہی شام کو ٹیوشن پڑھتے تھے۔ میں ان چند طالب علموں میں شامل نہیں تھا۔

س آپ کے والدین نے آپ کی ذات سے متعلق کیا سپنے دیکھے تھے کہ ہمارا بیٹا کتنا تعلیم یافتہ ہو اور کیا بنے؟

ج والد صاحب کو اکثر یاد ہی نہیں ہوتا تھا کہ میں کس کلاس میں ہوں۔ کبھی کبھی کہتے تھے کہ مجھے پائلٹ بننا چاہیے۔ مجھے یاد ہے، جب چھٹی میں تھا تو پائلٹ بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ ایک وجہ تو والد صاحب کی خواہش تھی، دوسری وجہ زمین پر کھلی جگہ کا جو تجربہ تھا،

اسے ہواؤں میں اڑ کر مزید وسعت سے ہم کنار کرنے کی ہوگی۔ ایک مرتبہ آئی ایس ایس بی کا پانچ روزہ امتحان بھی دیا۔ وہیں میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے پائلٹ نہیں بننا ہے۔ جس نظم وضبط کی پابندی ان پانچ دنوں میں کی، اس سے مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ پھر والد صاحب کی خواہش ہوئی کہ مجھے انجینئر بننا چاہیے۔ اس لیے ایف ایس سی میں ریاضی کا مضمون لیا۔ اسی دوران میں مجھے لکھنے کا تھوڑا بہت شوق ہوا تو انجینئر بننے کی خواہش بھی متاثر ہوئی۔ اسی دوران میں ایک خاص واقعہ ہوا۔ میرے ہاتھ لین یوتانگ کی کتاب 'جینے کی اہمیت' لگی۔ اسے پڑھا تو ایک خاموش سا انقلاب اندر رونما ہوا۔ تب میری عمر اٹھارہ برس ہوگی۔ ہر نوجوان کی مانند میرے سر پر بھی مستقبل سوار رہتا تھا جس کا مطلب بڑا آدمی بننا تھا۔ تب بھی ڈاکٹر، انجینئر بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے۔ جب یہ کتاب پڑھی تو بڑے آدمی کا یہ تصور میرے ذہن سے جیسے رخصت ہوگیا۔ اصل چیز جینے کا ایک ایسا ڈھنگ دریافت کرنا تھا، جس سے حقیقی خوشی ملے اور وہ دیرپا ہو۔ خواہ اسے دوسروں کی تائید حاصل نہ ہو۔ اس کے بعد میں نے سارے کام.... شادی سے تعلیم اور لکھنے پڑھنے تک اپنی مرضی سے کیے ہیں۔ والد صاحب نے بھی بالآخر یہ سب قبول کر لیا۔ اگر کسی ہستی نے مجھے ہر لمحے ہمت دی اور میرے ہر فیصلے کی دل وجان سے تائید کی تو وہ میری والدہ صاحبہ تھیں اور ان کے بعد میری بڑی بہن۔

س آپ کیا بننا چاہتے تھے ڈاکٹر، انجینئر یا استاد؟

ج آدھا جواب تو اوپر دے چکا ہوں۔ سچ بات یہ ہے کہ ایم اے اردو میں داخلے کے وقت تک مجھے واضح نہیں تھا کہ مجھے استاد بننا ہے یا نہیں۔ ایف ایس سی سے ایم اے تک کا زمانہ میرے لیے کچھ نجی بحرانوں کا زمانہ تھا۔ میں کئی چیزوں سے کئی محاذوں پر داخلی سطح پر جھگڑ رہا تھا۔ خیر، جب میں نے پہلی مرتبہ ایبٹ آباد میں پڑھانا شروع کیا تو مجھے لگا کہ تقدیر مجھے جس شعبے میں لے آئی ہے، میرے لیے سب سے موزوں یہی شعبہ ہے۔ میں اس کے لیے موزوں ثابت ہوا ہوں یا نہیں، اس کا جواب طالب علم ہی دے سکتے ہیں۔

س لاہور کب آنا ہوا؟ کون سی یونیورسٹی میں داخلہ لیا؟ ایم فل اور پی ایچ ڈی سے متعلق کچھ بتائیں۔ ان کے موضوعات کیا تھے؟

ج میں نے لاہور سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ ایم اے اردو، گورنمنٹ کالج فیصل آباد (اب یونیورسٹی) سے کیا۔ ایم فل اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے اور پی ایچ ڈی، زکریا یونیورسٹی سے۔ ایم فل کا موضوع ''اردو تنقید میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مباحث'' تھا۔ یہ مقالہ ۲۰۰۵ء میں انجمن ترقی اردو، کراچی سے شایع ہوا، کسی تبدیلی کے بغیر۔ تب میں گورنمنٹ کالج جھنگ میں پڑھا رہا تھا۔ تب میں نہیں جانتا تھا کہ میری زندگی کے آگے کے چند اہم واقعات، اس مقالے سے جڑے تھے۔ جیسے ہی اس مقالے کا زبانی امتحان ہوا۔ اوپن یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے مجھے ڈیپوٹیشن پر شعبے میں بہ طور لیکچرر جوائن کروانے کی پیش کش کی۔ اگلے دو ماہ میں مجھے باقاعدہ خط بھی مل گیا۔ لیکن اسی دوران میں مجھے ایک دن ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کا فون موصول ہوا، جو اس وقت شعبہ اردو، اورینٹل کالج کے صدر تھے۔ وہ اس مقالے کے دوسرے ممتحن تھے۔ انھوں نے نہ صرف اس مقالے کو قبل از اشاعت، اپنے شعبے کے پی ایچ ڈی کے نصاب کی منظور شدہ کتب کی فہرست میں شامل کیا تھا، بلکہ مجھے اورینٹل کالج کے شعبہ اردو کو جوائن کرنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ اس پیش کش کی وجہ سے میں نے اوپن یونیورسٹی جوائن نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ڈاکٹر نثار قریشی صاحب سے ہمیشہ شرمندہ رہا۔ بہ ہر حال میں یکم مارچ ۲۰۰۵ء کو اورینٹل کالج سے وابستہ ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ فراقی صاحب مجھے شعبے میں اس وقت لائے، جب شعبے میں کوئی خالی نشست نہیں تھی اور کسی دوسرے شعبے سے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ میں جن ادبی تصورات کے تحت اس وقت ادبی رسائل میں لکھ رہا تھا، اور جنھیں مبسوط انداز میں اپنے ایم فل کے مقالے میں بھی پیش کیا تھا، وہ فراقی صاحب کے تصورات سے مختلف تھے۔ دوسروں کے تصورات کی قدر دانی کا یہ عالم اب خال خال ہے۔

پی ایچ ڈی کا موضوع ''اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات'' تھا۔ لطف کی بات یہ

ہے کہ اس کے نگران ڈاکٹر انوار احمد تھے جو ترقی پسند نظریے کے حامل ہیں، اور میں اس سے پہلے وزیر آغا صاحب کے رسالہ ''اوراق'' میں مسلسل شایع ہو رہا تھا اور میرے ایم فل کے مقالے کے وہی نگران تھے۔ مجھے مختلف ادبی نظریات کے حامل ادبا کے ساتھ کام کرتے ہوئے سب سے بڑا فائدہ ایک حقیقی علمی رواداری کا مفہوم سمجھنے کی صورت میں ہوا ہے۔ یعنی اپنے تصورات پر قائم رہتے ہوئے، دوسروں کے تصورات کو ان کے اصل سیاق میں سمجھنے کا رویہ۔

س آپ کا رجحان ادب کی طرف ابتدا سے تھا یا تعلیم کے دوران ہوا۔ پہلی بار لکھنے کا خیال کب آیا اور کیا لکھا؟

ج بیشتر لوگوں کے برعکس، مجھے سکول کے زمانے تک محسوس نہیں ہوا کہ میرے اندر لکھنے کی صلاحیت ہے۔ میں نے کالج آنے سے پہلے ادب کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ نہ مجھے کوئی ایسا دوست یا استاد ملا جو نصاب سے ہٹ کر کتابیں پڑھتا ہو۔ گھر میں چند مذہبی کتابوں کے کوئی دوسری کتاب نہیں تھی۔ جب کالج آیا تو لائبریری سے کتابیں حاصل کیں اور انھیں پڑھا۔ ایک کتاب کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ کچھ ناول پڑھے۔ عبداللہ حسین کا اداس نسلیں پڑھا جو اس وقت کچھ خاص پلے نہیں پڑا تھا۔ خدا کی بستی بھی اسی زمانے میں پڑھا، وہ زیادہ دل چسپ لگا۔ کچھ اور کتابیں بھی پڑھیں، لیکن خاصی بے قاعدگی کے ساتھ۔ البتہ اسی زمانے میں کچھ لکھنے لگا تھا۔ ڈائری باقاعدگی سے لکھتا تھا۔ میرا خیال ہے، ڈائری لکھنے کے دوران میں ہی، میں نے لکھنے کی شفا بخش طاقت کو محسوس کیا۔ کچھ کہانیاں لکھیں جو اس زمانے کے مقبول عام ڈائجسٹوں میں شایع ہوئیں۔ پھر جب ایم اے اردو میں آیا تو صحیح معنوں میں پڑھنا شروع کیا۔ کئی درجن اردو اور انگریزی کتابیں میں نے ان دو سالوں میں پڑھیں۔ کچھ مکمل اور کچھ نامکمل۔ ایم اے میں ہی تھا کہ امروز کے ادبی صفحے پر (جسے اس زمانے میں اظہر جاوید مرتب کرتے تھے) کئی مضامین شایع ہوئے۔ اوراق اور دیگر رسائل میں بھی اسی زمانے میں انشائیے اور مضامین شایع ہوئے۔ کہانیاں لکھنا بند کر دیں کہ میرے ایک محترم استاد نے ایک

ڈائجسٹ میں میری کہانی پڑھ کر کہا کہ کچھ سنجیدہ لکھا کروں۔

س آپ نے اب تک کن اصناف میں لکھا ہے اور آپ کی کتنی کتب شائع ہو چکی ہیں؟

ج تنقید کی چودہ کتابیں ہیں، پانچ مرتبہ کتب ہیں، تین افسانوں کے مجموعے ہیں، ایک انشائیوں کی کتاب ہے، ایک ڈائری ہے، ایک ترجمہ ہے۔ یعنی کوئی پچیس کتب۔ ان کے علاوہ انگریزی مضامین کی خاصی تعداد ہیں جن میں زیادہ تر دی نیوز میں اور چند ڈان میں چھپے ہیں۔ کچھ اردو مختصر تحریریں بھی ہیں جن میں سے زیادہ ''ہم سب'' پر شائع ہوئی ہیں۔

ان اصناف میں چھپنے والی بے شمار کتب میں آپ کی کتب کی انفرادیت کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ان کتابوں کا قاری ہی دے سکتا ہے۔

س آپ اپنی تخلیق کا بنیادی حوالہ تنقید کو سمجھتے ہیں یا افسانے کو؟

ج اس سوال کے جواب میں بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آج تک کوئی تحریر نیم دلی سے نہیں لکھی ۔ مجھے تنقید لکھنا اتنا ہی پسند ہے جتنا فکشن لکھنا۔ دونوں ہی کم از کم میرے لیے بنیادی حیثیت کی حامل اصناف ہیں۔ میں ان دونوں میں فرق کرتا ہوں، مگر ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا، نہ ان کا مقابلہ وموازنہ کرتا ہوں۔ جو لوگ تنقید کو کم تر اور شاعری وفکشن کو برتر سمجھتے ہیں، وہ ایک بنیادی مغالطے کا شکار ہوتے ہیں۔ تنقید بڑی حد تک تعقلی سرگرمی ہے، جب کہ فکشن تخیلی۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، مگر ایک دوسرے کی حریف نہیں ہیں۔ انھیں حریف سمجھنا اور ایک کے پیمانے سے دوسری کا محاکمہ کرنا مغالطہ ہے۔

س کہا جاتا ہے کہ آپ مشکل پسند مزاج رکھتے ہیں اور آپ کی نثر کو سمجھنا آسان نہیں۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

ج یہ بات اکثر کہی جاتی ہے۔ میں سنتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں۔ ایک تو اس لیے کہ ہماری تحریروں پر رائے دینا، پڑھنے والوں کا حق ہے۔ اس حق کا احترام کیا جانا چاہیے۔ دوسرا اس لیے کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ تحریر کو خود اپنا دفاع کرنا چاہیے۔ مصنف

کو نہیں۔ بہ ظاہر یہ مبہم سی بات ہے کہ تحریر اپنا دفاع خود کرے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تحریر اپنا دفاع نہ کر سکے تو وہ فطرت کی ان انواع کی مانند فنا ہو جاتی ہے جو ماحول کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنا دفاعی نظام مضبوط نہ بنا سکیں۔ ہر نئی کتاب، کتابوں سے مرتب ہونے والی اکالوجی میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر کوئی کتاب اپنی اشاعت کے سالوں بعد بھی پڑھی جا رہی ہو، اس کے حوالے دیے جا رہے ہوں تو سمجھیے، اس نے اپنی جگہ بنالی ہے، اور فنا کے خطرے سے محفوظ ہو گئی ہے۔ اس طرح کوئی مصنف اپنی کتابوں کا دفاع کر ہی نہیں سکتا۔ باقی جہاں تک مشکل پسند ہونے کا تعلق ہے تو میری نظر میں سادہ پسند یا مشکل پسند دونوں اضافی ہیں۔ ایک کے لیے جو کتاب مشکل ہے، کسی دوسرے کے لیے نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی مصنف یہ سوچ کر لکھتا ہے کہ اسے سادہ و آسان لکھنا ہے یا مشکل (جو یہ سوچ کر لکھتے ہیں انھیں محرر کہنا چاہیے)۔ لکھنا، ایک بڑی ذمہ داری اور دیانت داری کا کام ہے، اپنے خیالات، تجربات یا تصورات کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنا، خوف، مصلحت کو بالائے طاق رکھنا، مقبولیت و عدم مقبولیت کی ترغیب سے اپنے قلم کو محفوظ رکھنا ہی ذمہ داری اور دیانت داری ہے۔ کچھ لوگ موضوع، مسئلے، تجربے یا احساس کو سرسری لیتے ہیں، کچھ بہت سنجیدگی، گہرائی سے لیتے ہیں۔ کچھ کے لیے یہ دنیا اور اس کے ساتھ آدمی کا تعلق سیدھا سادہ، فوری سمجھ میں آنے والا اور سادہ، رائج زبان میں بیان کیے جانے کے قابل ہے، جب کہ کچھ دوسروں کے لیے یہ دنیا اتنی ہی گہری اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہے جتنا اسے سمجھتے ہیں، اور اس دنیا سے آدمی کا حقیقی، حسی تعلق یا نظری و تخیلی رشتہ ہر روز ایک نئے اسرار کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، لہٰذا وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں رائج، سادہ، مقبول عام لفظیات ہوتی ہیں نہ دل میں فوری اتر جانے والا اسلوب ہوتا ہے۔ وہ کسی کو متاثر کرنے کی خاطر نہیں لکھتے، ان کے لیے لکھنا اپنے اور اپنے ہم نفسوں کے فہم کے آفاق کو مسلسل وسیع کرنا ہوتا ہے، انھیں کاہلی، بے خبری، روٹین کی زندگی سے ایک جھٹکے سے جگانا ہوتا ہے اور اب تک کے علم و تجربے و تصور پر نظر ثانی کی تحریک دینا ہوتا ہے۔ روزمرہ کی باتیں جنھیں ہم پہلے ہی جانتے ہیں، انھیں ایک نئے، دل چسپ

اسلوب میں لکھنے سے آدمی شاید مقبول ہو جاتا ہے، مگر وہ اپنی ذہنی دنیا کو وسیع کر پاتا ہے، نہ قارئین کی دنیا کو۔ اب ظاہر ہے اگر کسی کو واقعی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے فہم واحساس کی حدوں کو وسیع کرے، جن حدوں میں وہ اب تک سوچتا اور جیتا آیا ہے، ان کی اصل کے بارے میں جانے تو پھر اسے تھوڑا مشکل پسند ہی نہیں جرأت مند بھی ہونا پڑے گا۔ چناں چہ سادہ و مشکل پسند ہونے کا تعلق آدمی کے پرسپشن اور اس سے دیانت داری برتنے سے ہے۔

س بطور استاد آپ کا تجربہ کیسا ہے؟ مستقبل میں اردو زبان کی ترویج اور فروغ کے کیا امکانات ہیں؟

ج سوال کے پہلے حصے کا جواب تو اوپر دے چکا ہوں۔ دیکھیے، اردو کو بہ طور زبان عالمگیریت کے اس عہد میں بقا کا خطرہ تو لاحق بالکل نہیں۔ اس وقت اردو زبان کے دو بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے، ایک تو اسے بہ طور قومی زبان کے رائج کرنے کا چیلنج، دوسرا اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا چیلنج۔ کم از کم میں مایوس ہوں کہ اردو کو مستقبل قریب میں سرکاری، دفتری زبان بنایا جائے گا اور تمام علوم کی تدریس اس زبان میں ہوگی۔ ۱۹۸۸ء سے آئین کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، جس پر سپریم کورٹ کے سابق جسٹس جواد ایس خواجہ کا فیصلہ بھی آچکا ہے، مگر ہماری سب عدالتیں خود بھی اس فیصلے کی پابندی نہیں کرتیں۔ ہمارے سیاست دان، جو اپنا پیغام عوام تک اردو ہی میں پہنچاتے ہیں، وہ اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کے سلسلے میں قطعاً حساس نہیں ہیں۔ بیوروکریسی کی تربیت ہی انگریزی میں، انگریزی نوآبادیاتی ڈھنگ سے ہوتی ہے، لہٰذا ان سے یہ توقع رکھی ہی نہیں جاسکتی کہ وہ انگریزی کی جس معاشی وسماجی طاقت کے ذریعے خود پوزیشن وعہدے کی طاقت حاصل کرتے ہیں، اس سے دست بردار ہوں گے۔ اکیڈمیا بھی اردو کو ابلاغ کی زبان نہیں سمجھتا۔ اسے یہ قائل کرنا بہت مشکل ہے کہ سائنسی علوم اردو میں پڑھائے جاسکتے ہیں۔ عوام بھی انگریزی کے حق میں ہے۔ سب مائیں بچوں سے اردش (یعنی انگریزی اردو کا ملغوبہ) میں بات کرتی ہیں اور اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم

سکولوں میں بھیجنا چاہتی ہیں۔ اردو ادیبوں اور اساتذہ کے بچے شاید ہی اردو میں ڈگری لینا چاہتے ہوں۔ آزادی کے بعد انگریزی کا کردار محدود ہونا اور پاکستانی زبانوں کا کردار وسیع ہونا چاہیے تھا، لیکن یہ اسی صورت میں ہوتا اگر ماضی کے فیصلہ سازوں نے پاکستان کی تعمیر کا عمل 'ڈی کولونائزیشن' سے شروع کیا ہوتا۔ گڑ بڑ یہ ہوئی کہ ہم نے پاکستان کا قیام کا جو بیانیہ اختیار کیا، اس میں ہندوؤں کے اجارے سے آزادی کا تصور شامل کر لیا۔ حالاں کہ ہم نے آزادی برطانوی استعمار سے حاصل کی تھی۔ اپنے نصابات میں جس تاریخ کو مسلسل شامل کیا گیا ہے، اس میں کہیں بھی برطانوی استعمار اور اس کے معاشی، سماجی، ثقافتی، لسانی استحصال کی طرف اشارہ تک نہیں ہوتا۔ ردنو آبادیاتی رویے کے نہ ہونے کے سبب ہی انگریزی کی سیاسی، سماجی و معاشی طاقت میں مسلسل اضافہ ہوا ہے اور سب پاکستانی زبانیں اپنی سماجی و سیاسی طاقت سے محروم ہوئی ہیں۔ البتہ اب کچھ کچھ ردنو آبادیاتی خیالات عام ہونے لگے ہیں اور استعماری ماضی سے نجات کی خواہش بھی پیدا ہونے لگی ہے، یعنی اپنی مقامی زبانوں کی ملکیت کا احساس پیدا ہونے لگا ہے۔ لیکن یہ خیالات فیصلہ سازوں کو بھی متاثر کریں گے اور کب، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

جہاں تک اردو زبان میں در آنے والی تبدیلیوں کے چیلنج کا تعلق ہے، وہ بھی توجہ چاہتا ہے۔ جس اردش کا ذکر اوپر کیا ہے، وہ صرف گھروں ہی میں نہیں، دفتروں، ہوٹلوں، کمرہ ہائے جماعت، عوامی جگہوں اور ٹی وی چینلوں اور سوشل میڈیا پر بھی موجود ہے۔ اردو میں بے تحاشہ انگریزی الفاظ کا استعمال معمول کی بات سمجھا جانے لگا ہے۔ نئی چیزوں اور نئی اصطلاحات کو ان کی اصل زبان میں قبول کرنے میں حرج نہیں، مگر جن چیزوں اور تصورات کے لیے پہلے سے اردو میں الفاظ موجود ہیں، انھیں بے دخل کر کے انگریزی کے الفاظ لانا ایک استعماری رویہ ہے، جسے قبول کرنے کے پیچھے اپنی بے مائیگی کا احساس کام کر رہا ہوتا ہے۔ حالاں کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں دوسری پاکستانی زبانوں کے الفاظ زیادہ شامل ہوں۔

اس سب کے باوجود اردو زبان کی بقا کو خطرہ نہیں۔ اوّل اس لیے کہ چوہتر زبانوں کے اس ملک کے لوگ صرف اردو ہی میں ایک دوسرے سے بات کر سکتے ہیں۔ دوم اس میں مسلسل ادب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ اس کے معیار پر بات ہو سکتی ہے، مگر شاعری، فکشن، نان فکشن بڑی تعداد میں چھپتا اور پڑھا جاتا ہے۔

س ساخت اور پسِ ساختیات کے بارے میں اگر ادب کا عام قاری سمجھنا چاہے تو آپ مختصر الفاظ میں کیا بتائیں گے؟

ج انھیں سمجھنے کا کوئی مختصر، سہل راستہ نہیں۔ نیا علم، نئی اصطلاحیں لے کر آتا ہے۔ جب تک ان اصطلاحوں کو نہیں سمجھا جاتا، تب تک وہ علم یا نظریہ پلے نہیں پڑتا۔ یہ بات صرف ساختیات، پس ساختیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مابعد نو آبادیات یا تانیثیت سے مخصوص نہیں۔ آپ بلاغت کی کتابیں اٹھا کر دیکھیے۔ بیان و بدیع و عروض کے علوم میں کتنی اصطلاحیں ہیں۔ صرف استعارے کے مشرقی مباحث دیکھیے، شعری صنعتوں کی اصطلاحوں پر نظر ڈالیے۔ سنسکرت تنقید میں رس کا نظریہ دیکھیے۔ خود فارسی وارد و تذکروں میں بے شمار اصطلاحیں ہیں۔ جدید تنقیدی نظریات، مثلاً مارکسی، نفسیاتی، ہیئتی تنقید اپنی اصطلاحوں کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہی صورت ساختیات و پس ساختیات اور ان کے بعد کے نظریات کے ساتھ ہے۔ لانگ، پارول، سگنی فائر، سگنی فائیڈ جیسی بنیادی اصطلاحوں کے بغیر یہ نہیں سمجھے جا سکتے، نہ سمجھائے جا سکتے ہیں۔ البتہ مختصراً کہہ سکتا ہوں کہ یہ تنقیدی طرز مطالعات، ادب کو کسی خارجی، معروضی حقیقت کے عکاس کے بجائے، زبان میں لکھی گئی حقیقت سمجھتے ہیں۔ گویا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ زبان کوئی شفاف میڈیم نہیں، جس کے آر پار دیکھا جا سکے، زبان حقیقت کی تشکیل کے عمل میں مداخلت کرتی ہے، ثالث کا کردار ادا کرتی ہے، فرد کے منشا کو حاوی ہو جاتی ہے، فرد کے لاشعور کی تعمیر کرتی ہے۔ زبان انسان نے ایجاد کی، مگر جس طرح باقی انسانی ایجادات بالآخر آدمی پر حاوی ہو جاتی ہیں، اسی طرح زبان بھی انسان پر حاوی ہو گئی ہے۔ اس نے انسان کے گرد ایک لسانی فصیل کھڑی کی ہے، اسی کے اندر، اس کی طے کی

گئی حدوں کے اندر انسان خود کو اور دنیا کو سمجھتا ہے۔ یہ میں نے بالکل ایک سادہ سی بات کہی ہے، اس کے خاصے گہرے فلسفیانہ، نفسیاتی اور ثقافتی مضمرات ہیں، جن کی تفصیل کتابوں ہی سے مل سکتی ہے۔

س آپ نے حکومت پاکستان کی طرف سے باہر کے ممالک کے سفر کیے۔ کانفرنسوں میں شرکت کی۔ تعلیم حاصل کی۔ ان سب کے بارے میں اپنے تجربات قارئین سے شیئر کریں۔ اس سے کیا حاصل ہوا اور آپ نے کیا ڈلیور کیا؟

ج میں زیادہ سفر نہیں کرتا۔ طبیعت کے اعتبار سے سفر گریز ہوں۔ مگر آٹھ دس ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہر ملک کا سفر ایک بالکل مختلف تجربہ تھا۔ مجھے ملکوں سے زیادہ وہاں کے کچھ شہر اچھے لگے۔ ہائیڈل برگ، استنبول اور اصفہان مجھے بہت پسند آئے۔ ڈلیور تو میں نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ سیکھا اور سمجھا ضرور ہے اور یہی حاصل ہے ان اسفار کا۔ جرمنی کے قیام کے تجربات کو تفصیل سے اپنی کتاب ہائیڈل برگ کی ڈائری میں محفوظ کیا ہے۔ مغربی ملکوں نے قانون کی حکمرانی کو یقینی بنایا ہے اور علم کی مسلسل تخلیق کو اپنی بنیادی ذمہ داری تصور کیا ہے۔ وہاں معمول سے ہٹ کر ہونے والا کوئی واقعہ یا مشاہدہ انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اسے پوری طرح اور ہر زاویے سے سمجھیں، جس کے باعث وہاں ہر طرح کے سنجیدہ مباحث ہوتے ہیں اور لگاتار ہوتے ہیں اور پوری ذمہ داری سے ہوتے ہیں۔ ہم بڑے بڑے واقعات پر مٹی ڈالنے کا عمومی رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس کا اثر نہ صرف ہمارے علم کی تخلیق پر ہوتا ہے، بلکہ ہمارے ادب میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ہم نے طنز، تضحیک، حقارت، نفرت کے متشددانہ رویوں کو فروغ دیا ہے۔ سمجھنے کی عادت سے زیادہ محاکمہ پسندی کو رواج دیا ہے۔ لوگوں میں تنقیدی فکر اور تخلیقی انداز میں چیزوں کو سمجھنے کا ملکہ خال خال اور خیالات کو عقیدوں میں بدل کر، اپنے مخالفین کی فہرست بنانا اور پھر انھیں انجام تک پہنچانے کا رویہ پروان چڑھایا ہے۔ آپ کسی بڑی سرکاری یونیورسٹی میں ہونے والی کانفرنس کی کارروائی دیکھیں، شاید ہی کوئی مقرر بنیادی، اوریجنل بات کہے۔ سب پرانی باتیں دہراتے ہیں یا واقعات ولطائف سنا

کر سامعین سے داد وصول کرتے ہیں۔ یہ بات ان ملکوں میں تصور بھی نہیں کی جاسکتی جنھیں برا بھلا کہنے میں ہم دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔

س تنقید ادب کے لیے کس قدر اہم ہے؟

ج تنقید ادب ہی کے لیے نہیں ادیب، قاری، سماج سب کے لیے بے حد اہم ہے۔ اکثر ادیب فرماتے ہیں کہ انھیں تنقیدی نظریات کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہوتا ہے کہ وہ تو براہ راست رحمان کے شاگرد یعنی تلمیذ الرحمٰن ہیں، اس لیے انھی کسی بندے بشر کی لکھی ہوئی تنقید کیا فائدہ دے سکتی ہے۔ یہ لوگ عمومی طور پر کسی بھی طرح کا مطالعہ کرنا پسند نہیں کرتے، مطالعے کو وہ اپنی اور جینیئٹی کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ یہ دراصل اپنی کاہلی کا جواز گھڑنا ہے۔ آپ رومی، حافظ، فردوسی، کالی داس ورجل، کبیر، غالب، اقبال، بلھے شاہ، بھٹائی سے لے کر ملٹن، ڈانٹے، شیکسپیئر، گوئٹے، بادلیئر، ایلیٹ، بورخیس، مارکیز، کنڈیرا، چنوا چیبے، ناظم حکمت، نرودا، سارتر، کامیو، کافکا دنیا کے کسی بڑے ادیب وشاعر کو دیکھیں وہ سب اپنے زمانے کے بیشتر علوم کے فاضل تھے۔ بیشتر نے خود بھی تنقیدی تحریریں لکھیں۔ تنقید ایک سرگرمی کے طور پر عقلی ہے، محدود سطح پر اس کا مطالعہ فنی اصولوں سے روشناس کراتا ہے، مگر بڑی سطح پر آپ کے تخیل میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ تخیل ایک ذہنی صلاحیت ہے، جس کی اساس مادی و سماجی ہے۔ مطالعے کی وسعت اس کی اساس میں گہرائی اور اس کی ساخت میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح ادب کے قارئین کے یہاں تنقید کے مطالعے سے، ادب کو وسیع تاریخی، نفسیاتی، ثقافتی تناظر میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ قارئین کا ایک گروہ ادب کو محض مسرت کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ تسلیم کہ یہ مسرت بہت اہم ہے، کیوں کہ یہ بے غرض اور بے لوث ہے، اور ہمیں انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے لیے آرٹ سے ملنے والی مسرت کی از حد ضرورت ہے مگر ادب کو محض اس مسرت تک محدود کرنا، ادب کے سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی کردار کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ اچھی تنقید ادب کے کردار کا وسیع تصور دیتی ہے۔ اچھے، کم اچھے، بہت اچھے اور بہترین ادب کے معیارات وضع

کرتی ہے، اورانھیں دلائل سے واضح کرتی ہے۔ نیز ادب میں ان کہی، استعارے اور سمبل ہوتے ہیں، جنھیں تنقید کے بغیر واضح کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اوران کا غیر واضح رہنا ایسا ہی ہے جیسے آپ کے گھر میں خزانہ ہو مگر آپ اس سے آگاہ نہ ہوں۔ ادب اپنی خاموشی وان کہی اوراپنے سمبل کی مدد سے انسانی ہستی، سماج، تاریخ، عصر کے بارے میں ایک ایسی بصیرت پیش کرتا ہے جو تاریخ، فلسفے، نفسیات کی کتابوں میں بھی نہیں ملتی۔ اس بصیرت کو تنقید نہ صرف واضح کرتی ہے، بلکہ اس کی اہمیت ومعنویت بھی سامنے لاتی ہے اور کبھی اس بصیرت کو چیلنج بھی کرتی ہے۔ یہ بات تخلیق کاروں اوران کے مداحوں کو ناگوار گزرتی ہے اور وہ تنقید کو اس مکھی سے تشبیہ دیتے ہیں جو گھوڑے کو پریشان کرتی ہے۔ گھوڑا اسی زمین کی مخلوق ہے، اسے ماننے میں کیا حرج ہے کہ اس سے بھی خطا ہو سکتی ہے، اور کوئی اس خطا پر گرفت کر سکتا ہے۔

س افسانے کا مستقبل کیا ہے؟

ج مستقبل کا جواب تو کوئی نجومی ہی دے سکتا ہے۔ جہاں تک معاصر افسانے کی صورتِ حال کا تعلق ہے تو اس ضمن میں عرض ہے کہ وہ بس اطمینان بخش ہے، اس معنی میں کہ نئی اوراس سے پہلے کی کم ازکم دو پیڑھیوں کے لوگ مسلسل لکھ رہے ہیں۔ نئی پیڑھی جس نے اکیسویں صدی میں لکھنا شروع کیا ہے، یا کچھ اس سے پہلے، وہ جدیدیوں اور ترقی پسندوں دونوں سے مختلف ہے۔ نہ صرف موضوعات کے انتخاب میں، بلکہ بیانیہ انداز، بیان کنندہ کے انتخاب کے سلسلے میں بھی۔ ایک اور خاص بات اس افسانے میں یہ ہے کہ اسے اپنے افسانوی عمل کا شعور ہے جسے اصطلاح میں self-relexivity کہا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ اسے مابعد جدید کہنے سے کتراتے ہیں، مگر وہ اس 'مختلف افسانے' کا کوئی دوسرا نام بھی تجویز نہیں کرتے۔

س اردو سائنس بورڈ میں بطور ڈی جی اب آپ کیا کام کر رہے ہیں۔ اس ادارے کے اغراض ومقاصد کیا ہیں اوراب تک کیا نمایاں کام ہو چکا ہے اور آپ مستقبل میں کیا کرنے جا رہے ہیں؟

ج اردو سائنس بورڈ کا مینڈیٹ بدلتا رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں جب یہ مرکزی اردو بورڈ کے نام سے قائم ہوا تھا تو اس کے مینڈیٹ میں اُردو میں فطری و سماجی سائنسی کتب نیز تاریخ کی کتب کی اشاعت شامل تھی۔ اسی لیے اس ادارے سے طبیعیات، کیمیا، ریاضی کی اردو کتب کے ساتھ ساتھ لسانیات اور تاریخ کی کتب بھی شائع ہوئیں۔ اس وقت یہ خیال کیا گیا کہ اگر اردو کو واقعی قومی زبان بنانا ہے تو اسے پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی، براہوی اور دیگر پاکستانی زبانوں کے قریب لانا ہے، اسی لیے ان زبانوں کی اردو میں لغات شائع کی گئیں۔ ۱۹۸۲ء میں اسے اردو سائنس بورڈ کا نام دیا گیا تو اس کے مینڈیٹ میں تبدیلی کی گئی۔ اب زیادہ زور سائنسی و ٹیکنیکل کتب کی اردو میں اشاعت پر زور دیا گیا ہے۔ اب تک آٹھ سو سے زائد کتب یہاں سے شائع ہوئی ہیں۔ میں ۲۱ دسمبر ۲۰۱۶ء کو اس سے وابستہ ہوا۔ ان سوا دو سالوں میں ساٹھ کے قریب کتب شائع کی ہیں، جن میں دو تہائی بالکل نئی کتب ہیں۔ کوشش کی ہے کہ اہم سائنسی علوم کی فرہنگیں شائع کی ہیں۔ نوبیل خطبات شائع کیے ہیں۔ پہلی مرتبہ اردو سائنس ایوارڈ جاری کیا۔ دو ایوارڈ دیے جا چکے ہیں۔ مستقل ماہانہ سائنسی لیکچرز شروع کیے۔ چند دن پہلے ہم نے غیر ملکی پودوں کے ملکی ماحولیاتی منطقے پر اثرات کے عنوان سے لیکچر منعقد کیا۔ ہمارے ملک میں ماحولیاتی مسائل سے لاتعلقی اہم ترین مسئلہ ہے۔ حالاں کہ اس کا تعلق ہماری بقا سے ہے۔ ماحولیات کی ہم نے وضاحتی فرہنگ بھی شائع کی ہے۔ اسی طرح پہلی مرتبہ موبائل بک شاپ کا آغاز کیا۔ مجھ سے پہلے دفتر میں کتابوں کا گودام تھا، جس میں آپ داخل نہیں ہو سکتے تھے، اسے ایک خوبصورت کتاب گھر میں تبدیل کیا ہے، جس میں گوشہ مطالعہ بھی قائم کیا ہے۔ اس وقت چھ کتب زیرِ طبع ہیں۔ مستقبل میں ایک سیمینار ہال تعمیر کرنے کا ارادہ ہے، خدا کرے اس میں کامیاب ہوں۔

س پاکستان میں ادب کی ترویج کے لیے جو ادارے قائم ہیں کیا آپ ان کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

ج چند ادارے اچھا کام کر رہے ہیں، کچھ کے کام میں بہتری لانے کی گنجائش موجود

ہے۔سب سے بڑا مسئلہ ان اداروں کے سلسلے میں حکومتوں کی عمومی بے اعتنائی ہے جو تعلیم وفنون سے لاتعلقی کا راست نتیجہ ہے۔

س کیا ہمارے کسی ادبی صنف میں عالمی ادب کے معیار کے مطابق کام ہوا ہے؟

ج پہلی بات یہ ہے کہ عالمی ادب کا معیار ایک تجریدی اصطلاح ہے، ادب کا کوئی کینن ایسا نہیں جسے سب براعظموں کے سب ممالک تسلیم کرتے ہوں۔ ہر ملک کی اپنی تاریخی وثقافتی صورت حال ہے جو اس کے ادب کے کینن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں عالمی معیار کی بازگشت نوآبادیاتی عہد کی یادگار ہے، جب پہلے یورپ اور پھر مغرب کے ادب کو آفاقی و عالمی سمجھا گیا۔ مغربی ادب کو عالمی سمجھے جانے کو افریقی ولاطینی امریکی ادیبوں نے بہ طور خاص چیلنج کیا۔ ہمیں بھی کرنا چاہیے۔ کچھ لوگوں نے کیا بھی ،جیسے انتظار حسین نے۔ ہر ادب اپنی اصل میں مقامی ہوتا ہے، اور اسی کی روشنی میں اس کے معیار کا تعین ہوتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ادب اپنے زمانے کو عبور کر کے اگلے زمانوں میں پڑھا جاتا ہے کہ نہیں۔ اگر عبداللہ حسین کا اداس نسلیں ، قرۃ العین حیدر کا آگ کا دریا، گزشتہ پچاس سال سے زائد سالوں سے مسلسل پڑھے جارہے ہیں تو وہ بڑے ادیب ہیں، منٹو اگر آج بھی پورے جنوبی ایشیا میں شوق سے پڑھا جارہا ہے تو اس کے بڑے ہونے میں بھی کوئی شک نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ انھیں روسی ، انگریزی، جرمن، فرنچ، لاطینی امریکی اور افریقی فکشن نگاروں کے مقابل رکھ کر پڑھا جائے۔ یہی صورت انتظار حسین، نیر مسعود، اسد محمد خاں، میر، غالب، اقبال، راشد، مجید امجد اور فیض کے ساتھ ہے۔ یہ سب ہمارے یہاں مسلسل پڑھے جارہے ہیں۔ اگر ان کے واقعی اچھے انگریزی، جرمن، فرنچ اور لاطینی امریکی وافریقی زبانوں میں تراجم ہوں تو یقین کیا جانا چاہیے کہ وہ پسند کیے جائیں گے۔ اگرچہ دنیا کے مختلف ملکوں میں جنوبی ایشیائی مطالعات کے مراکز میں اردو کے کئی ادیب نصاب کا حصہ ہیں، مگر وہاں انھیں خالص عملی ضرورت کے تحت چند خاص طالب علم ہی پڑھتے ہیں، ادب کا عام ذوق رکھنے والے لوگ نہیں۔

س کتاب کا مستقبل کیا ہے؟

ج اگرچہ اس کا جواب بھی کوئی ماہر علم نجوم ہی دے سکتا ہے، میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کتاب کی موت کا خوف بے بنیاد ہے۔ کتاب تب سے ہے جب سے تحریر وجود میں آئی۔ پہلے یہ غاروں کی دیوار پر، درختوں کی چھال، چمڑے، مٹی کی الواح پر لکھی جاتی تھی، پھر کاغذ کی ایجاد سے اس پر منتقل ہوئی، اب رفتہ رفتہ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی پر منتقل ہورہی ہے۔ اس سے یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں کاغذ پر شایع ہونے والی کتاب باقی نہ رہے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ ہر نئی ٹیکنالوجی پرانی ٹیکنالوجی کو مات دیتی ہے، پرانی ٹیکنالوجی سے ہماری جذباتی وابستگی نئی ٹیکنالوجی کے غلبے کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی۔ کاغذ پر شایع ہونے والی کتاب پڑھنے کا تجربہ البتہ ایسا ہے جو ڈیجیٹل کتاب کی راہ میں حائل ہوسکتا ہے، مگر کب تک، یہ کہنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے آنے والی نسل کو کاغذ پر چھپنے والی کتاب پر بھی اتنی ہی حیرت زدہ ہو، جتنی حیرت ہمیں پرانی الواح پر لکھی جانے کتابوں کو عجائب گھروں میں دیکھ کر ہوتی ہے۔

س ایک اچھے ادیب کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

ج صرف لکھنا، آزادی، بے خوفی اور دیانت داری کے ساتھ لکھنا۔ مصلحت، ترغیب، مقبولیت کی آرزو پر قابو پا کر لکھنا۔ ان نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی فصیلوں کو منہدم کر کے لکھنا جو اس کے تخلیقی سیلف کو پابند کرنے کے لیے مقتدرہ کی طرف سے اٹھائی جاتی ہے۔

نذیر قیصر

س اپنی ابتدائی زندگی، بچپن اور تعلیم سے متعلق بتائیے۔

ج میری ابتدائی زندگی ۱۹۴۵ء کا زمانہ دریائے جہلم کے کنارے گزرا۔ اس زمانے میں ہمارے دریا صاف شفاف دھوپ میں چاندی جیسے چمکتے ہوئے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ دریا کے کنارے پر چھاؤں میں ہمارا گھر بنگلہ نمبر ۹۔ گھر کیا تھا بس ایک باغ تھا جس میں مالٹے آم سے لے کر فالسے اور لیچی تک کے درخت پھلوں سے لدے رہتے تھے اور پھولوں میں گلاب، چنبیلی کے ساتھ نرگس کے پھولوں کی کیاریاں لمبی لمبی پیازی ٹہنیوں اور سفید پنکھڑیوں میں پیلی پیلی سی آنکھ کی پتلیوں جیسے طلسمی پھول دور تک دکھائی دیتے تھے۔ دریا کا کنارا پھولوں پھلوں سے بھرا ہوا گھر میرا بچپن تھا اور ہمارے گھر کے ساتھ بنگلہ نمبر ۱۰ تھا جسے کراس کریں تو کمپنی باغ تھا۔ بنگلہ نمبر ۱۰ میں میرے ہم عمر دوست تھے۔ پانی کی چمکتی ہوئی لہروں اور پھولوں پھلوں سے بھری یہ زندگی رفتہ رفتہ ۱۹۴۷ء کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے والد UNO کی امن فورس میں ملازم تھے جس میں چند سفید فام بھی تھے۔ پھر اچانک راولپنڈی کی طرف، گوجر خان، مندرہ وغیرہ کے علاقوں میں فسادات کی لہر اُبھرنے لگی۔ میرے والد ساتھیوں کے ساتھ اس کو روکنے اور انسانی جانوں کو بچانے میں دربدر ہو گئے اور پھر اس خونی لہر کا اثر جہلم میں بھی دکھائی دینے لگا۔ ہمارے گھر کے باہر راتوں کو گولیاں چلنے کی آوازیں آتیں اور صبح سڑکوں پر لاشیں دکھائی دیتیں۔ اندرون شہر گلی کوچوں میں آگ لگنے کی خبریں آتیں۔ میری پیدائش ۵ جنوری ۱۹۴۵ء کو ہوشیار پور (انڈیا) میں ہوئی تھی۔ پیدائش کے دوسرے دن والدہ کا انتقال ہو گیا اور خاندان والوں نے والد پر بڑا

دباؤ ڈالا کہ وہ دوسری شادی کر لیں۔مگر وہ نہ مانے اور مجھے لے کر جہلم چلے آئے جہاں پر ان کے بہت عزیز دوست لالہ اوتار نرائن گجرال رہتے تھے۔لالہ جی کی بیگم نے مجھے گود لے لیا اور میری ابتدائی پرورش ان کے کچے گھر میں ہوئی۔اوتار نرائن گجرال کے بیٹے اندر کمار گجرال جو انڈیا کے وزیراعظم بھی رہے ان دنوں میں اور میرے عزیز دوست حسن نثار ''جشن غالب'' کے سلسلے میں دہلی گئے تو پھر مجھے معلوم ہوا کہ آج کل انڈیا کے جو وزیراعظم ہیں وہ اوتار نرائن گجرال کے بیٹے ہیں۔ستیہ پال جی نے اندر کمار گجرال سے میری ملاقات کا اہتمام کیا اور وہ مجھ سے مل کر بہت روئے اور مجھے انڈیا کی شہریت دینے کی پیشکش بھی کی۔ ستیہ پال جی اور امرتا پریتم نے اس پیش کش کو فوراً قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔مگر اپنا ملک اپنے دوست اپنے عزیز کہاں چھوڑے جاتے ہیں۔میں نے کہا کہ ہم تو جس کرائے کے گھر میں رہیں اس کے در و دیوار سے بھی عشق ہو جاتا ہے۔یہ تو ایک ملک ہے۔ایک دنیا ہے ایک جہان ہے جو ہمارے اندر بھی آباد ہے۔جہلم کے بعد لاہور اور پھر ملتان اور پھر ۱۹۶۲ء میں دوبارہ لاہور آ کر ایسے آباد ہوئے کہ پیوند لاہور ہو کر رہ گئے۔اب اسی خاک میں میرے والد کی قبر بھی ہے جو بے نشان ہو کر سارے لاہور بلکہ سارے پاکستان کی مٹی میں شامل ہو چکی ہے۔انڈیا کے علاوہ ۱۹۷۰ء کے زمانے میں مجھے امریکہ کیلئے فورنیا میں برکلے یونیورسٹی سے بھی استاد کی حیثیت سے آفر تھی۔میری کولیگ عذرا وقار چلی گئیں مگر میرا دل نہیں مانا۔ میں اپنے ملک میں کرائے کے گھر میں رہتا ہوں مگر باقاعدہ کوئی سلسلہ روزگار نہیں ہے۔مگر میں بڑے بڑے ایوانوں والے خوشحال لوگوں سے زیادہ خوش اور زیادہ پرسکون ہوں کہ میرا رشتہ آج بھی اپنی زمین کے پھولوں اور پھلوں سے بھری ہوئی کائنات سے جڑا ہوا ہے کہ جس کے سارے رنگ اور ساری خوشبوئیں میری شاعری کی طرح مجھ میں مجسم ہیں۔

س شاعری کا چراغ سینے میں کب روشن ہوا؟

ج میری شاعری کی ابتدا تو اسی دن ہوئی تھی جس دن دریا اور باغوں سے میرا تعارف ہوا تھا۔میں ان کے ساتھ چلتا پھرتا کچھ گنگنایا کرتا تھا۔گھر کی دیواروں پر کچھ لکھا کرتا تھا

وہی میری ابتدائی شاعری تھی۔ مگر رسمی طور پر میرے لکھنے کا آغاز ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ ان دنوں میں ملتان میں تھا۔ وہاں کی شعری فضا بہت اچھی تھی۔ عرش صدیقی، ضیا صدیقی، ارشد ملتانی، عاصی کرنالی، حزیں صدیقی، سینئر شعرا میں بہت متحرک تھے اور میرے ہم عصروں میں اسلم انصاری، سحر رومانی، اقبال رشد وغیرہ تھے۔ بڑا اچھا ماحول تھا۔ اس زمانے میں طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مگر میں اس ماحول سے بہت جلد نکل گیا اور لاہور سے اپنا قلمی رشتہ جوڑ لیا اور میری غزلیں" فنون، نقوش، ادب لطیف، لیل ونہار اور قندیل وغیرہ میں شائع ہونے لگیں اور پھر ۱۹۶۲ء میں ہم لاہور آ گئے۔ جہاں ناصر کاظمی، حبیب جالب سے ملتان کے زمانے میں ہی دوستی ہو چکی تھی اور پھر لاہور کی ابتدائی زندگی میں فیض صاحب، کشور ناہید، صوفی تبسم اور احمد ندیم قاسمی نے بہت ساتھ اور حوصلہ دیا۔ ناصر کاظمی، منیر نیازی اور شہزاد احمد نوخیز دوست جن کی محبتیں اور رفاقتیں زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ ظفر اقبال ان دنوں اوکاڑہ میں ہوتے تھے مگر تبھی بھی لاہور آنے پر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ وہ آج بھی ہمارے ساتھ ہیں خدا انہیں سلامت رکھے۔ ۱۹۶۸ء میں میرا پہلا مجموعہ کلام ''آنکھیں چہرہ ہاتھ'' شائع ہوا تو مجھے میری توقع سے زیادہ پذیرائی ملی۔ پروین شاکر، ثروت حسین، جمال احسانی ان دنوں سٹوڈنٹ تھے۔ انہوں نے مجھے خطوط لکھے۔ افتخار عارف نے کہا کہ ان دنوں میں نذیر قیصر کی غزلیں رسائل میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا کرتے تھے۔ ثروت حسین نے کہا نذیر قیصر نے تین نسلوں کی آبیاری کی ہے۔ پروین شاکر نے کہا تھا ''آنکھیں چہرہ ہاتھ'' میری پسندیدہ ترین کتاب ہے۔ پروین کی ''خوشبو''، ''آنکھیں چہرہ ہاتھ'' کے تقریباً ۱۲ سال بعد شائع ہوئی۔ ''آنکھیں چہرہ ہاتھ'' پڑھنے کے بعد خوشبو کو پڑھئے تو اس پر آنکھیں چہرہ ہاتھ کے واضح اثرات دکھائی دیں گے۔ آنکھیں چہرہ ہاتھ کے بعد ''گنبد خوف سے بشارت''، ''اے شام ہم سخن ہو''، ''محبت میرا موسم ہے'' تک ۱۳ اُردو شعری مجموعے اور دو پنجابی شاعری کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔

س آپ کو محبت کا شاعر کہا جاتا ہے کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

ج: ہماری تمام اردو شاعری محبت کی شاعری ہے۔ مگر میں اسے محبت کی شاعری نہیں مانتا۔ ''ادب نامے'' میں میرا اور ظفر اقبال کا ایک مکالمہ ہے جس میں میں نے کہا کہ نئی شاعری میں بہت سے نئے لشکارے ہیں۔ مگر موضوعاتی سطح پر یہ شعری تجربہ بھی بہت محدود ہے۔ اس کی فکری سطح کی جہتیں اور وسعتیں بہت کم ہیں۔ فکری سطح پر صرف تین شاعر ہیں جن میں غالب، اقبال اور ن۔م۔راشد کا نام لیا جاسکتا ہے جو محبت کی رسمی شاعری سے الگ کائنات، خدا اور انسان سے مکالمہ کرتے ہیں ظفر اقبال نے کہا کہ میں فکری شاعری کو شاعری نہیں مانتا۔ شاعری تو عورت سے گفتگو کا نام ہے۔ میں نے کہا کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ شاعری عورت سے گفتگو کرنے کا نام ہے تو ابھی تک ہمارے شاعروں نے عورت سے گفتگو کرنا بھی نہیں سیکھا۔ ہمارے اکثر شعرا شہنشاہوں کی طرح عورت کو فتح کرنے نکلے ہوئے ہیں۔ وہ عورت کو بے وفا، ستم گر، قاتل، بہانہ ساز، حیلہ جو، رقیب کے ساتھ جانے والی کے القابات سے پینٹ کرتے۔ ان رنگوں سے عورت کی جو تصویر بنتی ہے اس میں محبت کا رنگ دھیما پڑتے پڑتے گدلا چکا ہے۔ ویسے تو معاشرے کی طرح ہماری تمام شاعری کے خیالات بھی بہنے والے پانی کی طرح کھارے اور مٹیالے ہو چکے ہیں۔ انہیں بھی فلٹر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے محبت کو روایتی معنوں میں لیا ہے۔ محبت کو رسمی معنوں میں لینے کی بجائے ایک قدر کی حیثیت سے اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس لفظ کو لکھنے اور بولنے کے ساتھ صبر کرنا چاہیے۔ جو شاعر اپنے لکھے ہوئے لفظوں کو بسر نہیں کرتا اس کی شاعری تاثیر کی برکت سے خالی رہتی ہے۔ میں نے محبت کے لفظ کو بسر کیا ہے اور شاید اسی لیے لوگ مجھے محبت کا شاعر کہتے ہیں۔

س: جب آپ نے لکھنے کا آغاز کیا تو آپ کے اردگرد کون سے معتبر شعراء تھے۔ آپ کن سے متاثر تھے؟

ج: کچھ سینئر اور ہم عصر شاعروں کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ مگر جن شعراء سے بہت دوستی اور رفاقت رہی وہ ناصر کاظمی، منیر نیازی اور شہزاد احمد تھے۔ کبھی کبھی مجید امجد سے بھی ملاقات

ہو جاتی تھی۔ شاعر بھی ایک عام انسان کی طرح جیتا جاگتا فرد ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے اردگرد سے زیادہ شدت کے ساتھ متاثر ہوتا ہے۔ میں اپنے ان دوست شاعروں سے متاثر تھا اور وہ بھی مجھ سے متاثر تھے۔ سجاد باقر رضوی نے ایک جگہ لکھا تھا کہ نذیر قیصر نے نہ صرف نئی نسل کو متاثر کیا ہے بلکہ اس کے شعری اثرات سینئر شعراء کی تحریروں میں بھی جھلکتے ہیں اور میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں میر کا بھی ہم عصر ہوں اور حسن عباسی کا بھی۔ ہم سب ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ مگر میری زندگی کا رشتہ فطرت سے جس طرح قائم ہوا تھا اُس نے مجھے بہت کچھ دیا۔ ناصر کاظمی نے آنکھیں چہرہ ہاتھ کے فلیپ پر لکھا تھا۔ ''نذیر قیصر کوئی کتابی شاعر نہیں اس کی شاعری کے ماخذ فطرت کی کھلی کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔''

س شاعری کیا ہے؟

ج کسی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اگر آپ شاعر نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟ میں نے جواب دیا کہ اگر شاعری نہ ہوتی تو میں بھی نہ ہوتا۔ حسن نثار نے لکھا ہے کہ اگر شاعری کو مجسم کر دیا جاتا تو وہ نذیر قیصر کی شخصیت ہوتی۔ قرآن مجید میں خدا نے کہا کہ میں نے کائنات اور انسان کو اس لیے تخلیق کیا تاکہ میں پہچانا جاؤں۔ تخلیق آدمی کی پہچان ہوتی ہے لیکن شرط ہے کہ وہ تخلیق ہو۔ شاعری کسی بھی شاعر کی پہچان ہوتی ہے مگر کتنے شاعر ہیں جن کی شاعری ان کی پہچان بن سکی ہے؟ کہیں پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ دعا کیا ہے؟ دعا خدا سے پہلے خود سے ہم کلام ہونا ہے۔ جب آپ خود سے گفتگو کرنا نہیں سیکھ پاتے ہیں اس وقت تک آپ کسی سے ہم کلام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پہلے اپنے آپ کو سنئے جب تمہیں اپنی آواز سنائی دینے لگے گی تو پھر خدا بھی آپ کو سن لے گا۔ شاعری ہم کلامی بھی ہے اور کائنات سے مکالمہ بھی لیکن مکالمہ خطاب نہیں گفتگو ہے اور جب گفتگو سرگوشی میں ڈھل جائے تو پھر شاعری کی شاخ پر کونپلیں آنے لگتی ہیں۔

حرف سے کونپلیں نکل آئیں
میرا لکھا پڑھا قبول ہوا

قبولیت کا یہی لمحہ شاعری ہے۔

س آپ کی شاعری میں امیجری کمال کی ہے۔ آپ نے شعرا کے ہجوم میں خود کو منفرد شاعر کے طور پر منوایا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

ج میری شاعری کی امیجری...... ہماری روایتی شاعری کی امیجری نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے کلاسک اور جدید شعرا کو پڑھنے اور متاثر ہونے کے باوجود ان کی شاعری کے پرندے، درخت، پھول، دریا، چراغ، آسمان اور زمین نہیں لیے۔ میں نے کائنات سے براہِ راست دوستی کی۔ جنگلوں، باغوں، پہاڑوں، بادلوں اور درختوں سے اپنا تعارف خود کیا ہے۔ ان سے گفتگو کی ہے۔ اس لیے میری شاعری میں وہ پھول، شجر، آسماں اور موسم بھی ہیں جو پہلی شاعری میں موجود ہی نہیں تھے اور پھر بقول ظفر اقبال شاعری میں کولاج کو میں نے پہلی بار برتا ہے۔ بظاہر دور پڑی ہوئی اجنبی چیزوں کے درمیان ایک مانوس رشتہ پیدا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ ظفر اقبال اعلیٰ شاعر اور اعلیٰ ظرف کی شخصیت ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ نذیر قیصر کی شاعری لفظوں کی مینا کاری ہے۔ یہ کام کہیں نہیں ہو رہا، کوئی نہیں کر رہا۔ نذیر قیصر کا یہ کام میرے تجربات سے بہت آگے کا کام ہے۔ لفظ و خیال میں آگے کا کام کرنے کے لیے بہت سی پرانی دیواروں کو توڑنا یا پھلانگنا پڑتا ہے۔ بنے بنائے سانچوں کو توڑ کر کچھ نیا بنانا ہوتا ہے۔ ایسی کامن سنس سے کچھ زیادہ سنس کا تقاضہ کرتی ہے۔ بہت سی شکلوں کو آؤٹ آف فوکس کر کے ری فوکس کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے آزادی بنیادی شرط ہے۔ ماضی سے آزادی، مابعد الطبیعات میٹافزیکس کے بندھنوں سے آزادی، جو علم آدمی کو آزاد نہیں کرتا وہ پاؤں کی بیڑی اور گلے کا طوق ہے۔ نئی شاعری کو نئے علم میں سانس لینے کی آزادی درکار ہے۔ وہ میں نے اپنے لیے چن لی ہے۔ آزادی محبت اور خوبصورتی تینوں مل کر سچائی کو جنم دیتی ہیں۔ یہی شاعری ہے۔ میرے منفرد ہونے کی بھی شاید یہی وجہ ہے۔

س: شاعری کی طرح آپ خود بھی نستعلیق شخصیت کے مالک ہیں۔کیا کامیاب زندگی اور ادیب کے لیے اتنا کافی ہے؟

ج: میں اپنی شاعری کی طرح نستعلیق ہوں۔کیونکہ میں نے اپنی شاعری کو بسر کیا ہے اور میری شاعری نے مجھے پہن رکھا ہے۔لوگ خصوصاً نئی نسل مجھ سے بے حد محبت اور غیرت کا اظہار کرتی ہے۔میرے لیے یہ سب کچھ بہت ہے۔گوتم بدھ نے کہا تھا ''جو کچھ تمہیں دیا نہ جائے اس کی خواہش نہ کرو۔'' دنیاوی معنوں میں میری زندگی شاید کامیاب نہ ہو۔دنیا میں کامیاب زندگی کے لیے اپنا گھر، گاڑی، بینک بیلنس، کوئی بڑا عہدہ یا بڑا کاروبار ضروری سمجھا جاتا ہے۔میرے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ایک پرانی گاڑی، سی نسان ۱۹۹۲ء ماڈل ہے۔گھر کرائے کا ہے۔غالب کی طرح قرض کی پی کر مقروض نہیں رہتا۔مگر محبت کے بہت سے قرض ادا کرنے میں لگا رہتا ہے۔

یہ محبت بھی قرض ہے سائیں
قرض ایسا جو فرض ہے سائیں

محبت کے اس قرض اور فرض میں گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ دوستوں کی محبتیں، سیاسی، سماجی اور ثقافتی شعبوں کی مصروفیات اور سب سے بڑھ کر شاعری جو پہلے شوق تھی پھر پروفیشن بنی اور اب فرض ہے۔اپنے شہر اپنے ملک اور پھر ساری دنیا کو خوبصورت بنانے کا فرض۔اقبال نے کہا تھا:

بے ذوق نہیں گرچہ فطرت
جو اُس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

بس میں اسی میں خوش ہوں اسی کو اپنی کامیابی سمجھتا ہوں کہ جس چہرے کے ساتھ فطرت نے مجھے پیدا کیا تھا وہ چہرہ مرتے وقت میری پیدائش کے وقت سے زیادہ خوبصورت ہو اور جس طرح میں اپنے خیالوں سے اپنا چہرہ تراشوں اسی طرح اپنے ملک اور دنیا کو پہلے سے بہتر صورت میں تراش جاؤں۔

س شاعری کا آغاز کب ہوا۔اب تک کتنی کتب شائع ہو چکی ہیں؟

ج شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۹ء میں ہوا۔پہلی کتاب ''آنکھیں چہرہ ہاتھ'' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔اس کے بعد ''گنبد خوف سے بشارت''، ''اے شام ہم سخن''، ''تمہارے شہر کا موسم''، ''تیسری دنیا''، ''اے ہوا موذن ہو''، ''ہرے کرشنا''، ''قسم فجر دے تارے دی''، ''زیتون دی پتی''، ''محبت میرا موسم ہے'' اسی طرح اردو کی تقریباً ۱۳ اور پنجابی کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں۔

س آپ کو حکومتی سطح پر کتنے ایوارڈ مل چکے ہیں؟

ج مجھے ۱۹۷۹ء میں آدم جی ایوارڈ اور پھر ۱۹۸۴ء میں پاکستان نیشنل کلچرل ایوارڈ (صدارتی ایوارڈ) اور ۲۰۰۲ء میں مسعود کھدر پوش، پھر لوک ادب ایوارڈ اور ناروے ایمبیسڈر سے بیس ایوارڈ اور ابھی حال ہی میں ۲۰۱۶ء کو صدارتی ایوارڈ برائے انسانی حقوق، پرائڈ آف پارفارمنس کے لیے کم و بیش ۴ مرتبہ مجھے نامزد کیا گیا۔۲۰۱۶ء میں پرائڈ آف پرفارمنس کے ججز میں فتح محمد ملک اور شاہنواز زیدی شامل تھے۔ان کے بقول کمیٹی نے مشترکہ فیصلے میں مجھے ایوارڈ دے دیا تھا جس کی تصدیق انفارمیشن ملنے کے بعد شعیب بن عزیز نے بھی کر دی تھی۔مگر اس بار بھی پروگرام میرے مطابق میں حسن نثار نے کہا کہ جب بھی نذیر قیصر کا نام اوپر آتا ہے حکومت وقت کا کوئی چمچہ کڑچھا اور سفارشی آ کر نذیر قیصر کا نام نکلوا دیتا ہے۔میرے علاوہ ہر سال ایوارڈز کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔جیسے کہ مستنصر حسین تارڑ نے لکھا ہے کہ سول ایوارڈز کے اصطبل میں ہر بار گھوڑے کم اور خچر زیادہ ہوتے ہیں۔اب میں خچر تو نہیں بن سکتا۔

پہلے بھی ہوتے تھے شاہوں کے مصاحب لیکن
لوگ غالب کے طرف دار ہوا کرتے تھے

لیکن شکر گزار ہوں فتح محمد ملک، شاہنواز زیدی، حسن نثار، سہیل وڑائچ جو آج بھی غالب کے طرفدار ہیں اور ممنون ہوں میر محمد نواز سولنگی، (ڈائریکٹر ایوارڈز) کا کہ جنہوں

نے میرے منع کرنے کے باوجود میرا نام منتخب کیا۔

س کیا آپ سرکاری سطح پر قائم ادبی اداروں کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

ج زندگی کے تمام شعبوں اور اداروں میں ہمیشہ بہتری کی گنجائش موجود رہتی ہے پاکستان کے تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی کارکردگی ابھی تک سوالیہ نشان کی طرح ہے۔ ہمارے ادبی ادارے بھی اسی صف میں کھڑے ہیں۔ سیاسی اداروں کی طرح ادبی اداروں میں بھی اقربا پروری اور گروہ بندی کی وجہ سے کرپشن کے واضح آثار نظر آتے ہیں۔ روزمرہ کھانے پینے کی اشیا میں ملاوٹ کی جائے تو اس سے ہمارا جسم بیمار ہوتا ہے لیکن اگر فکر وخیال میں ملاوٹ ہونے لگے تو اس سے ہماری روحیں بیمار ہونے لگتی ہیں۔ ہم نے اپنی نسلوں کا جسمانی اور روحانی قتل کیا ہے۔ ہماری حکومتوں اور دانشوروں کا فرض اور ذمہ داری ہے کہ وہ ادبی اداروں کو اعلیٰ ادبی شخصیات کے سپرد کریں تاکہ وہ صحیح معنوں میں فکری اور تخلیقی ادارے بن سکیں۔ پولیس اور عدلیہ کی طرح ادبی اداروں کو ریاست کے دباؤ اور اثر کی بجائے ریاست کا تعاون حاصل ہونا چاہیے۔ خصوصاً اکادمی ادبیات اور ہمارے دوسرے ثقافتی اور آرٹس کے اداروں کو بیوروکریسی سے الگ کرنے کی ضرورت ہے۔

س مشاعروں میں جانا کیسا لگتا ہے؟

ج مشاعرے ہماری تہذیبی علامت ہیں میں نے ۶۰ اور ۷۰ کے زمانوں میں وہ مشاعرے بھی پڑھے ہیں جو رات ۸ بجے شروع ہوتے تھے اور صبح کی اذان تک پوری دلچسپی سے سنے جاتے تھے۔ مگر اب میڈیا کا زمانہ ہے زندگی تیز رفتار ہے۔ مگر مشاعرے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مشاعرہ شاعر اور عوام کا براہ راست تعلق ہے۔ رفاقت ہے دوستی ہے۔ مجھے مشاعروں میں جانا اچھا لگتا ہے۔

س اپنی محبت کے بارے میں بتائیں۔ کیا محبت واقعی اپنا اپنا تجربہ ہے؟

ج کسی نے کہا تھا کہ نذیر قیصر میں کوئی عورت آباد ہے۔ میں نے کہا ایک عورت نہیں مجھ میں بہت سی عورتیں آباد ہیں۔ میری ماں جسے میں دیکھ بھی نہیں سکا، میری ٹیچرز خصوصاً

مس قمر اور مس شمس دونوں بہنیں تھیں اور اپنے نام کی طرح روشن بھی۔ میری زندگی میں ابھی تک ان کی روشنی جھلملاتی ہے اور پھر نزہت، فریدہ، پروین، کشور ناہید، امرتا پریتم، جمیلہ ہاشمی، پریم روز، قندیل، بلقیس اور میری گھریلو زندگی میں شامل شہناز اور عابد۔ میری زندگی اور میری شاعری کا پیالہ ان کی محبتوں اور مہربانیوں سے ہمیشہ چھلکتا رہتا ہے اور پھر کرسٹین راجر نے میری شاعری کا انگلش میں ترجمہ بھی کیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور پر پی ایچ ڈی کرنے والی اس امریکی خاتون نے کہا ''نذیر قیصر آپ کیٹس ہیں'' میں نے کہا ہو سکتا ہے کہ میرا انجام بھی کیٹس جیسا ہی ہو اور میں جوانی میں مر جاؤں۔ کرسٹین بولی نہیں ایسا نہیں ہونے والا۔ آپ سے زندگی میں بہت سے لوگوں نے محبت کرنی ہے اور پھر کرسٹین راجر کی دعا پوری ہو گئی۔ محبت کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ کوئی محبت بھی پہلی یا آخری نہیں ہوتی۔

پہلی پہلی محبتوں کی طرح
تم مری آخری محبت ہو

اور جیسا میں نے کہا آخری محبت کوئی نہیں محبت کی کونپل ہر نئی صبح کے ساتھ زندگی کی شاخ پر نمو پاتی ہے۔ میرے پنجابی کے دو شعر ہیں:

اساں جد وی کیتا پیار کڑے
کیتا اے پہلی وار کڑے
تو چنی وچ نہیں لک سکدی
تو ساڈے بکل مار کڑے

....

جو بھی محبت مرتی ہے
پہلی محبت ہوتی ہے

میری زندگی میں ہر روز محبت سانس لیتی ہوئی صبح کی طرح طلوع ہوتی ہے۔ یہی میری زندگی ہے اور یہی میری شاعری ہے۔ کائنات بھی محبت کی طرح کبھی پرانی اور بوڑھی نہیں

ہوتی۔ ہم پرانے ہو جاتے ہیں ہماری آنکھیں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

اب ستارے کے تعاقب میں نہیں چلتا کوئی
لوگ بوڑھے ہو گئے آنکھیں پرانی ہو گئیں

اپنی آنکھوں سے بچوں کی طرح دیکھئے آپ کو کائنات ہمیشہ نئی دکھائی دے گی۔ محبت اگر ہر کسی کا الگ تجربہ ہے تو میرا تجربہ یہی ہے۔ کہتے ہیں محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محبت اگر نہ بھی ہو تو کر لینی چاہیے۔ کیونکہ دکھ اس بات کا نہیں کہ ہم مر جاتے ہیں دکھ اس بات کا ہے کہ ہم محبت کیے بغیر مر جاتے ہیں۔

س چراغ، شام، شعلہ، ندی، پھول، تتلی، دریچہ، لڑکی، بارش، چھتری اور آسمان آپ کی شاعری کے بنیادی استعارے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج چراغ، شام، ستارہ، شعلہ ندی، پھول، رات، بارش، لڑکی، درخت، دریچہ، چھتری، آسمان وغیرہ میرے بنیادی استعارے ہیں اور ہاں پیالہ بھی ایک شعر جو فیض صاحب کو بہت پسند تھا اور جسے وہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہم اردو کے دس بہترین شعروں کا انتخاب کریں تو ان میں بھی یہ شعر شامل ہوگا اور وہ شعر یہ ہے:

خواب تھے رات کے پیالے میں
اور پیالہ اُلٹ گیا مجھ سے

میری زندگی میں دن کم اور راتیں زیادہ ہیں اور بات بہت پراسرار ہوتی ہے۔ شاعر عاشق، صوفی اور تمام خواب دیکھنے والے رات میں زندہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ رات خدا کی طرح کوئی گہرا بھید خاموشی سے بہتی ہوئی ندی جیسی ہے جس میں پھول اور دیے بہائے جاتے ہیں۔ میں آدھا جاگا اور آدھا سویا ہوا آدمی ہوں۔ یہی کیفیت میری شاعری میں ہے اور شاید اسی لیے ایسے استعارے میری شاعری کا حصہ ہیں۔

س کیا آپ اُردو ادب میں تنقیدی معیارات سے مطمئن ہیں؟

ج اردو ادب میں تنقیدی معیار کا مسئلہ تا حال بہت سی جہتیں رکھتا ہے۔ حسن عسکری

کی نئی چمک دار تنقیدی زبان اور ترجمہ شدہ تازگی، وزیر آغا کی دھرتی سے جڑی ہوئی شعوری اور لاشعوری دریافت اور ترقی پسند نقادوں کا سویل سیاسی اور معاشی نقطہ نظر اور فلاسفی کے پس منظر میں ادب کا تجزیہ یہ سب کچھ ہوا مگر خصوصاً نئی شاعری اور نئے فکشن کو ابھی تک اس طرح فوکس نہیں کیا گیا جس کا یہ تقاضہ کرتے ہیں۔ نئی شاعری پر بات کرنے والے فیض، راشد سے ناصر کاظمی، منیر نیازی وغیرہ پر آ کر رک جاتے ہیں۔ اس سے آگے کی شاعری تو بہت آگے کی بات ہے۔ پھر فکشن میں بھی بیدی، منٹو، قرۃ العین حیدر سے عبداللہ حسین اور انتظار حسین، مظہر الاسلام کو زینے سے اُتر کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ہمارے اکثر نقاد سہل پسند ہیں۔ بنے بنائے ہوئے راستوں پر چلنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں۔

س آپ کا نظریہ شعر کیا ہے؟

ج واقعی ہمارے شعراء کی اکثریت کہتی ہے مگر ان کے پاس کوئی نظریہ شعر نہیں اور یہ شاید محرومی بھی نہیں۔ مگر میں نظریہ شعر رکھتا ہوں اور وہ میرے ان شعروں میں بھی موجود ہے۔

دنیا اچھی لگتی ہے رب اچھا لگتا ہے
اچھی آنکھوں والوں کو سب اچھا لگتا ہے
ساری کتابیں سارے صحیفے مجھ پر اُترے ہیں
مجھ کو دنیا کا ہر مذہب اچھا لگتا ہے
چڑھتے اور ڈھلتے سورج کی صورت ایک سی ہے
رنگِ مشرق ہو یا مغرب اچھا لگتا ہے

زندگی کسی جرم کی سزا نہیں جسے ہم بھگتنے میں لگے ہوئے ہیں۔ زندگی خوبصورت ہے جو جینے کے لائق ہے۔ دنیا عارضی سرائے یا گناہ کا گھر نہیں۔ دنیا رہنے کے قابل ہے اسے اور بھی خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔ محبوب، بے وفا، ستم گر، قاتل نہیں مہربان ہے زندگی کا حُسن ہے۔ موسم صرف خزاں ہی نہیں بہار کا بھی ہے۔ ہمارے کاسے میں سکوں کی جھنکار کی بجائے پھول گرتے ہیں۔ دوست آستین کا سانپ نہیں۔ ہمدرد اور غم گسار رفیق ہے۔

آسمان دشمن نہیں دھنک کے رنگوں اور روشنیوں سے بھرپور دلکش باغ ہے۔ زمین سخت نہیں ماں کی طرح شفقت سے سرشار ہے۔ روز و شب کے چوبیس گھنٹوں میں کسی وقت بھی اس کی دھڑکن ایک بار ضرور سن لینی چاہیے اور ایک بار آسمان کے سامنے ضرور کھڑا ہونا چاہیے۔ رات ہو یا دن زمین اور آسمان کا ہم سفر ہوتے ہوئے انہیں کسی نہ کسی وقت محسوس بھی ضرور کرنا چاہیے۔ میں اچھے خواب دیکھنے والا شاعر ہوں۔ نفی سے اثبات کی طرف سفر کرتا ہوں۔ دشتِ وحشت سے نکل کر دشت حیرت میں قدم رکھتا ہوں۔ یہی میرا نظریہ شعر ہے۔ دنیا خوبصورت ہے اور اسے اور بھی خوبصورت کیا جا سکتا ہے۔

س آپ کے نزدیک شاعری کا حاصل کیا ہے؟

ج شاعری کا حاصل علم، خوبصورتی، محبت اور سچائی ہے۔ یہ سب چیزیں انسان کو آزاد کرتی ہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے معاشرے میں جہاں جسم کے ساتھ ہمارا روحانی ریمانڈ بھی لیا جاتا ہے وہاں شاعری ہمیں اس ریمانڈ سے آزاد کرتی ہے۔ سوچنے کی آزادی بڑی نعمت ہے اور یہ آزادی ہمیں شاعری دیتی ہے۔ بعض اتنے غریب ہوتے ہیں کہ ان کے پاس دولت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا میں جہاں جہاں جاتا ہوں دولت میرا پیچھا کرتی ہے۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا میں جہاں جہاں بھی گیا ہوں علم اور خوبصورتی نے میرا پیچھا کیا ہے۔ شاعری کا حاصل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟

س کیا ہماری شاعری ہماری زندگی کی مکمل ترجمانی ہے؟

ج شاعری ہمیشہ زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ نقطہ نظر مختلف ہو سکتا ہے۔ رومان پسندی، ترقی پسندی، تصوف مختلف دریچے ہیں جہاں دیکھئے منظر بدل جاتا ہے۔

س شاعری اور خاص طور پر غزل آپ کی پہچان ہے کیا یہ صنف مستقبل کی شاعری کے لیے سازگار ہے؟

ج غزل کا مستقبل ہمیشہ تابناک رہا ہے۔ میرؔ سے غالبؔ اور اقبالؔ تک، فیضؔ سے ناصر کاظمی، منیر نیازی، شہزاد احمد اور ظفر اقبال تک اور آج نئے لکھنے والے جس کمال کی غزل

کہہ رہے ہیں وہ ایک اور مستقبل کی روشن مثال ہے۔ نئی غزل نے نظم اور غزل کا فاصلہ کم کر دیا ہے بلکہ میری غزل نے تو یہ فاصلہ مٹا دیا ہے۔

س نئی نسل سے آپ کو کیا اُمیدیں وابستہ ہیں۔ نئی نسل کیسا شعر کہہ رہی ہے؟

ج نئی نسل بہت خوبصورت شعر کہہ رہی ہے۔ بلکہ زبان، اسلوب اور موضوعات کے تنوع کے باعث کہا جا سکتا ہے کہ یہ گزشتہ دور سے بہتر شاعری ہے۔

س آپ کا پسندیدہ شعر؟

ج دیکھیں گے اُسے چراغ اور میں
وہ اپنا لباس اُتار دے گا

س قدیم اور جدید شاعری میں نمایاں فرق کیا محسوس کرتے ہیں؟

ج ہر عہد میں غیر محسوس طریقے سے انسانی ثقافت، ادب آرٹس اور زبان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ جس کا اثر شاعری پر بھی پڑتا ہے۔ میرؔ کی زبان اور موضوعات غالبؔ تک آتے آتے کافی حد تک بدل گئے اور پھر اسی طرح اقبالؔ، راشدؔ، میرا جی سے مجید امجد اور ظفر اقبال تک زبان، اسلوب اور موضوعات کی تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں اور میں نے تین نسلیں بسر کیں۔ بہت بنتے بگڑتے دیکھا ہے۔ آج ہم جس پاکستان میں رہتے ہیں وہ قائداعظم کا پاکستان نہیں ضیاء الحق کا پاکستان ہے۔ آج ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں لوگ گاندھی اور نہرو کے ہندوستان کی بجائے مودی کے ملک میں رہتے ہیں لیکن جہاں چیزیں ٹوٹ اور بکھر رہی ہوتی ہیں وہاں پر ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ نیا بھی بن رہا ہوتا ہے۔ امید مایوسی سے زیادہ قوت رکھتی ہے۔ آج عمران خان جس نئے پاکستان کا خواب دیکھ رہا ہے وہاں کچھ نیا بھی ہو رہا ہے۔ مگر سالہا سال سے بگڑی ہوئی چیزوں کو چند دنوں میں درست نہیں کیا جا سکتا۔

س نثری نظم کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج صنف کے فرق سے شاعری کے معیار میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قطعہ، رباعی،

مثنوی، نظم، غزل، ہائیکو یا نثری نظم کوئی بھی صنفِ شعر ہو شاعری ہونی چاہیے۔ بڑی شاعری ہونی چاہیے۔ بڑی شاعری بڑے خیال کی طرح کسی بھی صنف کی محتاج نہیں۔ آج کل جو بھی نثری نظم کے شاعر ہیں بہت اچھی شاعری کر رہے ہیں۔

س نئے لکھنے والوں کے لیے پیغام؟

ج نئے لکھنے والوں کے لیے یہی پیغام ہے کہ بہت سا مطالعہ اور مشاہدہ کریں اور بہت سارا لکھیں۔ اچھا شاعر اور اچھا انسان بننے کے لیے اچھی موسیقی سنیے، اچھی نظمیں دیکھیں، اچھی کتابیں پڑھیں۔ کرکٹ میچ دیکھیں۔ ہو سکے تو کھیلیں بھی۔ سیر و سیاحت آوارگی کی طرح کریں۔ پرندوں اور درختوں سے دوستی کریں۔ علم اور خوبصورتی تلاش کریں۔ سارے مسائل لفظوں کے غلط استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ لفظوں کا درست استعمال کریں تاکہ لفظ آپ کو اور آپ لفظوں کو سر کر سکیں۔ ورنہ آج کی شخصیت اور شاعری جھوٹی پڑ جائے گی اور آپ کا چہرہ بھی کیونکہ ہمارا چہرہ ہمارے خیال کا پرتو ہوتا ہے۔ شاعری بھی تو ہمارا چہرہ ہی ہے۔

اجمل نیازی، ڈاکٹر

س اپنے خاندان اور جائے پیدائش کے بارے میں بتایئے؟

ج ضلع میانوالی کی ایک بستی موسیٰ خیل میں 16 ستمبر 1947ء میں پیدا ہوا۔ اس لیے میں اپنے آپ کو پاکستان کا ہم عمر سمجھتا ہوں۔ میرا خاندان چھوٹے سے شہر میں ایک سردار گھرانے سے تھا۔ میرا دادا جہان خاں علاقے کا ذیلدار تھا۔ اس سے بڑھ کر سردار تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ان کا جنازہ شہر کی تاریخ میں سب سے بڑا جنازہ تھا۔ پہلی صف میں ایک آدمی سے کہا گیا کہ دوسری صف میں تمہارے پاس وہ آدمی کھڑا ہے جو تمہارے باپ کا قاتل ہے۔ تمہارے لئے بدلہ لینے کا موقع ہے۔ اس نے کہا کہ آج سردار کا جنازہ ہے بدلہ لینے کا موقع پھر بھی کبھی ملے گا۔ دادا جان کو سارے علاقے کے لوگ بابا جی کہتے تھے۔ وہ بڑے بہادر اور بے باک آدمی تھے۔ رُعب اور دبدبے کی انوکھی ادا ان کو نصیب ہوئی تھی۔ ان سے عجیب رنگ کا ڈر لگتا تھا۔ مگر اس جلال میں جمال کی ایک دنیا بھی تھی کہ لوگ ان کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ان کے لئے ضلعی انتظامیہ کے انگریزوں نے لکھا کہ وہ بات کرتا ہے تو سکتہ طاری کر دیتا ہے۔ میں ان کی آخری عمر میں ان کے پاس رہا۔ ان کا طرز زندگی بہت متاثر کرنے والا تھا۔ مردانے پن کا ایک بڑا پن ان کی شخصیت میں تھا۔ وہ گالیاں بہت دیتے تھے اور کوئی مائنڈ نہیں کرتا تھا۔

میرے ابا نے ہم تینوں بھائیوں کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل کرایا تھا۔ اس لئے سارے خاندان والے ہماری بہت عزت کرتے تھے۔ محبت کرنے کیلئے عزت کرنا بہت

ضروری ہے۔ ابا پولیس میں انسپکٹر تھے۔ وہ قبل از وقت ملازمت چھوڑ کر گھر آ گئے جبکہ تب پولیس کا محکمہ بادشاہی سے کم نہ تھا۔ ابا اتنے دردمند تھے کہ ضلع مظفر گڑھ کے بہت معروف لیڈر نواب زادہ نصراللہ خاں نے ایس پی مظفر گڑھ سے کہا کہ ایسے لوگ بھولے سے اس محکمے میں آجاتے ہیں۔ ایک بار ایک نوجوان علاقے میں قتل ہوگیا تھا۔ مقتول کی نعش زمین پر رکھی ہوئی تھی۔ ابا S.H.O تھے۔ بہت صاف ستھری وردی انہوں نے پہنی ہوئی تھی۔ وہ زمین پر روتی ہوئی بوڑھی ماں کے پاس بیٹھ گئے اور زار زار رونا شروع کر دیا۔ وہاں موجود سب لوگ حیران رہ گئے۔ ابا کو ہزاروں اشعار مختلف زبانوں میں یاد تھے اور وہ بڑے جذبے سے پڑھتے تھے۔

میں نے علمی وادبی ذوق وشوق کی ساری فراوانی بڑی آسانی کے ساتھ ان سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے میرے ابا کی محبت کا راز کیا تھا، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ میٹرک پاس تھے۔ انہیں موقع دیا جاتا تو ایم اے پی ایچ ڈی بھی کر سکتے تھے۔ میرے تعلیمی سفر کا آغاز بھی گورنمنٹ کالج لاہور ہے اور اختتام بھی گورنمنٹ کالج لاہور ہے۔ یہاں میں گورنمنٹ کالج لاہور کے منفرد اور ممتاز ادبی میگزین ''راوی'' کا ایڈیٹر ہوا۔ میرے مرتب کردہ پرچے کیلئے تہران ریڈیو کے اردو پروگرام میں بھی تبصرہ نشر ہوا۔ میں نے ایک سال میں ''راوی'' کے تین پرچے شائع کرائے جبکہ صرف ایک پرچہ ہی شائع ہوتا ہے۔ سٹوڈنٹ لائف ہی میں میں ایک تسلیم شدہ شاعر ادیب کے طور ادبی حلقوں میں معروف ہوا۔ میری ادبی کامیابیوں میں سب سے زیادہ گورنمنٹ کالج لاہور کا کردار ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے مسلمان پرنسپل عظیم اردو مزاح نگار پطرس بخاری نے کہا تھا کہ نہر سویز کے اس طرف کوئی بڑا تعلیمی ادارہ ہے تو وہ صرف گورنمنٹ کالج لاہور ہے۔

س آپ کا حوالہ شاعری بھی ہے لیکن کافی عرصہ سے آپ کا نیا کلام نظر سے نہیں گزرا۔ کیا آپ نے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے اور کیوں؟

ج میرا ادبی حوالہ آج بھی شاعری ہے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ لوگ میرے بارے

میں کس طرح سوچتے ہیں۔ شاعری میں ہم میر اور غالب کا نام لیتے ہیں۔ پھر سید ھے اقبال اور فیض پہ آ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی شاعر ہیں جن کی کوئی خاص اہمیت ہمارے خیال میں نہیں ہے۔ میں ان شاعروں میں شمار نہیں ہونا چاہتا۔

اپنے ادبی سفر کا رستہ بالعموم آدمی شاعری سے کرتا ہے۔ میں نے بھی یہی کیا۔ ایک منفرد اسلوب میں شعر کہنے کی کوشش کی مگر میرے خیال میں یہ ایک ناکام کوشش تھی۔ میرا ایک مجموعہ کلام بھی شائع ہوا ہے ''پچھلے پہر کی سرگوشی'' کچھ لوگ سرگوشی اور ''شرگوشی'' میں فرق کم کرنے لگتے ہیں۔

میرا رزق نثر میں رکھا گیا ہے۔ کوئی آٹھ دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میری نثر میں شاعرانہ اسلوب گہرا ہوا ہے۔ بلکہ کچھ دوستوں نے تو کہا کہ میں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ مجھے تو اپنے ادبی سفر کے آغاز کا پتہ نہیں چلا تو اختتام کے بارے میں کیا کہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے شعر کہنا نہیں چھوڑا۔ اس جملے کی وضاحت میرے لئے ناممکن ہے تو آپ کے ''کیوں'' کا جواب کیسے دوں۔

س آپ تواتر سے کالم لکھتے ہیں اور اس میں آپ اپنی شناخت بنا چکے ہیں۔ کالم نگاری کے فن پر کچھ روشنی ڈالئے؟

ج میں تقریباً ہر روز کالم لکھتا ہوں۔ اب تو بے شمار لوگوں نے کالم لکھنا شروع کر دیئے ہیں۔ جسے لکھنا نہیں آتا وہ کچھ لکھنے کی خواہش میں مبتلا ہے، وہ کالم لکھ دیتا ہے اور وہ شائع بھی ہو جاتا ہے۔ ہر ایک اخبار میں آٹھ دس کالم تو ہوتے ہیں۔ کچھ اچھا لکھنے والے بھی ہیں۔

میں کالم نگاری کو سالم نگاری بھی سمجھتا ہوں۔ اس جملے کی تشریح آپ خود کر لیں اب تو صرف کالم ہی شائع ہو رہے ہیں۔ سواسے جلدی ادبی صنف سخن مان لیا جائے گا۔ یہی حال سفرنامہ نگاری کا ہوا تھا۔ اب تو کوئی دبئی بھی چلا جاتا ہے تو واپس آ کے سفرنامہ لکھ دیتا ہے۔ بلکہ اب اس کے لئے اپنے ہی ملک میں کہیں چلے جانا بھی کافی سمجھا جاتا ہے۔ بے چارے مستنصر حسین تارڑ کو سفرنامے کی بنیاد پر اپنے آپ کو ادیب منوانے میں بڑی مشکل پڑی۔

اب وہ ایک ممتاز ادیب ہے۔ اب تو اس نے کالم بھی لکھنا شروع کر دیے ہیں۔ کشور ناہید ایک زمانے میں کالم نگاروں کے خلاف بات کرتی رہی اور پھر اس نے خود کالم لکھنا شروع کر دیا۔ اچھے کالم اس نے لکھے ہیں اور کیا اس فن پر روشنی ڈالوں۔ میری طرف سے اس اندھیرے پر اکتفا کریں۔

س شاعری اور کالم نگاری کے علاوہ کن اصناف میں لکھا؟

ج شاعری میری پہلی محبت ہے اور پہلی محبت ہی آخری ہوتی ہے۔ کالم نگاری میری ضرورت ہے اور ضرورت پہلی اور آخری نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے سفر نامہ لکھا وہ بھی صرف بھارت کا سفر نامہ۔ میں سب سے پہلے جناب عطاء الحق قاسمی کے ساتھ بھارت گیا تھا۔ اس کے بعد بھی آٹھ دس ملکوں میں جانا ہوا۔ پہلا تاثر کالم میں لکھا۔ میرے پاس نوٹس موجود ہیں مگر ابھی لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ سعودی عرب اور ناروے کا سفر نامہ لکھنے کا شوق ہے۔ دیکھیں یہ شوق فراواں کب بنتا ہے۔

س اپنی تصانیف کی تفصیل بتایئے؟

ج 1۔ مندر میں محراب (سفر نامہ بھارت) 2۔ جل تھل شعری انتخاب، 3۔ بے نیازیاں (کالم) 4۔ پچھلے پہر کی سرگوشی (شاعری) 5۔ بازگشت (شعری انتخاب میانوالی) 6۔ خون الکشمیر (تحقیقی مقالہ) 7۔ اقبال شناسی اور سویرا (مرتب کتاب)۔

س آپ کو شاعری اور کالم نگاری میں سے کونسی صنف زندگی کے قریب تر دکھائی دیتی ہے؟

ج میں شاعری کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ کالم نگاری بھی آج کے زمانے میں اپنی اہمیت منوا رہی ہے کالم کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں۔ شاعری ایک آفاقی تخلیق ہے۔ کوئی قوم اپنا اظہار شاعری میں کرتی ہے۔ ہم علامہ اقبال کے مقابلے میں کسی کالم نگار کو نہیں لا سکتے۔ اپنے زمانے کی ترجمانی شاعری میں ہوتی ہے۔ جس طرح اب شاعری کو زوال آیا ہوا ہے تو ممکن ہے کہ کالم کو کچھ اہمیت مل جائے مگر ہم چین کو چینی شاعری کے حوالے سے دیکھیں گے۔ ماؤزے تنگ خود ایک شاعر ہے۔ وہ چین کا سب سے بڑا لیڈر ہے۔ اس نے اپنے

اظہارِ خیال کے لئے کالم نہیں لکھے۔ مجھے تو کسی چینی کالم نگار کا نام بھی نہیں آتا۔ ابھی تو کالم کو ادب کے طور پر تسلیم کرانے کا مرحلہ باقی ہے۔ بڑا شاعر پوری دنیا کا نمائندہ ہوتا ہے جبکہ کالم نگار کو ایک ملک کے ترجمانی کے طور پر اپنی پہچان بنانے میں مشکل پیش آتی ہے۔ شاعری زندگی کو بیان کرتی ہے۔

س کتھارسس کا بہترین ذریعہ کس صنف کو سمجھتے ہیں؟

ج کتھارسس کے لئے شاعری کے علاوہ کسی اور تخلیق کا نام نہیں لیا جا سکتا ہے۔ اپنی شاعری تو اپنی ہے۔ کتھارسس کے لئے کسی قوم کے شاعر کی تخلیقات بھی ہماری مدد کرتی ہیں۔ کسی قسم کسی زبان کا شاعر میرا دوست ہو سکتا ہے۔ کتھارسس کے لئے دوستی بھی نمایاں ہے۔ دوستی اور شاعری ایک جیسی چیز ہیں۔

س موجودہ شاعری میں کون اچھا لگتا ہے۔ یہی سوال کالم نگاری کے حوالہ سے ہے؟

ج تخلیقی انفرادیت کی سب سے بڑی مثال کوئی ہے تو وہ صرف منیر نیازی ہے جو میرے قبیلے کا سردار ہے اور شاعری کا خانِ اعظم ہے۔ میری وہ زندگی مجھ سے آگے نکل گئی جو منیر نیازی کے ساتھ گزری۔ میر، غالب اور اقبال کے بعد منیر نیازی صرف منیر نیازی۔ میں نے ایک دفعہ منیر نیازی سے کہا یہ شعر نجانے آپ نے کس کے بارے میں کہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کا یہ شعر آپ کے بارے میں ہے۔

کل دیکھا اک آدمی اٹا سفر کی دھول میں
گم تھا اپنے آپ میں جیسے خوشبو پھول میں

س قدیم شعراء میں سے کون پسند ہے؟

ج ہم پڑھنے والوں کو غالب اور اقبال کے حوالے سے پھنسا لیا گیا ہے ورنہ قدیم شاعروں کو پڑھتے ہوئے کئی اشعار نے روک لیا۔ میں ابھی یوں رکا ہوا ہوں۔

غالب اور اقبال کے لئے بھی یہ کہنا کہ وہ مجھے پسند ہیں یہ ایک روٹین بن گئی ہے۔ پسندیدگی قائم رہتی ہے مگر روٹین نہیں بنتی۔ پسندیدگی کچھ اور چیز ہوتی ہے جسے بیان کرنا بڑا

مشکل ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس جملے کی وضاحت کوئی نہیں کر سکا۔ میں کچھ قدیم شعرا کا نام لینا چاہتا ہوں مگر مجھے ان کا نام ہی یاد نہیں۔

س آپ سمجھتے ہیں کہ شاعری ادب برائے ادب ہے یا ادب برائے زندگی بھی ہے؟

ج یہ سوال اب مر چکا ہے مگر کچھ سانسیں ابھی باقی ہیں۔ جواب دینے سے سوال زندہ نہیں ہوتا۔ سوال اپنے جواب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ کوئی آدمی یہ سوچ کر نہیں لکھتا مجھے ادب کا لفظ اچھا لگتا ہے۔ تحریر میں ادب واحترام کی خوشبو بھی ہونا چاہئے۔ ایک خاتون سے پوچھا گیا کہ آپ کو ادب سے دلچسپی ہے۔ تو اس نے بے ساختہ کہا کہ میں اپنے بڑوں کا بہت ادب کرتی ہوں۔

س کیا ہم کالم میں پورا سچ لکھتے ہیں؟

ج پورا سچ کیا ہے اور آدھا سچ کیا ہے۔ کوئی بات سچ ہوتی ہے یا سچ نہیں ہوتی۔ مگر جھوٹ کا لفظ کبھی ادب کے حوالے سے استعمال نہیں کیا جاتا۔ میری گزارش ہے کہ کبھی کبھی تھوڑا سا جھوٹ بول لینا چاہئے۔ جھوٹ کی بھی ایک اہمیت ہے اور اس کا ایک کردار ہے۔ کبھی جھوٹ بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ سچ کا مزیدار ہونا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود جھوٹ کا تسلسل سے بولنا بری بات ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں کہ پورا سچ کیا ہوتا ہے۔ میرے کالموں میں اس کا ہونا کوئی اور معلوم کرے میں نے تو کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں سچ لکھ رہا ہوں یا نہیں لکھ رہا۔ سوچ سوچ کے سچ بولنے سے اچھا ہے کہ میں بے ساختہ جھوٹ بول دوں۔ آپ اچھے دل سے جھوٹ بولیں تو وہ سچ بن جاتا ہے۔

س تنقید نگاروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کیا جدید تنقید اپنا منصب کھو چکی ہے؟

ج میں نے کبھی تنقید نگاروں کے لئے خیال نہیں کیا۔ تنقید کیا ہوتی ہے، مجھے معلوم ہی نہیں۔ میں صرف تخلیق کا قائل ہوں۔ آج کل ایک ادبی اصطلاح نکلی ہے۔ تخلیقی تنقید۔ اس کے علاوہ میں کیا کہوں۔

س شاعری میں ادبی گروہ بندیاں عام رواج پا چکی ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کا

خیال کیا ہے؟ کیا کالم نگاری میں بھی یہی روش پنپ رہی ہے؟

ج ادبی گروہ بندیاں اب اتنی اہم نہیں رہیں۔ ادبی گروہ بندیوں کا ایک فائدہ بھی تھا۔ لکھنے والے اس کے حوالے سے سرگرم ہوتے ہیں۔ کسی کے خلاف لکھنے کا ایک موقع تو تھا۔ ہمارے زمانے میں احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کا مقابلہ ہوا تھا۔ وہ دونوں کسی نہ کسی طرح اب تک لوگوں کو یاد ہیں مگر ان کی حمایت کرنے والے کہاں گئے۔ کالم نگاروں میں ایسی کوئی روش نہیں ہے۔ کالم نگار تو جن کے بارے میں لکھ رہے ہوتے ہیں ان کے اپنے اپنے تعصبات ہوتے ہیں۔ اپوزیشن تو سیاستدانوں میں ہوتی ہے اور پھر اپوزیشن بنانے والے بھی بہت ہوتے ہیں۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں۔ میں نے ایک سیاستدان کے خلاف لکھا اور پھر کچھ دنوں کے بعد اس کے حق میں بھی لکھ دیا۔ اب تو نظریات کہیں نظر نہیں آتے۔ مستقلاً کسی کے خلاف یا کسی کے حق میں لکھنے والے بھی ہیں اس میں مفادات ہوتے ہیں جو حکمرانوں میں ہوتے ہیں، تو لکھنے والوں میں بھی ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ کچھ کالم ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں ادب میں شامل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اب کالم ہی لکھا جا رہا ہے۔ چند ادبی رسالے ہیں جن میں افسانہ وغیرہ مل جاتا ہے مگر ایک ادبی رسالہ بہت کم تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ اخبار لاکھوں میں شائع ہوتے ہیں تو ہزاروں نہیں، سینکڑوں تو کالم پڑھتے ہوں گے۔ فوری طور پر کسی ردعمل میں غزل تو نہیں لکھی جا سکتی۔

س پاکستان میں مختلف حلقے کام کر رہے ہیں آپ ان کے کام سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج اب تو چند لکھنے والے اکٹھے ہوتے ہیں تو حلقہ بن جاتا ہے۔ حلقے کا دائرہ محدود ہوتا ہے مگر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم تو ایک حلقے کے مداح ہیں اور وہ حلقہ ارباب ذوق ہے۔ اس میں الیکشن ہوتے ہیں تو لکھنے والے تقسیم بھی ہو جاتے ہیں مگر یہ بات کوئی اتنی مضبوط نہیں ہوتی۔ مخالفین انتظامیہ کے اجلاس میں شرکت بھی ہوتی ہے اور اپنی تحریریں بھی پڑھی جاتی ہیں اور ان کی تعریف کرنے والے کبھی کبھی وہ بھی ہوتے ہیں جو مخالف تھے۔

س کیا اکادمی ادبیات اپنے فرائض بخوبی نبھا رہی ہے؟

ج اکادمی ادبیات پاکستان ایک سرکاری ادبی ادارہ ہے اور ادیب بالعموم سرکار دربار سے دور ہوتے ہیں بہت عرصہ ہوا کہ اسلام آباد والی مرکزی اکادمی ادبیات میں ایک کل پاکستان رائٹرز کانفرنس ہوئی تھی۔ وہ غالباً دو تین بار ہوئی تھی۔ اس میں پاکستان بھر سے لکھنے والے خواتین وحضرات اسلام آباد اکٹھے ہوئے تھے۔ اس کا ایک فائدہ تھا کہ پاکستان بھر کے لکھنے والے اور لکھنے والیاں ایک دوسرے سے ملاقات کر لیتے تھے۔ وہ بھی کئی برسوں سے نہیں ہو رہی۔ اس کے علاوہ اکادمی کچھ نہیں کرتی۔ مستحق لکھنے والوں اور والیوں کو وظیفے کے طور پر ماہانہ بنیادوں پر مدد کر دی جاتی ہوگی۔ لاہور میں جو اکادمی ادبیات ہے اس میں ہم جمیل صاحب کو جانتے ہیں۔ لاہور والی اکادمی کا انچارج یا ڈائریکٹر کون ہے کبھی معلوم نہیں ہوا۔ میں صرف جمیل صاحب کو جانتا ہوں جو معمولی ملازم ہے۔

س حکومتی سطح پر ادب کے حوالے سے کیا کام ہو رہا ہے؟

ج حکومتی سطح پر ادب کے حوالے سے کوئی کام نہیں ہو رہا۔ ادب کے حوالے سے کوئی کام عبوری سطح پر ہوتا ہے حکومتی سطح پر ہوتو ہم قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔

س آپ کے نزدیک نئی نسل کی کتاب سے دوری کی وجہ کیا ہے؟

ج نئی نسل کتاب سے دور ہو رہی ہے تو پرانی نسل کب کتاب سے قریب تھی۔ ہمارے ہاں وہ ماحول ہی نہیں بنا جس میں کتاب سے دوستی استوار ہوتی ہو۔ اب بھی چند لوگ ہیں جو کتاب کے ساتھ کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ کتاب سے دوری کی وجہ کیا ہے۔ میں نے اپنے گھر میں صرف کتابیں دیکھی ہیں۔ میرے والد پولیس انسپکٹر تھے لیکن ہمارے گھر میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ میرے گھر میں کسی بھی چیز سے زیادہ صرف کتابیں ہیں اور میں نے ایک کتاب بھی خود خریدی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ کتاب پڑھی جاتی ہے۔ اگر نہیں پڑھی جاتی تو شائع کیوں ہوتی ہے۔ یہ ایک مفروضہ خواہ مخواہ عام ہو گیا ہے کہ ہم کتاب نہیں پڑھتے۔ ہر آدمی تو کتاب پڑھنے والا نہیں ہوتا۔

س: کیا ادب مفقود ہوتا جا رہا ہے؟ ادب کا آپ کیا مستقبل دیکھ رہے ہیں؟

ج: ادب کبھی مفقود نہیں ہوتا۔ ادب کا مستقبل کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کا زوال پذیر ہونا ناممکن ہے۔ اب تو کالموں میں بھی ادب اپنی جھلکیاں دے رہا ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں شعروادب کی موجودگی انسان کے اظہار میں محسوس ہوتی رہے گی۔

س: مشاعروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ان کے ذریعے سے ادب کو فروغ مل رہا ہے؟

ج: شاعر بہر حال قوم کا نمائندہ ہوتا ہے۔ بہت کم شاعر کوئی مقام حاصل کر پاتے ہیں۔ اس وقت مشاعرہ بھی ادب کے فروغ کیلئے کوئی کردار ادا نہیں کر رہا۔ اب تو یہ ایک کاروباری صورتحال کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ اس کے لئے بھی کوئی اچھی صورت نظر نہیں آ رہی۔ مشاعرے میں شاعروں کو کچھ فائدہ ہوتا ہے اور مشاعرے کرنے والے بھی کچھ بنا لیتے ہیں۔ اب یہ دونوں باتیں کچھ کچھ متنازعہ ہوگئی ہیں۔ اس میں بھی بیرون ملک مشاعرے قابل ذکر ہیں۔ ان پر زیادہ نظر ہوتی ہے۔ اس میں بھی چند شاعروں کی اجارہ داری کا الزام زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ صرف چند شاعروں نے ان مشاعروں کو لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ کسی شاعر کو مشاعرے کے لئے کہیں تو وہ فوراً سوال کر دیتا ہے۔ مشاعرہ پڑھنا ہے یا کچھ ملے گا بھی۔

س: ایک شاعر معاشرے کا سچا عکاس ہے یا کالم نگار؟

ج: شاعر اور کالم نگار اپنا اپنا کردار رکھتے ہیں۔ دونوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کا موازنہ کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔ کالم نگار اور شاعر اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اب کسی نے کبھی معاشرے کی عکاسی کا سوچا بھی نہیں ہے۔ کچھ ہوتا ہے تو وہ ہو جاتا ہے۔ کچھ شاعر وغیرہ ان معاملات میں نہیں پڑتے۔ شاعر تو اس طرح عکاسی نہیں کرتا کہ وہ محسوس ہو۔ کالم نگار بھی یہ کام نہیں کرتا۔ البتہ کالم نگاری سے زیادہ لوگوں کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اب کالم نگار حیثیت اور اہمیت میں آگے جا رہا ہے۔

س آپ کو ایوارڈز ملے تو ان کی تفصیل قارئین کو بتائیے؟

ج مجھے ستارہ امتیاز ملا ہے مگر میرا خیال ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کی طرف سے مجھے رول آف آنر ملا تو میں زیادہ خوش ہوا، میں حیران ہوں کہ مجھے ایوارڈ کس طرح مل گیا۔ لوگ تو اس کے لئے بہت پلاننگ کرتے ہیں میں نے اس کے لئے سوچا بھی نہ تھا۔

میرے لئے برادرم ڈاکٹر بابر اعوان نے کچھ کہا ہے۔ وہ میرے محسن ہیں میری اہلیت اور حیثیت کو بھی مانتے ہیں۔ انہوں نے شاید صدر زرداری سے کچھ کہا۔ صدر زرداری بھی میرے لئے محبت رکھتے ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ مجھے ایک رات پہلے ٹیلی فون آیا کہ تم اسلام آباد پہنچو۔ تمہیں ایوارڈ دیا جائے گا۔ پنجاب کے سب لوگوں کو لاہور میں ایوارڈ ملے مگر مجھے اسلام آباد میں ستارہ امتیاز دیا گیا۔

میں تو آدھی رات کے بعد ٹوٹتے ہوئے ستاروں کا دوست ہوں جبکہ وہ کبھی کبھی ٹوٹتے ہیں۔ یہ ٹوٹتے ہوئے ستارے دیکھنے والا کوئی دوسرا میرے ساتھ نہیں ہوتا جبکہ ستارہ امتیاز حاصل کرتے وقت میری اہلیہ میرے ساتھ تھی۔

س کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج کا ادیب اپنے کام کی وجہ سے اپنا نام بنا رہا ہے یا اس کے پس پشت کچھ اور عوامل بھی کارفرما ہیں؟

ج ادیب کا اپنا کام بھی کچھ نہ کچھ ہوتا ہوگا مگر اس کے علاوہ عوامل بہت سے کارفرما ہیں۔ یہاں معاشرے میں سب لوگ نہیں جانتے کہ ان کا اپنا کام کیا ہے۔ بس ہر کوئی سفارش کے لئے بھاگا پھرتا ہے اور اس کوشش میں ہوتا ہے کہ کسی کو کہہ کہلوا کر اپنا کام کروا لے۔ اب ادب بھی ایک کام بن کر رہ گیا ہے۔

س نئے لکھنے والوں کے لئے کوئی پیغام؟

ج میں کوئی پیغام دینے کی پوزیشن میں نہیں۔ نئے لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ بس لکھتے رہیں۔ لکھتے ہی رہیں۔ مجھ سے بہت سے نئے لکھنے والے اصلاح وغیرہ کی بات کرتے ہیں تو میں ان سے کہتا ہوں کہ لکھتے رہیں۔ لکھنا خود بخود آ جائے گا۔

امجد پرویز، ڈاکٹر

آپ کی پیدائش کہاں ہوئی، تعلیم کہاں کہاں سے حاصل کی؟

میری پیدائش لاہور میں ہوئی۔ میرے والد پروفیسر شیخ عبدالکریم مرحوم جن کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ میٹرک کے بعد لاہور منتقل ہو گئے تھے اور بقیہ تعلیم اسلامیہ کالج لاہور سے حاصل کی۔ ایم ایس سی کیمسٹری کے بعد وہیں درس و تدریس سے منسلک ہو گئے۔ اپنی وفات کے وقت وہ صدر شعبہ کیمیا تھے۔ ان کی کتب کریمز کیمسٹری۔ کریمز آرگینک کیمسٹری۔ کریمز ان آرگینگ کیمسٹری اور کریمز پریکٹیکل کیمسٹری سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بیک وقت استفادہ کیا۔

آپ بالحاظ تعلیم انجینئر ہیں۔ صحافت سے منسلک ہیں اور کلاسیکل گائیک بھی ہیں۔ اس سفر میں کس شعبے میں زیادہ دلچسپی ہے؟

میں نے لاہور اسکولز میں 1960ء میں اول اور سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں بھی اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ موسیقی سے شغف قدرتی تھا۔ سکول کے بزم اقبال، بزم ادب اور دیگر تقاریب میں حصہ لیا تھا۔ رجحان آرٹس کے مضامین کی طرف تھا۔ میرے والد نے مرنے سے قبل (ان کی وفات 15 مئی 1959ء کو ہوئی) میری والدہ ممتاز بیگم جو کہ خواجہ دل محمد۔ ریاضی دان وقومی شاعر کی دختر تھیں، ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ مجھے انجینئر بنائیں۔ ان کی خواہش کے احترام میں گورنمنٹ کالج لاہور سے پری انجینئرنگ کے بعد مجھے یونیورسٹی آف انجینئرنگ کی ڈگری مل گئی۔ وہیں لیکچرار لگ گیا اور 1968ء میں برمنگھم یونیورسٹی یوکے میں اعلیٰ تعلیم کیلئے روانہ ہوگیا۔ 1969ء میں ایم ایس سی اور 1972ء

میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر اکتوبر 1972ء میں وطن واپس آ گیا۔

ساری عمر انجینئرنگ میرا پروفیشن اور موسیقی میرا جنون رہا ہے۔ یو ای ٹی سے لے کر یو کے تک تعلیم کے دوران میوزک کنسرٹس کا انعقاد کرتا اور ان میں بھرپور حصہ لیتا رہا۔ یو ای ٹی میں اور گورنمنٹ کالج لاہور میوزک سوسائٹی کا فعال ممبر رہا۔ یو کے میں قریباً تمام یونیورسٹیوں میں پاکستان ڈے کی تقاریب میں حصہ لیا۔ سفارت خانہ یو کے نے مجھے غالب کی صد سالہ تقریبات میں حصہ لینے کے لئے لندن میں نامزد کیا جبکہ بھارت کی طرف سے اوم پرکاش اور راجندر سنگھ بیدی نامزد تھے۔ میں نے غالب کی غزلیں گائیں۔ وہیں پر بی بی سی کے اپشینز کے لئے پروگراموں میں حصہ لیتا رہا۔ لکھنے کا کام 1987ء میں شروع کیا۔

س آپ نے گائیکی کا آغاز کب کیا؟ آپ کے استاد کون ہیں؟

ج گائیکی کا آغاز اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کی مجالس میں ہو گیا تھا۔ ریڈیو پاکستان لاہور میں 'ہونہار بچوں' کے پروگرام میں آپا شمیم (موٹی حمید) اور بھائی جان (فاروق علی خاں) میں بحیثیت چائلڈ ستار بحیثیت گلوکار ابتدا ہوئی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ آؤٹ سٹینڈنگ کیٹگری میں شامل ہو گیا۔ پی ٹی وی کے ابتدائی دنوں سے اب تک اس کے موسیقی کے پروگراموں میں شمولیت کرتا رہا۔ وہاں پر میرے پروگرامز آئیڈیا ''سنگت'' (1972-73ء) اور ''دیس پردیس'' (1996ء) پر کامیاب پروگرام ہوئے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ موسیقی کی کہانی لمبی ہے۔ کسی اگلی نشست پر بقیہ گزارشات پیش کروں گا۔

جہاں تک میرے اساتذہ کا تعلق ہے، میں نے پاکستان کے بیشتر موسیقاروں کی دھنیں گائی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ تمام موسیقار میرے استاد ہیں۔ میں نے زیادہ تر دھنیں موسیقاروں میاں شہریار اور اختر حسین اکھیاں کی گائی ہیں۔ ہلکی پھلکی موسیقی یعنی کہ گیت، غزل اور کافی گانے میں وہ میرے استاد ہیں۔ موسیقاروں بخشی وزیر اور ماسٹر منظور حسین بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ 1972ء میں وطن واپسی پر مشتاق ہاشمی اور میں نے شام

چوراسی کے نمائندہ کلاسیکل گائیکوں استاد نزاکت علی خاں اور استاد سلامت علی خاں کی شاگردی اختیار کی۔ پھر 1993ء میں اسی گھرانے کے استاد غلام شبیر خاں، استاد غلام جعفر خاں سے کسبِ فیض کیا۔ حال ہی میں استاد غلام شبیر خاں کے انتقال کے بعد ان کی میوزک اکیڈمی پاکستان میوزک سنٹر، میٹروپول سینما لاہور میں ہم سب شاگرد اسی طرح ریاض کرتے ہیں جس طرح کہ ان کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔

س کون سے نغموں کو زیادہ شہرت ملی؟

ج چونکہ گائیکی کی ابتدا لوک گیتوں سے کی تھی۔ اس لئے اس حوالے سے مندرجہ ذیل لوک گیت آج بھی مقبول ہیں، جنہیں مشہور لوک گائیک حامد علی بیلا صاحب سے سیکھا تھا۔

تیرا لٹیا شہر بھنبھور نی سسیے بے خبرے
اوڑک جاناں مروے چل میلے نوں چلیے
سینوں لا لیا بے پروا دے نال (کافی)
کینویں گوری چلدی اے سپنولیے دی چال وغیرہ

اگرچہ ریڈیو اور پی ٹی وی پر بے شمار غزلیں، گیت اور پنجابی کلام گایا ہے مگر مندرجہ ذیل نغموں کو زیادہ شہرت ملی۔

جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے (نظم: امجد اسلام امجد) تھیم، ایک محبت سو افسانے، تحریر: اشفاق احمد، پی ٹی وی)

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں (منیر نیازی، پی ٹی وی پروگرام، ماہنامہ، پروڈیوسر: محمد عظیم)

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک (کلام: غالب، موسیقی شہریار پی ٹی وی پروگرام، انداز اپنا اپنا، پیشکش: فرخ بشیر)

اجنبی بن کے نئے روگ لگانے آؤ (غزل: شہزاد جالندھری، موسیقی: ماسٹر منظور، سی پی یو، ریڈیو پاکستان، لاہور)

میری تصویر میں رنگ اور کسی کا تو نہیں (موسیقی: ماسٹر منظور، سی پی یو، ریڈیو پاکستان،

لاہور، غزل: مظفر وارثی)

مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگوں نے (غزل: داغ دہلوی، پی ٹی وی پروگرام غزل اس نے چھیڑی، موسیقی: استاد ضمیر احمد خان، پیشکش: شوکت زین العابدین)

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے (غزل: میر تقی میر، موسیقی شہریار، پروگرام محفل پی ٹی وی) وغیرہ۔

س کیا گانا زیادہ پسند کرتے ہیں کافی، غزل، گیت یا کلاسیکل راگ؟

ج ہر صنف کو گاتا ہوں محبت سے۔ میری لائیو (Live) کنسرٹس کلاسیکی گائیکی سے شروع ہو کر غزلوں، گیتوں، فلمی گانوں، کافیوں اور لوک گیتوں تک محیط ہوتی ہیں۔ اگرچہ ہلکی پھلکی موسیقی کی تمام اصناف تمام عمر گاتا رہا لیکن کلاسیکل خیال کی گائیکی باقاعدہ سے 1990ء کی دہائی سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور اسٹیج پر شروع کر دی۔ ایک مرتبہ آل پاکستان موسیقی کانفرنس کے بانی سیکرٹری جنرل حیات احمد خان نے مجھے جب اپنی ایک ماہانہ محفل میں گانے کے لئے مدعو کیا تو یہ حکم فرمایا کہ ''امجد اب کلاسیکل موسیقی ہی گایا کریں گے۔'' اس لئے اب میں خیال کی گائیکی کو ترجیح دیتا ہوں۔ روزانہ ریاضت سے دیگر اصناف موسیقی میں گائیکی کے اظہار میں مزید سریلا پن، نکھار اور مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے۔

س آپ کو دیگر کئی ممالک میں بہت شوق سے سنا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک میں ہماری موسیقی کو کیا مقام حاصل ہے۔

ج دراصل آدھی دنیا کی سیر کا میں موسیقی کا مرہون منت ہوں۔ لیکن اپنے انجینئرنگ کے کاموں کے سلسلے میں جب بھی بیرون ملک جاتا وہاں پرائیویٹ اور حکومتی ادارے بمع سفارت خانہ پاکستان میرے ساتھ محفلیں برپا کرتے رہتے تھے۔ امریکہ، انگلستان، یورپ کے بیشتر ممالک اور خلیج میں بہت اسٹیج شوز ہوئے۔ یہ سلسلہ جاری وساری ہے لیکن چند شوز یادگار ہیں جیسا کہ 1998ء میں میانمار (برما) کے دارالخلافہ ینگون (رنگون) میں سفیر پاکستان کا پاکستان کے جشن آزادی پر مجھے مدعو کرنا تھا۔ محترمی جاوید حفیظ، سفیر پاکستان نے

میرے اعزاز میں چار فنکشنز کا اہتمام کیا۔ سب سے بڑا شو ایک ہزار سے زائد سامعین کے سامنے ایک بہت بڑے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا جہاں وزیر ثقافت مہمان خصوصی تھے۔ شو شام چھ بجے شروع ہوا اور بارہ بجے شب اختتام پذیر ہوا۔ سننے والے وہ لوگ تھے جن میں سے زیادہ تر قیام پاکستان سے پہلے ہی برما منتقل ہو گئے تھے۔ دوسرے شوز میمن باردری کے ساتھ میمن کلب میں منعقد ہوئے۔ وہ دور پرسکون دور تھا جو آج کل کے دور سے متضاد ہے۔ میری یادوں میں باغات، ہریالی، پگوڈے (Pagodas) اور پرندوں کی چہچہاہٹ اور کوئل کی کوکواب تک تروتازہ ہیں۔

اورینٹل سٹار انجینئر کے مالک اور موسیقی کے پروموٹر محمد ایوب اور ان کے بھائیوں محمد فاروق اور محمد یونس (اب مرحوم) سے میرا تعلق 1968ء سے ہے۔ میری طالب علمی کے دور میں انہوں نے اپنی کمپنی کا پہلا ریکارڈ میری اور مشتاق ہاشمی کی آواز میں ریلیز کیا۔ اس کے بعد کئی محافل موسیقی (مشہور شاعر ڈاکٹر صفی حسن کے ہمراہ) کا انعقاد کیا۔ پھر موسیقار خیام کی دھنوں میں ترتیب دی ہوئی میری آڈیو سی ڈی ''تیرا انتظار'' ریلیز کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صفی حسن کی شاعری پہ مبنی میری اور عابدہ پروین کی آواز میں آڈیو سی ڈی ''جاناں'' بھی ریلیز کی۔ ایک سی ڈی ''تیرے نام'' حمد و نعت پر مشتمل ہے۔

جہاں تک بیرون ملک پاکستانی موسیقی کی مقبولیت کا تعلق ہے ہم لوگ (آرٹسٹ) دیانتدار اور مستند پروموٹرز کے فقدان کا شکار رہے ہیں۔ بھارت سے ہر دور میں طائفے جاتے رہے ہیں اور بھارتی لوگ ان کے شوز جوق در جوق دیکھنے جاتے ہیں۔ پاکستانی گلوکاروں کے شوز پر بھارتی شائقین نہیں جاتے۔ ماسوائے استاد نصرت فتح علی خاں، راحت فتح علی خاں اور کسی حد تک عاطف اسلم کے شوز پر۔ وہ بھی اس لئے کہ یہ گائیک بھارت کی فلم انڈسٹری میں اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔

س موسیقی کو روح کی غذا کہا جاتا ہے۔ آپ کے نزدیک موسیقی کی کیا تعریف ہے؟

ج وہ موسیقی جو ذہن کو سکون اور روح کو راحت دے۔ وہ واقعی روح کی غذا ہے لیکن وہ

موسیقی جو فقط دھما چوکڑی پر مشتمل ہو وہ سوائے فشار خوں بڑھانے کے کوئی اور کام نہیں کر سکتی۔ برصغیر میں 1950ء سے 1990ء کی دہائیوں تک فلمی اور غیر فلمی موسیقی میں سریلے موسیقار اور گائیک موجود تھے۔ باکمال گانے کمپوز ہوئے۔ اس کام کو زندہ رکھنے کی خاطر میں نے ''میلوڈی میکرز'' 47 موسیقاروں اور میلوڈی سنگرز، 27 گلوکاروں پر مشتمل انگریزی اور اردو میں کتب تحریر کی ہیں اور ان کی اگلی کتابیں زیر تحریر ہیں۔ جن میں ان عظیم موسیقاروں اور گلوکاروں پر میری تحقیق شامل ہے جو پہلی کتب میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ پلاک (Pilac) میری کتاب فوک لیجنڈ آف پنجاب بھی شائع کر رہی ہے۔ سریلے سنگت کو پروموٹ کرنے کے سلسلہ میں پانچ سال FM95 پر پروگرام کیا اور گزشتہ تین برس سے ریڈیو پاکستان کے FM93 اور MW630 پر ہر جمعرات کی شب گیارہ بجے تک 'ہمارے موسیقار' پروگرام میں میلوڈی میکرز اور ان کے کام پر گفتگو کرتا ہوں اور ان کی موسیقی میں ترتیب دیئے ہوئے نغمے پیش کرتا ہوں۔ یہ ایک پاپولر پروگرام ہے۔

س کلاسیکل موسیقی اور جدید موسیقی میں کسے زیادہ پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

ج دونوں اصناف میں اگر سریلی گائیکی یا سازینہ ترتیب دیا گیا ہے وہ پسند ہے۔

س کیا جدید پاکستانی موسیقی عالمی سطح پہ اپنی کوئی شناخت رکھتی ہے؟

ج نہ بھارتی اور نہ ہی پاکستانی۔ جدید موسیقی اپنی کوئی شناخت بنا سکتی ہے کیونکہ مغربی دنیا یا افریقہ کے سازوں کا اپنا انداز ہے۔ ان کے پاپ گیت، ان کی اپنی زبان اور رہن سہن سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ہم ان کی نقل نہیں کر سکتے۔ ہمارا پاپ میوزک، ہماری لوک اور ہلکی پھلکی موسیقی بھی موجود ہے۔

س آپ ایک بڑے سرکاری عہدے کے ایم ڈی بھی رہے ہیں اور آپ نے سات کتب بھی تصنیف کی ہیں۔ نوکری کی بھاری ذمہ داری کے ساتھ ساتھ لکھنے کے لئے کیسے وقت نکالا؟

ج انسان کو جس کام سے عشق ہو، اس کے لئے وقت نکل ہی آتا ہے، چاہے وہ چوبیس

گھنٹوں میں مختلف اوقات پر محیط ہو۔

س کیا آپ کی کتب کے تراجم بھی ہوئے ہیں؟

ج جی ہاں، انگریزی سے اردو میں۔ میلوڈی میکرز کا بیشتر حصہ پروفیسر انیس اکرام فطرت نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

س کیا آپ کو کوئی ایوارڈ بھی ملا ہے؟

ج عوام اور دوستوں کی محبت ہی میرا سب سے بڑا انعام ہے لیکن مجھے خوش قسمتی سے انجینئرنگ اور موسیقی میں صدر پاکستان کے انعامات ملے ہیں۔ 1976ء میں صدر پاکستان کا گولڈ میڈل (انسٹی ٹیوشن آف انجینئرنگ پاکستان کی طرف سے) اور 2000ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس (تمغہ حسن کارکردگی) موسیقی میں۔

انجینئرنگ میں ڈاکٹر اے کیو خان لائف اچیومنٹ ایوارڈ بھی ملا ہے۔

س آج کل انٹرنیٹ کا دور ہے، کیا آج بھی ریڈیو کے سامعین موجود ہیں۔

ج جی ہاں، ایف ایم ریڈیو بڑے شہروں میں اور پورے پاکستان کے دیہاتوں، قصبوں اور پہاڑی علاقوں میں سنا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت روایتی اور مضبوط ذریعہ اطلاعات و مواصلات ہے۔

س صحافت موسیقی سے الگ تھلگ شعبہ ہے، صحافت کا سفر کیسے شروع کیا؟

ج میں کوئی سماجی یا سیاسی صحافت نہیں کرتا۔ میرے کالم موسیقی اور ادب پر ہوتے ہیں اور میں انگریزی زبان میں لکھتا ہوں۔ گزشتہ چند برسوں سے ڈیلی ٹائمز لاہور میں میرے مقالے شائع ہوئے ہیں۔

1986ء سے 1992ء تک میں ریاض، سعودی عرب میں نیپاک (Nespak) کا جنرل منیجر تعینات تھا۔ وہاں پر میرے ایک دوست عزت مجید، وزارت پٹرول میں مشیر کے عہدے پر فائض تھے۔ ہماری وجہ دوستی موسیقی تھی۔ جب کشور کمار، بھارتی گلوکار کی وفات ہوئی تو میں نے اس پر ایک تعزیتی کالم لکھا۔ عزت مجید نے اس کو

ڈیلی نیشن کے ایڈیٹر عارف نظامی کو بھیج دیا۔ وہ چھپ گیا۔ اس طرح میری موسیقی پر لکھنے کی کاوشیں تواتر سے اس اخبار میں چھپنا شروع ہوگئیں۔ پھر جب عارف نظامی نے اس اخبار سے علیحدگی اختیار کی تو مجھے راشد رحمان صاحب، ایڈیٹر ڈیلی ٹائمز کی طرف بھیج دیا۔ وہ دن آج کا دن اسی اخبار میں موسیقی اور ادب پر لکھتا ہوں۔

س آپ کی تین کتب لٹریچر پر ہیں۔ ان کے محرکات اور تفصیل سے آگاہی کریں۔

ج کتب بینی کا ہمارے گھر میں شروع سے ہی رواج تھا۔ ہم سب بہن بھائی انگریزی اور اردو شاعری اور فکشن کی کتابیں پڑھتے تھے۔ میرے نانا خواجہ دل محمد نے میری والدہ کو جہیز میں ایک لائبریری بھی دی تھی۔ پھر بحیثیت چائلڈ سٹار ان کے ہاں مشاعروں کی ابتدا میری آواز میں کلام اقبال یا کلام خواجہ دل محمد سے ہوتی۔ میں جب بھی کوئی کتاب پڑھتا، اس کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کر کے لکھتا۔ اب تک سینکڑوں کتابوں پر میرے تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ میری تصانیف کے نام ہیں۔

(1) سمفنی آف ریفلیکشنز (symphony of reflection)

(2) رین بو آف ریفلیکشنز (Rainbow of reflections)

(3) پرلز آف ریفلیکشنز (Pearls of reflections)

بشریٰ رحمٰن

س: تعارفی حوالے سے خاندانی پس منظر میں ابتدائی دور کا ذکر فرمائیں؟

ج: بہاولپور میں پیدائش ہوئی۔ والد کا تعلق بہاولپور سے جبکہ والدہ خاص لاہور سے تھیں۔ صحرائی فضاؤں میں پلی بڑھی وہیں پر پرورش ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں سے حاصل کی۔ ہمارے بزرگوں کے سلسلے روحانیت سے جا ملتے ہیں وہاں ایک معروف بزرگ ہیں ''حضرت دیوان چاولی مشائخ'' ہم ان کے سلسلے میں سے ہیں وہ ہمارے جدامجد لگتے ہیں۔ انہیں کی بدولت ہمارے خاندان میں روحانیت کا سلسلہ چلا جو والد صاحب کو ملا اور پھر ان کی وجہ سے تھوڑا تھوڑا ہم بہن بھائیوں کے حصہ میں آیا جس کی بدولت تصوف میں دلچسپی ہوگئی۔ روحانیت پیدائشی ہے یہ نہیں کہ ہم نے کہیں سے اکتساب کیا ہے۔ والدہ شاعرہ تھیں۔ قدرتی آواز بہت خوبصورت تھی پہلے غزلوں کا شوق وذوق رہا اور کہتی رہیں مگر جب اباجی کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی تو صوفیانہ اور نعتیہ کلام کہنا شروع کردیا۔ اباجی بہت بڑے عالم دین تھے۔ پیشے کے اعتبار سے طبیب ہوتے ہوئے کسی زمانے میں نواب آف بہاولپور کے دربار میں شاہی طبیب لگے ہوئے تھے۔ حکیم اجمل خان کے خاص الخاص شاگردوں میں سے تھے۔ اسی حوالے سے حکیم سعید سے دوستی تھی اور حکیم سعید مجھے بیٹی کی طرح چاہتے تھے۔ پرانے وقتوں میں جو طبیب ہوا کرتے تھے جن کو ہم حکیم کہتے ہیں ان کے ساتھ سچ مچ کی حکمت بھی ہوا کرتی تھی۔ حکیم عقل ودانائی کا پیکر ہوتا ہے۔ تبھی اقبال کہتے ہیں:

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

اس وقت کے حکیموں کے ساتھ حکمت کی تمام تر نسبتیں وابستہ ہوتی تھیں۔ تصوف کی ہوتی تھیں۔ سلوک و طریقت کی ہوتی تھی تزکیۂ نفس کی ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی انگلیوں میں اتنا مسیحائی اثر ہوتا تھا کہ وہ نبض پر انگلی رکھ کر مرض ڈھونڈ لیتے تھے۔ میرے ابا جی اس قسم کے حکیم تھے، طبیب تھے، دانا تھے، بینا تھے، عالم دین تھے، بہت باذوق شخصیت ہونے کے ساتھ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی جس میں ہر زبان کی کتابیں کثرت سے موجود تھیں۔ انہیں کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے ایک عربی کی کتاب ترجمہ کر کے ''دربار رسولؐ کے فیصلے'' تحریر کی تھی۔ بڑی خوبصورت کتاب ہے جولاء کے طالب علموں کو کافی عرصہ تک لگتی رہی۔ جب امی سے شادی ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ لاہور سے ایک خوبصورت نازک سی لڑکی آئی ہے اور شاعری کرتی ہے تو سرپرستی کرتے ہوئے اتنی حوصلہ افزائی کی کہ وہ وہاں باقاعدہ شاعری کرتی رہیں۔ وہ ہمارا بچپن کا زمانہ تھا اور ہم نے دیکھا کہ ان کی چیزیں رسالوں، اخبارات میں چھپتی تھیں جو بڑی بات تھی کیونکہ بہاولپور تقسیم پاک و ہند سے پہلے کلیتاً اسلامی ریاست ہوتی تھی۔ اس کی الگ زبان اور ایک الگ کلچر تھا۔ جب پاکستان بنا تو سب سے پہلے بہاولپور نے ہی الحاق کیا تھا۔ یہ ساری قبل از تقسیم کی باتیں ہیں۔ ہمارے ابا جی اور امی جی بتایا کرتی تھیں کیونکہ میری پیدائش پاکستان بننے کے بعد ہوئی۔ ہم پانچ بہنیں اور چار بھائی ایک بڑے گھر میں رہتے تھے۔ جس گھر میں زیادہ بہن بھائی ہوں اس گھر کا سیٹ اپ ہی جداگانہ ہوتا ہے۔ آج کل لوگ کہتے ہیں کم بچے خوشحال گھرانہ لیکن ہم نے اس وقت دیکھا کہ زیادہ بچوں کے ساتھ خوشحال گھرانہ ہوتا ہے۔ اس میں ادب و آداب، نشست و برخاست اور خوبصورتیاں جو ہوتیں وہ دوسرے کا حق دینا، اپنا فرض ادا کرنا، دوسرے کے حق کا احترام کرنا، آدھی روٹی تمہاری ہے آدھی بہن کی ہے یہ بڑے بھائی کے لئے رکھ دو، یہ چھوٹے بھائی کے لئے ہے۔

اُٹھواس جگہ سے، یہ بستر اس کا ہے۔اس کی چادر بدلو،اس کے کمرے میں کیوں گھسی بیٹھی ہو، بھائی کی کتابیں ٹھیک کرو، بہن کی کتابیں درست کرو، وہ آجائے گی تو ابھی لڑے گی، اُٹھو تم چھوٹی ہو تم کرو، تم بڑی ہو تم اس کو معاف کر دو۔ یہ کتنی خوب صورت باتیں ماں باپ سکھاتے تھے۔ میں گھر میں چھوٹی تھی بھاگ بھاگ کر سب کے کام کرتی، سب کی باتیں سنتی، چھوٹے ہونے میں تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن بہت سے فائدے بھی ہوتے ہیں جو مجھے بڑے ہو کر پتہ چلے۔ بچپن سے ہی مشاہدہ کرنے کی عادت، بڑوں کی بات سننے کی عادت، سنجیدگی سے سوچنے کی عادت، مار پڑ جاتی تو گھنٹوں رونے کی عادت، دل کو دُکھ پہنچتا تو کسی کونے میں بیٹھنا اور پھر ڈائری لکھنا، جہاں بہت سارے بہن بھائی ہوتے ہیں، جہاں بہت سارے برتن ہوتے ہیں، وہ ٹکراتے ہیں، خراشیں پڑتی ہیں، خراشیں مٹتی ہیں، چیزیں بنتی ہیں، چیزیں مٹتی ہیں، شعور اور لاشعور کی چیزیں جاگتی ہیں، میں یہ نہیں کہتی کہ ساری دنیا بہت سارے بچے پیدا کرلے، میرا کہنا صرف یہ ہے کہ ہماری تربیت اس طریقے سے ہوئی۔ ابا جی کی بہت بڑی لائبریری تھی اور ان کو بہت شوق تھا کہ میرے بچے جو بھی بنیں مگر ان میں لکھنے کی صلاحیت ہو، پھر ہماری ہفتہ وار نشستیں کرتے کہ سب میری لائبریری میں بیٹھیں گے۔ وہ اچھی کتابیں نکال کے رکھ چھوڑتے، فقہ وحدیث کی کتابیں، تصوف کی کتابیں، سیرت النبی کی کتابیں، سعادت دارین جیسی کتابیں اور کہنا کہ یہ چیزیں فلاں سنائے گا۔ ہمارے سارے بہن بھائی پڑھ کر سنانے سے بہت بھاگتے تھے کیونکہ مشکل زبان ہوتی تھی۔ میں قابو آجاتی، مجھے سنانے کا بڑا مزا آتا۔ ابا جی آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہوتے اور سارے بہن بھائی ایک ایک کر کے بھاگ جاتے، بشریٰ بیٹھی ہے اور سنا رہی ہے، اس لئے بشریٰ سنا رہی ہے کہ اسے ابا جی سے شاباش لینے کا بڑا شوق تھا۔

س کیا آپ نے بچوں کو اپنی فیلڈ میں لانے کی کوشش کی اور وہ آئے؟

ج میں نے کبھی اپنا شوق اپنی خواہش اپنے بچوں پر مسلط نہیں کی۔ جس بچے کا جو شوق تھا میں نے اسے اس فیلڈ میں بھیج دیا۔ ایک بچے کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی اس نے کہا

نہیں بننا، میں نے کہا نہ بنو۔ جو تم بننا چاہتے ہو وہ بن جاؤ۔ بچوں نے اپنی مرضی کا فیلڈ اختیار کیا۔ ادیب کوشش سے نہیں بنائے جاتے، میرا بھی ماحول ویسا ہی تھا لائبریری تھی، کتابیں پڑھنے کو دیتی تھی مگر وہ کہانی نویس نہیں بنے، نہیں بنے تو کوئی حرج نہیں۔ میرے ابا جی ادیب نہیں تھے ماں شاعرہ تھی مگر میں ادیب بن گئی۔ ہمیں معلوم نہیں ہوتا ان کی منزل کہاں ہے۔

میرے بیٹے نے امریکہ میں تعلیم مکمل کر کے سافٹ ویئر کا کاروبار شروع کر دیا۔ آج مجھے فخر ہے کہ پاکستان کی ابتدائی کمپنیوں میں سافٹ ویئر کی کمپنی ہے وہ لفظوں سے کھیل رہا ہے اس نے سب سے پہلے قائداعظم کی ویب سائٹ بنائی پھر علامہ اقبال کی بنائی۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ آپ قائداعظم سے محبت کرتی ہیں اور علامہ اقبال کے اشعار ہر وقت ہمیں سناتی رہتی ہیں۔ وہ چیز آ جاتی ہے وقت کے ساتھ صورت بدل جاتی ہے۔ اب میرے بیٹے نے اُردو کا ایک نیوز پیپر نکالا ہے انٹرنیٹ پر ''ہائے پاکستان'' آغاز میں ہی میرے ناول اور کالم دینے شروع کر دیئے تھے۔ اب آڈیو ویڈیو کا زمانہ ہے تو میری آواز وہاں جاتی ہے ساری دُنیا میری آواز سننا چاہتی ہے میں اس بات پر فخر محسوس کرتی ہوں بے شک میں نے لکھا تھا، چھاپا تھا لیکن میری آواز تو دنیا کو میرے بیٹے نے سنوائی۔ میرے لئے انٹرنیٹ پر میری ویب سائٹ میرے بیٹے نے بنائی۔ یہ انہیں لفظوں اور حرفوں کی لذت ہے جو میں نے بچپن میں اس کے اندر ڈالی تھی یہ لفظ کو ہوا کے زور پر لہروں کے زور پر دور پہنچانے کی لذت کہاں سے لی اس نے، ماں سے ہی لی۔

س آپ کی نسل اور اب کی نسل میں ایک جنریشن گیپ آیا ہے۔ اس کو آپ کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

ج جنریشن گیپ تو ہر زمانے اور ہر صدی میں ہوا ہے۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے اور یہ بالکل نیچرل ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی دیکھ لیں۔ جاہل نسلوں کو ہی دیکھ لیں۔ یہ گیپ ہی تو ہے۔ ایک زبان میں اسے ارتقا بھی کہتے ہیں۔ ایک زبان میں اس کو تبدیلی بھی کہتے ہیں اور اسی کو ہم جنریشن گیپ بھی کہتے ہیں۔ جنریشن گیپ اس واسطے آتا ہے کہ تمیں

برسوں میں دنیا بدل چکی ہوتی ہے۔ جیسے اب الیکٹرانک کا دور ہے کمپیوٹر آ چکا ہے۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ ہماری نوجوان نسل کتاب نہیں پڑھنا چاہتی۔ وہ کمپیوٹر سے سب کچھ پڑھنا چاہتی ہے۔ اس میں اور اس میں نقصان ہے۔ اس کا اندازہ ایک صدی کے بعد چلے گا۔ ہمیں تختی لکھوائی جاتی تھی۔ قلم سے لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ اس نسل کو کہا جاتا ہے کہ دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ وہ جو دیکھا جاتا ہے وہ ذہن سے نکل جاتا ہے۔ یہ بالکل ایک فلم کی طرح ہے۔ پوری کہانی آپ کو یاد نہیں رہتی۔ آپ دیکھتے جاتے اور ذہن سے نکلتا جاتا ہے لیکن جو لکھا ہوا ہے وہ ذہن سے کبھی نہیں نکلتا۔ تو یہ فرق آ گیا ہے۔ اسی طرح تعلیم میں فرق پڑا تو تربیت میں فرق پڑ گیا۔ پہلی نسل کی باقاعدہ تربیت ہوئی ہے۔ ماں بیٹیوں اور باپ بیٹوں کی تربیت کیا کرتا تھا۔ یہ دونوں کا فرض تھا۔ بڑے بزرگ الگ سے تربیت کیا کرتے تھے۔ اس طرح لڑکیوں کو تیار کیا جاتا تھا کہ انہوں نے ایک نئے گھر میں ایک مرد کے ساتھ رہنا ہے۔ جو باپ اور بھائی سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تو یہ تربیت دی جاتی تھی۔ اب یہ فرق پڑا ہے کہ اب بچوں کی زندگی سے تربیت نکل چکی ہے۔ نہ ماں باپ نہ اساتذہ اور نہ ہی امامِ مسجد تربیت کر رہے ہیں۔ دوسری تبدیلی یہ آئی ہے کہ اب ماں اور باپ دونوں نوکری کرنے لگ گئے ہیں۔ ہمارے ہاں وومن ایمپاورمنٹ کا نعرہ لگ گیا ہے لیکن اس کے مقاصد، محاصل اور ردِعمل کے بارے میں کسی کو معلوم ہی نہیں ہے کہ کیا ہوگا۔ یورپ اور امریکہ میں جنگوں کے بعد عورتیں باہر نکل آئیں اور خود کفیل ہو گئیں لیکن اُس سے یہ ہوا کہ خاندان ٹوٹ گئے لیکن اب وہاں کی عورت گھر کو واپس لوٹ رہی ہے۔ میں عورت کے فیشن یا کام کرنے کی مخالف نہیں ہوں لیکن صرف گھر نہیں ٹوٹنے چاہئیں۔

س اس کا مطلب ہے کہ نئی نسل تعلیم یافتہ تو ہے لیکن تہذیب یافتہ نہیں ہے۔ اس کا مستقبل پر کیا اثر پڑے گا۔

ج مستقبل پر تو اس کا بہت برا اثر پڑنے والا ہے۔ میں نے اسمبلی میں بھی دیکھا ہے کہ نوجوانوں نے ڈھیروں ڈگریاں تو اُٹھائی ہوئی ہیں لیکن ان کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔

اُٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ ہم اس طرح جنگلی بن جائیں گے۔ میں نے دوسرے ممالک میں ایسا نہیں دیکھا۔ وہ لوگ تہذیب یافتہ ہیں۔ ان کو دوسروں کے مراتب کا معلوم ہے۔ مثلاً جاپان میں جائیں تو وہاں کی تہذیب آپ کو حیران کر دے گی۔ میں نے وہاں دیکھا ہے کہ اگر ڈنر یا کوئی اور تقریب ہے مرد اکٹھے ہوں تو عورتیں نہیں بولتیں اور ان میں سے بھی سب سے بڑی عمر کا مرد پہلے بات کرتا ہے اور سب سے چھوٹے مرد کو جب اجازت دی جائے وہ تب بات کرتا ہے۔ تو کیا یہ تہذیب آج ہی کے دور میں وہاں نہیں ہے۔ چائنا میں بھی میں نے ایسا ہی دیکھا۔ تہذیب یہ نہیں کہ آپ باپ کو تو کر کے بات کرنا شروع کر دیں۔ ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کریں۔ ارتقا یہ نہیں ہے کہ ادب آداب ہی بھول جائیں۔ زبان کی شائستگی بھول کر اپنے باپ کو تو کہہ کر بلانے لگو تو یہ تہذیب نہیں ہے لیکن پہلی والی تہذیب کو بھی ہماری مائیں ہی واپس لائیں گی۔

س جب وقت کے ساتھ میڈیم چینج ہو جاتا ہے جیسے چراغ کی جگہ بلب آ گیا۔ اسی طرح کتاب کا میڈیم بدل گیا ہے تو آپ اس کے حق میں ہیں یا خلاف ہیں؟

ج نہیں میں ارتقاء کے خلاف نہیں ہوں۔ جو چیز آتی ہے وہ آ کر رہتی ہے۔ بجلی پہلے آسمان پر چمکتی تھی تو لوگ اس کی پوجا کرنے لگے۔ جب زمین پر آئی تو ہم نے اس سے ضرورت پوری کی۔ تو جو تبدیلی کمپیوٹر پر آ رہی ہے یہ بری بات نہیں ہے لیکن ارتقا کو اُس جگہ پہ روک دینا چاہیے جہاں انسان اور انسان کے اعضا بے کار ہونے کا خدشہ ہو۔ جیسے میں پڑھ رہی تھی کہ کام کرنے کے لیے روبوٹ تیار ہوں گے تو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے آفٹر ایفیکٹس اور ڈی فیکٹس ضرور پیدا ہونے لگیں گے۔ اُس سے پہلے ہی دانشوروں کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

س کہا جاتا ہے کہ بیس سال کے بعد اُردو کے ختم ہو جانے کا خدشہ ہے اور صرف سوشل میڈیا پر رومن میں رہ جائے گی۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج دیکھیں خواہ رومن میں لکھی جانے لگے لیکن آخر ہے تو اُردو زبان ہی نا۔ اس کا

مطلب ہے کہ ختم تو نہ ہوئی۔ یاد رکھیں کوئی زبان اتنی جلدی ختم نہیں ہوسکتی۔ اُردو دنیا کی پانچویں بڑی زبان ہے اور کئی ممالک میں سنی اور سمجھی جاتی ہے۔ برما، بنگلہ دیش اور مڈل ایسٹ میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ خانہ کعبہ اور حرم شریف کے اندر اردو بولی جاتی ہے۔ ہدایات اُردو میں لکھی ہوئی نظر آئیں گی۔ وہ مخاطب بھی آپ سے اردو میں ہوں گے۔ سعودیہ میں بورڈز، انگلش، عربی اور اردو میں نظر آئیں گے۔ اس لحاظ سے تو تیسری بڑی زبان ہوئی۔ یعنی دنیا بھر سے آنے والے لوگوں کی بڑی تعداد اس زبان کو سمجھتی ہے۔ زبانیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ ہمارے بورڈز پر انگلش تو صرف دوسرے ممالک کی کاپی ہے۔ یہ ٹرینڈ تو کچھ عرصہ بعد ختم ہوجائے گا۔

س بچپن میں ہم اپنی پاکٹ منی سے کتاب خریدتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کتاب اور پڑھنے والے کا دور ختم ہوجائے گا؟

ج ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اگر کتاب کا دور ختم ہو جانا ہوتا تو پاکستان جیسے بدذوق ملک میں آپ کو اتنے بڑے بڑے کتب خانے نظر نہ آتے۔ ادیب تو ہر زمانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ ادیب کتاب لکھے گا تو وہ کمپیوٹر پر جائے گی کتاب نے تو ہر دور میں ہونا ہے۔ اب انڈیا کے ایک شخص نے مجھے پاکستان بننے سے قبل انڈیا میں بننے والی مسلم ہسٹری کی فلموں پر لکھی کتاب بھیجی ہے جس کا پیش لفظ میں نے لکھا ہے۔ اب ایک شخص امریکہ میں بیٹھ کر یہ کتاب مجھے بھیجتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہے۔ کتاب کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ چاہے کتاب الیکٹرانک میڈیا میں ہو تو اس کے لیے انسان کا دماغ ہی ہے جو اسے تخلیق کر کے کمپیوٹر میں فیڈ کرتا ہے۔ کمپیوٹر تو ایسا نہیں کرسکتا۔

س کیا اردو ادب بین الاقوامی ادب کے معیار کے مطابق ہے؟

ج پاکستان میں بہت خوبیاں ہیں لیکن کس نے اسے تسلیم کیا ہے؟ پاکستان سے تو دوسرے خوفزدہ رہتے ہیں۔ ہمارا ہمسایہ ہی ہماری نفی کرتا رہا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہاں بڑا ادب تخلیق نہیں کیا گیا۔ یہاں بڑا ادب تخلیق ہوا ہے لیکن ہماری اپنی ادیب برادری کے

اندر بھی ایک دوسرے کے لیے حسد اور جلن بہت زیادہ ہے۔ ہم سے کیا کبھی کسی نے کسی کو پیش کیا ہے؟ اب شرمین عبید چنائے کو دیکھیں وہ یہاں کی نہ تھی وہ باہر سے آئی۔ وہ کام کیا اور اسے ایوارڈ ملا۔ یہاں تو کوئی کسی کو پیش نہیں کرتا۔ کوئی اپنے سوا کسی کو ادیب ماننے کو تیار ہی نہیں۔ علامہ اقبال کے دور میں ان کی بھی مخالفت ہوئی۔ اگرچہ شہرت ان کا نصیب تھی۔ شاعری اور ادب تو اعلیٰ تخلیق ہوتا رہا ہے۔ شاعر شاعر کو آگے نہیں کرنا چاہتے۔ ہم خود ادبی استحصال کر رہے ہیں۔ ایک چھوٹے سے صدارتی ایوارڈ کے لیے نجانے لوگوں کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پاکستان میں ورنہ بہت اچھی شاعری بھی ہوئی اور اچھا ادب بھی تخلیق ہوا۔

س آپ کے دور میں نامور مصنفین کی طویل فہرست نظر آتی ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ موجودہ دور میں بڑے ادیب نظر آتے ہیں؟ یا اعلیٰ شاعر ہیں؟

ج ہر دور میں بڑا ادیب موجود ہوتا ہے۔ نئی نسل کو آسانیاں دستیاب ہیں۔ ادباء اور ٹی وی چینلز کی بھرمار ہے لیکن انہی میں اچھا لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ اگرچہ بہت سے غیر معیاری لکھنے والے بھی ہیں۔ نئی نسل تن آسان ہوگئی ہے۔ لکھتے ہی معروف ہونا چاہتے ہیں۔ ہم نے کئی سال اپنے ادیب ہونے کا بتایا ہی نہیں۔ میرے ڈراموں کے چربے بھی چینلز نے پیش کیے ہیں۔ اب لوگ دوسروں کی چیزیں چرا لیتے ہیں۔

س جب ناول پہ ڈرامہ بنایا جاتا ہے تو کیا وہ رائٹر کی تحریر کے ساتھ پورا انصاف کر پاتے ہیں؟

ج کچھ چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ کچھ سوچنے اور کچھ تصوراتی ہوتی ہیں۔ لاہور والوں کی بجائے کراچی والوں نے میرے ناولز پہ اچھے ڈرامے بنائے۔ کچھ چیزیں ناظر دیکھنا چاہتا ہے اُسے پروڈیوسر اُسی طرح تھوڑی سی تبدیلی سے پیش کرتا ہے۔ اس لیے معمولی تبدیلی کو محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

س اسٹیج ڈراموں پہ جگتیں اور گھٹیا زبان استعمال کر کے قوم کا مزاج بگاڑا جا رہا ہے۔ آپ اس کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

ج: ہم نے تو شروع میں بھی کہا تھا کہ یہ نہ کرو۔ میڈیا کا کام تفریح مہیا کرنا، معلومات دینا اور کردار کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے زمانوں میں ڈرامہ اور فلم میں ضرور کوئی نہ کوئی گڈ میسج ہوا کرتا تھا اور مقصد کے بغیر کوئی فلم نہیں ہوا کرتی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر کسی ادیب کی تحریر میں بھی کوئی مقصدی پیغام نہیں ہے تو وہ رائیگاں ہے۔ ہر میڈیم اور صنف میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ کیونکہ انسان ان چیزوں سے بہت سیکھتا ہے۔ ایک دن قوی صاحب نے مجھے بتایا کہ میر اگلن ڈرامہ دیکھ کر ہمارے ہمسایہ میں لڑنے والے میاں بیوی کی آپس میں صلح ہوگئی۔ لگن کی آخری قسط میں لڑکی پر اس انجام نے اچھا اثر ڈالا۔ تو دیکھیں میڈیا ہمارے مزاج پر کتنا اثر انداز ہوتا ہے۔ اب ڈراموں میں طلاق کو عام دکھایا جاتا ہے۔ عام زندگی میں اسی طرح طلاق کی شرح بھی بڑھتی جارہی ہے۔ عورتیں ان ڈراموں فلموں کا گہرا اثر لیتی ہیں لیکن بعد میں پچھتاتی بھی ہیں۔ میڈیا خاص کر اسٹیج ہمارا محاورہ ہماری زبان تباہ کررہے ہیں۔ بچوں کی تربیت خراب ہورہی ہے۔

س: ادبی ادارے کیا ادب کے حوالے سے ٹھیک کام کررہے ہیں؟

ج: مجھے تو کسی ادارے کا ممبر ہونے کا اعزاز حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کیا معلوم کیسا کام ہورہا ہے۔ اگرچہ جب سے سیاسی وابستگیاں قائم ہوئی ہیں کوئی ادارہ ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ جنہوں نے حکومتوں کے لیے لکھا اُنہی کو نوازا بھی گیا۔ ادارے لوگوں کے لیے ہوتے ہیں۔ جنہوں نے کام کر کے دکھایا ہو ان کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے اور سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہوکر کام کرنا چاہیے۔

س: آپ نے خواتین کے حوالے سے بہت لکھا۔ کیا آپ بھی سمجھتی ہیں کہ عورت کا استحصال ہوا ہے؟

ج: عورت کا استحصال تو ہمیشہ ہوا ہے اور نہ صرف ہمارے معاشرے میں بلکہ دوسرے معاشروں میں بھی ہوا ہے۔ ان کا ادب بھی پڑھ کر دیکھیں وہاں بھی ایسے حالات ہیں۔ اب کچھ فیصد کمی ہورہی ہے۔ اگر عورت تعلیم حاصل کرے اور اپنے حقوق کے علاوہ فرائض کو بھی

سمجھ لے تو بہتری آئے گی۔ عورت بھی بے مہار باہر نکل چکی ہے۔ جبکہ مرد اسی مقام پر کھڑا ہے۔ اُسے پتہ ہونا چاہیے کہ میرے حقوق و فرائض کے درمیان آخر استحصال کہاں ہے۔ بہت ساری عورتیں مردوں کا استحصال بھی کرتی ہیں۔

س وراثت میں عورت کو حصہ نہیں ملتا۔ اس سسٹم میں آج بھی کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ ایسا کیوں ہے؟

ج جب میں پنجاب اسمبلی میں تھی تو وہاں میں نے پانچ سال لگا کر ایک قانون بنایا جس کی بہت مخالفت بھی ہوئی۔ یہ قانون عورت کو وراثت میں حصہ دینے کے حوالے سے تھا۔ اس پر میں نے بہت محنت کی۔ عورتوں کو برقعہ پہنا کر جعلی بہن بنا کر بیان دلوایا جاتا تھا۔ میں نے شق شامل کروائی کہ عورت کی پہلے پہچان ہونی چاہیے۔ مزید اور بھی میں نے ترامیم کروائیں۔ یہ ۹۰ء کی بات ہے لیکن آنے والی حکومتوں نے پچھلے کئی کام ختم کر دیے۔ تو اس پر کوئی خاص عمل نہ ہو سکا۔ اب نہ جانے میری بتائی ہوئی قانون سازی کا کیا حشر ہوا ہوگا لیکن عورت کو شرعاً اُس کا حصہ اور حق ضرور ملنا چاہیے۔ حصہ لینے کے لیے عورت کو بہادر بننا ہوگا۔ ان سے زبردستی بیان بھی دلوائے جاتے ہیں اور ان کو دھمکیاں بھی لگائی جاتی ہیں۔ دھمکیاں ہمیشہ گھٹیا اور بڑے کمینے بھائی دیتے ہیں۔ اچھے بھائی ایسا نہیں کرتے۔ والدین کو وصیت ضرور کرنی چاہیے کہ کس کو کیا ملنا چاہیے یا اپنی زندگی میں اولاد کو دینا چاہیے۔ تا کہ بعد میں ناانصافیاں نہ ہوں۔ اگر والدین ہی ناانصافی کریں تو پھر اس کا کوئی حل نہیں ہے اور یہ المیہ ہے۔

س کیا تعلیم یافتہ ہو کر بھی عورت کا استحصال ہوتا ہے تو کیا وہ دوہری اذیت کا شکار ہو جاتی ہے؟

ج دوہری اذیت تو عورت کی قسمت میں لکھی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ دوہری اذیت کا ہی شکار رہی ہے۔ تو یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔

س آپ نے ایک لمبا عرصہ سیاست میں گزارا۔ آپ پاکستانی سیاست کو کس نظر سے

دیکھتی ہیں؟

ج جیسی ساری دنیا میں سیاست ہو رہی ہے ویسی ہی یہاں بھی ہو رہی ہے۔ صرف یہاں پر کرپشن زیادہ ہوگئی ہے۔ بار بار سیٹوں پر آنے سے خرابیاں پیدا ہوئیں۔ سیاست کو وراثت نہیں بننا چاہیے۔ جب آپ نے اس کو وراثت کر دیا تو وہ تو بادشاہت بن گئی۔ صرف یہی خرابی ہے ہماری سیاست میں۔ ایک شخص آتا ہے اور سارے خاندان کو وزارتیں دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آتے ہیں اور الاؤنسز لے کر چلے جاتے ہیں۔ ہر دفعہ کم از کم پچاس فیصد نئے لوگ آنے چاہئیں۔ تاکہ جو آئیں وہ پانچ میں سے دو کام تو اچھے کر کے جائیں۔

س آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ زندگی کا طویل عرصہ گزارا۔ ان کے گزر جانے کے بعد آپ پہلے والی زندگی اور اب کی زندگی میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

ج فرق تو آپ کو مجھے دیکھ کر ہی نظر آ رہا ہوگا۔ آپ اگر ایک طوطا پالتے ہیں اُس سے محبت کرتے ہیں اور بولنا سکھاتے ہیں ایک دن اچانک پنجرہ کھلا رہ جاتا ہے اور بلی اُس طوطے کو کھا جاتی ہے تو آپ سارا دن اس پنجرے کو ہی دیکھ کر روتے رہتے ہیں۔

جب جانور سے اتنی محبت ہو سکتی ہے۔ جیون ساتھی سے تو جنم جنم کا ساتھ ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑا خلا ہے جو ساتھی کے چلے جانے کے بعد زندگی میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ کا بہت احسان ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا بہت زیادہ موقع دیا۔ ضعیفی کی عمر میں پہلے کسی ایک کو تو جانا ہوتا ہے۔ اگرچہ رفاقتیں کبھی ضعیف نہیں ہوتیں ہمیشہ جوان رہتی ہیں۔ میرے شوہر نے ہمیں بہت اچھی زندگی دی۔ مجھے لکھنے کی اجازت دی۔ سیاست میں بھیجا۔ انہوں نے مجھے بشریٰ رحمٰن بنا دیا۔ میں ان کی بہت خدمت کرتی تھی۔ کئی سال وہ بیڈ پر رہے اور میں ہمیشہ آس پاس موجود رہتی تھی۔ مجھے ان کی عادت پڑ گئی تھی۔ ہر وقت ان کے کمرے میں ان کے اردگرد موجود رہنا اور جب وہ کمرا میری زندگی سے نکل گیا تو بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ بیڈ پہ پڑا ہوا وہ شخص بھی میرا سہارا تھا۔ گھر میں ان کا وجود محسوس ہوتا تھا۔ میں کبھی نہیں ڈرتی تھی لیکن اب ڈرتی ہوں۔ مرد جوان ہو یا بوڑھا وہ عورت کا سہارا ہے۔

بشریٰ اعجاز

س اپنا اصل نام اور خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج ماں نے بشریٰ خاتون نام رکھا۔ ہم ساری بہنوں کے ناموں کے ساتھ خاتون لکھا جاتا تھا۔ سکول میں بھی یہی نام تھا۔ شادی کے بعد بشریٰ اعجاز ہوگئی اور اب تک اسی نام سے جانی جاتی ہوں۔ سرگودھا کے علاقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ رہائش کافی عرصہ سے لاہور میں ہے۔ 18 جون 1959ء تاریخ پیدائش ہے اور مجھے کبھی اپنی عمر چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

س آج کل خواتین اپنے اصل نام سے اپنی شناخت چاہتی ہیں۔ کیا آپ کو بھی یہ خیال آیا؟

ج اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ میری کم عمر میں شادی ہوگئی۔ بچے ہوئے اور ان کو پالتی رہی۔ اسی دوران لاہور شفٹ ہوگئی۔ میرا بیٹا کیمبرج میں تھا جب میں نے میٹرک کیا۔ ایف اے اور بی اے پرائیویٹ کیے۔ اسی دوران لکھنے کا بھی آغاز ہوا۔ لکھنے سے قبل جب میں گاؤں میں رہائش پذیر تھی، پڑھنے کا بہت شوق رکھتی تھی۔ تب آج کے اور اس وقت کے حالات میں بہت زیادہ فرق تھا۔ میں اپنے وقت کا بہترین استعمال کتابیں پڑھ کر کیا کرتی تھی۔ بچپن کتابوں کے ساتھ ہی گزرا ہے۔ اس زمانے کے بچوں کی یہ سب سے بڑی تفریح تھی۔ کتابوں سے شناسائی پرانی ہے۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے جب زندگی میں بہت آگے نکل آئی تو اسی دوران حج کیا۔ تب میں میٹرک پاس تھی۔ واپسی پر میں نے حج کی روئیداد لکھی۔ ارض پاک کے نام سے یا آپ اسے حج کا سفرنامہ کہہ سکتے ہیں۔ میں شروع سے ڈائری لکھا کرتی تھی۔ یہی لکھنے کا آغاز تھا۔ اس دوران میں نے خود کو دریافت کیا کیونکہ میں وہ عورت

تھی جسے خود کو پہچاننے سے قبل عملی زندگی میں ڈال دیا گیا تھا۔ پہلی کتاب کی اشاعت کے وقت تک میرا رائٹر بننے کا کوئی خیال نہیں تھا لیکن میں شروع سے ہی اردو شاعری کرنا چاہتی تھی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آج تک میری اردو شاعری کی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ مختلف ادبی جرائد میں اپنی تحاریر بھیج دیا کرتی تھی۔ بس یہیں سے میری پہچان بن گئی۔ آپ کے حرفوں کو جب اعتبار ملتا ہے تو آپ کو اپنی پہچان بھی مل جاتی ہے اور یہ پہچان سوچ کر نہیں بنائی۔

س آپ نے پنجابی شاعری بھی کی اس طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج میں شروع سے پنجابی شوق سے لکھتی اور پڑھتی تھی۔ میں بزرگوں کے کلام کو شوق سے پڑھتی تھی۔ اسی سے لکھنے کی لگن بھی پیدا ہوگئی۔ شروع سے ہی سوچنا اور تصوف کی طرف گہرا رجحان تھا۔ اللہ کو جاننے کی طلب تھی۔ اسی طلب نے شاید لکھنے پر بھی مجبور کر دیا۔

س آپ کی پنجابی کی پہلی کتاب کونسی ہے؟

ج میری پنجابی کی پہلی کتاب "پیاں بھار" ہے۔ پھر "بھلیکھا" آئی اور حال میں ایک نیا پنجابی مجموعہ شائع ہوا ہے اور جلد ہی اردو کا مجموعہ کلام بھی آئے گا۔

س نثر لکھنے کا خیال کیسے آیا؟

ج میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ میں نثر لکھوں گی۔ میں تو صرف ڈائری لکھا کرتی تھی اور ڈائری بھی اپنے کتھارسس کے لئے لکھا کرتی تھی۔ اس کے پیچھے افسانہ نگار یا ناول نگار بننے کی خواہش کبھی نہیں تھی۔ بس ایک دن کہانی لکھی اور ڈاکٹر وزیر آغا کو اوراق میں بھیج دی۔ اور یہ سوچا کہ اگر یہ نثر قبول ہوگئی تو لکھوں گی ورنہ چھوڑ دوں گی۔ یہ کہانی نہ صرف چھپی بلکہ اسے بہت زیادہ سراہا گیا۔ اس زمانے میں سارہ ہاشمی کا ایک ادبی حلقہ تھا اور اس زمانہ کے تمام نامور رائٹرز اس وقت موجود تھے۔ اس حلقہ میں دوسری کہانی پڑھی۔ اگر چہ نہ اس وقت کوئی استاد تھا نہ کوئی راہنمائی کرنے والا تھا۔ بس ایک کیفیت میں میں لکھ ڈالتی تھی کیونکہ میں نے آج تک جو لکھا ہے، کیفیت میں لکھا ہے۔ جب حلقہ میں یہ کہانی میں نے پڑھی تو

اس کی اتنی داد، شفقت اور حوصلہ افزائی ملی کہ اشفاق صاحب نے بعد میں اس پر تفصیلی نوٹ لکھا۔ جس کو میں نے اپنے دوسرے مجموعہ ''آج کی شہرزاد'' میں شامل بھی کیا ہے۔ پھر ایک تعریفی خط احمد ندیم قاسمی صاحب کی جانب سے موصول ہوا۔ میری طبیعت ایسی تھی کہ اتنی تعریف پر میں شرمندگی سی محسوس کرتی۔ اتنے بڑے لوگوں کی صرف ایک کہانی پر اتنی تعریف میرا اعزاز ہے۔ لیکن اس سے میری اتنی حوصلہ افزائی ہوئی کہ پھر میں نے تواتر سے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ پھر یہ کہانیاں اس وقت کے بڑے پرچوں میں چھپنے لگیں۔ اسی دوران افسانوی مجموعہ بھی آ گیا اور ساتھ پنجابی شاعری کا بھی۔

س اردو شاعری کی کتاب اتنی لیٹ کیوں ہوگئی؟

ج میں آپ کو بتاؤں کہ اردو شاعری میں نے بہت لکھی۔ اور اگر ایک لفظ بھی لکھا ہے تو وہ چھپا ہے۔ میں خود سمجھ نہیں پائی کہ جس کتاب کو میں سب سے پہلے چھاپنا چاہتی تھی وہ سب سے زیادہ لیٹ کیوں ہوگئی۔ شاید میں دوسری کتابوں میں اتنی زیادہ الجھی رہی کہ ادھر دھیان کم رہا۔ دوسرے اردو شاعری کی اتنی زیادہ کتابیں آ رہی ہیں تو میں آرام اور حوصلے سے اس کو چھاپنا چاہتی تھی۔ میں اور یاسمین حمید پی ٹی وی کے مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ وہیں سے اردو شاعرہ کے طور پر پہچان بھی ملی۔ اگرچہ میری اردو شاعری کی کوئی کتاب نہ تھی۔

س آپ کس زبان میں لکھ کر زیادہ سہولت محسوس کرتی ہیں؟

ج مجھے تو صرف اردو شاعری کرنا تھی اور یہی میری خواہش تھی۔ لیکن میں نے پنجابی شاعری کے ساتھ پنجابی کہانیاں بھی لکھیں۔ مجھے خود بھی نہیں پتہ بس یہ راستے خود بخود نکلتے گئے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے جو کچھ لکھنا ہوتا ہے۔ وہ زبان وہ ڈکٹیشن خود مجھ سے لکھواتے ہیں۔ اس میں ارادی طور پر کچھ بھی نہیں ہے۔ جس شکل میں ان کا نزول ہوتا ہے میں اسی شکل میں ان کو لکھ لیتی ہوں۔ میں سوائے کالموں کے اپنی کوشش سے کچھ بھی نہیں کچھ سکتی لیکن ایک رائٹر کے لکھے ہوئے کالم اور ایک اخبار نویس کے کالم میں بھی فرق ہوتا ہے۔

س آپ کی کم عمری میں شادی ہوئی پھر آپ ایک زمیندار فیملی سے تعلق رکھتی ہیں۔تو آپ کو ادبی سفر میں کوئی مشکلات پیش آئیں؟

ج دیکھیں آج سے پچیس تیس سال پہلے کے دور اور آج کے دور میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ہمارے گھر میں پردے کی سخت پابندی ہوا کرتی تھی۔اس زمانہ میں پی ٹی وی لوگ دیکھا کرتے تھے۔میرا کوئی انٹرویو یا پروگرام ہوتا تو اس کا نوٹس لیا جاتا تھا۔اخبار میں تصویر چھپتی تو بھی نوٹس لیا جاتا۔تب میں سر کو ڈھانپا بھی نہیں کرتی تھی تو گھر والے کہتے تھے کہ لوگ اعتراض کرتے ہیں۔تب لوگوں کو اس بات کا شعور بھی نہیں تھا کہ پڑھنا لکھنا بھی کوئی چیز ہے۔لیکن ہمیں اپنی حدود کو بھی خود مقرر کرنا ہوتا ہے۔ ہر عورت کا فیملی بیک گراؤنڈ اور حالات مختلف ہوتے ہیں اور انہی کے مطابق اسے چلنا ہوتا ہے۔مجھ میں لائین توڑنے کی اس سے زیادہ ہمت نہ تھی۔ یہ تھا کہ اگر مجھے لکھنے پڑھنے نہ دیا جاتا تو شاید مجھے آکسیجن نہ مل پاتی۔

س ایک عورت جب حلقے میں آتی ہے تو اسے شاعروں اور ادیبوں کی طرف سے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔آپ ان کو کیا مشورہ دیں گی کہ وہ آپ کی طرح باعزت طریقہ سے اپنی پہچان بنا سکیں؟

ج لکھنا میری ذات کی مجبوری تھی۔ مجھے سماجی رویے چبھتے تھے۔ مجھے اس گھٹن کو دور کرنا تھا۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت تھی جو مجھے لکھنے سے ملی، مجھے جو پہچان ملی وہ تو میں چاہتی بھی نہیں تھی۔ یہ میری ترجیحات میں نہیں تھا۔لکھنے کی صلاحیت کے باوجود میں اپنی ذات کی نفی کرتی تھی۔ کیونکہ آپ کی تحریر اہم ہوتی ہے۔لیکن ہمارے معاشرے میں عورت کے ہنر کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔اس کا عورت ہونا اور پھر اچھی شکل کی عورت ہونا اس کے آڑے آجاتا ہے۔ مجھے خاندانی وقار بہت عزیز ہے اس لئے میں نے اپنی حدود بھی مقرر کیں اور میں نے چاہا کہ میں اپنے جیسی دوسری عورتوں کے لئے ایک مثال بھی بنوں۔ مشاعروں میں جانے سے مجھے گھریلو سطح پر بھی مشکلات پیش آئیں اور خود مجھے بھی زیادہ مشاعروں میں جانا پسند

نہیں تھا۔ کیونکہ گھر میری پہلی ترجیح تھی۔ ویسے بھی مشاعروں میں وہ کلام سنایا جاتا ہے جو لوگوں میں پاپولر ہو۔ آپ اپنی پسند کی چیز نہیں سنا سکتے۔ اگرچہ مشاعرے کا اصل مقصد تو یہی تھا۔ مشاعروں سے جو ہم نے حاصل کرنا تھا وہ نہ کر سکے۔ نہ سنجیدہ اور باشعور لوگ اکٹھے کر سکے اور نہ ایسے سامعین میسر آئے۔ اس لئے میں ان تمام خواتین کو پیغام دینا چاہتی ہوں کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر مشاعروں کا انتخاب کیا کریں۔ اصل مقصد تو لکھنا ہوتا ہے۔ نہ شہرت اس کا مقصد ہے اور نہ پیسوں کے لئے لکھنا اصل وجہ ہے۔ تخلیق میں خوداتنی طاقت ہوتی ہے کہ آپ چاہیں بھی تو اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ دوسرا تخلیق اپنا آپ خود منوالیتی ہے۔ جو لوگ اور عزیز واقارب شروع میں میرے لکھنے پر اعتراضات کیا کرتے تھے اب وہی لوگ فخر سے میرا ذکر کرتے ہیں۔ بس عورت کو اپنا کردار مضبوط رکھنا چاہیے۔

س کیا شاعری میں کسی سے اصلاح لی کیونکہ آپ کا جو گھریلو ماحول تھا اس میں کسی سے ملنا اور اصلاح لینا بہت مشکل ہے؟

ج ہمارے ہاں کی عورت معاشرتی پابندیوں کا شکار ہے۔ ہم کسی سے کھل کر بات بھی نہیں کر سکتے۔ کسی سے اصلاح لینا بھی بہت مشکل ہے۔

س عمیرہ احمد نے بند کمرے میں بیٹھ کر عمدہ ناول لکھے؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ بغیر تجربات کے آپ ایسا لکھ سکیں؟

ج دیکھیں، اس کا اپنا مشاہدہ ہے۔ بہت سے لوگوں کا عمدہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح عمیرہ احمد گہرا مشاہدہ رکھتی ہیں۔ باقی خواتین کو تجربات کے مواقع کم ہی میسر ہوتے ہیں وہ خوانچے والے کے پاس بیٹھ کر اس کی باتوں سے تجربات حاصل نہیں کر سکتیں۔ کبھی سڑک کے کنارے بیٹھ کر ماحول کا مشاہدہ نہیں کر سکتی۔ زبانوں، کہانیوں اور تجربات کا پتہ لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے سے پتہ چلتا ہے۔ اسی لئے شاید عورت کے بارے میں یہ تعصب بھی پایا جاتا ہے کہ وہ خود نہیں لکھتیں، فکشن میں میں نے کسی سے کوئی اصلاح نہیں لی۔ نہ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں لوگوں کے پاس جاتی اور نہ میرے ماحول میں مجھے اس کی اجازت تھی۔ باقی

عمدہ شاعروں نے وقتاً فوقتاً بتایا کہ فلاں مصرعہ اس طرح کر لیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔ اچھے مدیر ایسا کرتے ہیں۔

س کس صنف میں اظہار کی سہولت محسوس کرتی ہیں؟

ج جب اظہار کرنا چاہتی ہوں وہ صنف مجھ سے خود کو لکھوا لیتی ہے۔ میں نے کسی موضوع پر لکھنے کے لئے کبھی خود سے پلاننگ نہیں کی۔ اسی وجہ سے جو چیز خود کو مجھ سے جس صنف میں لکھوانا چاہتی ہے، وہ اپنا وجود اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔ ناول بھی لکھنا چاہتی ہوں۔ اس حوالے سے مواد اکٹھا کر چکی ہوں۔

س قدیم شعرا میں کس کو پسند کرتی ہیں؟

ج مومن، اقبال، غالب، میر کو خاص طور پر پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ بھی قدیم شعراء میں بے شمار لوگ بہترین ادب تخلیق کر گئے ہیں۔

س موجودہ زمانے میں کون اچھا لکھ رہا ہے؟

ج ظفر اقبال کے بعد کئی اور لوگ سامنے آئے ہیں جو اچھا لکھ رہے ہیں۔ بے شمار لوگ ہیں۔ ان کی طویل فہرست ہے۔

س نثری نظم کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج نثری نظم کو باقاعدہ طور پر شاعری تسلیم کیا جا چکا ہے اور بلاشبہ اس وقت بے شمار لوگ نثری نظم بھی اچھی لکھ رہے ہیں۔ جیسے کہ تطہیر میں نثری نظمیں لکھنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ میں نے ایک دفعہ نصیر احمد ناصر صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اتنا اچھا لکھنے والے بچے کہاں سے ڈھونڈ لئے ہیں؟ وہ نئے لکھنے والوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ ان کا زیادہ کلام شائع کرتے ہیں۔ جس سے لکھنے والے کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ فرخ یار نے اچھا لکھا ہے۔ آفتاب شمیم اقبال، تبسم کاشمیری، نصیر احمد ناصر صاحب بہت اچھی نظمیں کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر ابرار احمد کی نظم مجھے پسند ہے۔ جس میں خشک اور بوجھل مضامین نہیں ہیں۔

س کیا آپ سمجھتی ہیں کہ نثری نظم میں غزل کی نسبت وسیع کینوس موجود ہے؟

ج جی ہاں۔ جیسا کہ آپ انگلش شاعری پڑھیں۔ بودلیئر، چلی کے پبلو وغیرہ کو پڑھیں تو ان کے ہاں عروض نہیں بلکہ نثری شاعری ہے۔ وزن نثری شاعر میں موجود ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں شاعری پر پابندیاں لگا کر محدود کر دیا گیا ہے جبکہ شاعری انسان کے اظہار کا سب سے مضبوط اور پہلا ذریعہ ہے۔ قرآن پاک یا دوسری الہامی کتابیں دیکھیں سب میں شاعری ہے۔ یہ تو الہامی زبان ہے۔

س غزل میں ٹرانسلیشن کے مسائل بھی ہیں؟

ج جی ایسا ہے۔ اس لئے نثری نظم زیادہ مقبول بھی ہو رہی ہے۔ اسے ترجمہ کرنا آسان ہے۔ آپ اسے مستقبل کی شاعری کہہ سکتے ہیں اور اس کے روشن امکانات نظر آ رہے ہیں۔ پاورفل شاعری خود کو منوا لیتی ہے۔ نثری نظم اپنے آپ کو منوا چکی ہے۔

س شعر کی تعریف کیا ہے؟

ج اگر آپ فکشن کی پوری کتاب لکھ لیں اور دوسری طرف ایک شعر لکھ لیں۔ تو آپ دو مصرعوں اور چند اشعار میں زندگی کا پورا مفہوم بیان کر دیتے ہیں۔ شاعری میرے نزدیک انسان کی بنیادی جبلتوں، خیالات اور احساسات کی عکاسی ہے۔ کائنات میں ہمیشہ سے شاعری موجود ہے۔ ہوا کے چلنے میں، تتلی کے اڑنے میں، پانی کے بہنے میں شاعری ہے۔ شاعری ہر چیز کے اندر موجود ہے۔ خدا اگر کسی کو شاعری کی صلاحیت دے دیتا ہے تو اس سے بڑی نعمت اور خوبصورتی اور کوئی نہیں ہے۔

س عورت کے شاعر ہونے کو ابھی عشق میں ناکامی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ایسا کیوں ہے؟

ج زیادہ تر جہالت نے ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ عورت کو اپنی مرضی کا غلام بنایا جاتا ہے۔ اسے اظہار کی آزادی نہیں ہے۔ لیکن اب جو عورت کی آزادی کا نعرہ بلند ہو رہا ہے، وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ خدا نے عورت اور مرد کو اس کے حصے کے کام تفویض کر دیئے ہیں۔ اس

کے ذمہ جو کام لگا دیا ہے، وہ اسی طرح ٹھیک ہیں لیکن بعض اوقات دوسرے شعبوں میں اس کے کام کرنے کی نفی کی جاتی ہے۔ اگر عورت محبت کی بات کرے تو غلط کیا ہے؟ محبت تو کائنات کی ہر چیز میں ہے۔ کہنے کا انداز محتاط اور پروقار ہونا چاہئے۔ ولگر آپ کا انداز ہوتا ہے۔ جب محبت کی شاعری وقار کے ساتھ لکھی جائے تو وہ بری نہیں ہے۔ میں نے عورت اور مرد کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بھی لکھا ہے لیکن اس میں ایک لفظ بھی ولگر نہیں ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ تحریر کو بھی مہذب اور پروقار ہونا چاہئے۔ فحاشی کا تاثر نہ ہو بلکہ اصل مسئلے کو اجاگر کیا جائے۔ میں نے ایسے ایسے مسائل پر بھی لکھا ہے جس پر بات کرنا بھی ممنوع ہے۔ ہمارا کام معاشرے کی بدنمائیوں کو دکھانا بھی ہے۔

س کیا کالم نگار اپنے فرائض دیانتداری سے سرانجام دیتا ہے؟

ج پرنٹ میڈیا، الیکٹرک میڈیا سے بہت پیچھے رہ گیا ہے جو کچھ اگلے دن آپ اخبار میں پڑھتے ہیں وہ ایک روز قبل الیکٹرک میڈیا پر چل چکا ہوتا ہے۔ اب جو کالم نگار مشہور ہیں یا جن کو لوگ آج بھی پڑھ رہے ہیں وہ اپنے اندازِ بیان کی وجہ سے ہیں۔ آج کالم نگاروں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ اتنی آوازیں اور اتنا شور ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ہر کوئی اپنی اپنی مسجد الگ بنا کر کھڑا ہے۔ اس سوسائٹی میں اصل آوازیں گم ہیں۔ کالم نگار بھی دوسروں کے کالم نہیں پڑھتے۔ وہ صرف اپنا لکھا ہوا پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ پہلے لفظوں کی حرمت ہوا کرتی تھی اب لفظ کی تکریم ختم ہو چکی ہے۔ پہلے کالم میں لکھی ہوئی بات کا نوٹس لیا جاتا تھا اور لوگ پڑھتے تھے اور عمل کرتے تھے، اچھی باتوں پر۔

س مشاعروں کو مزاحیہ شاعروں نے کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

ج مشاعروں کو مزاحیہ شاعری نے تباہ کر دیا ہے۔ مزاحیہ شاعری اچھی بات ہے لیکن سنجیدہ مشاعروں کو غیر معیاری مزاحیہ شاعری نے بالکل تباہ کر دیا ہے۔ لوگ بھی انٹرٹینمنٹ سمجھ کر آتے ہیں۔ بے تکی اور فضول بات پر قہقہہ لگانے آتے ہیں۔ پرانے زمانے میں اگر

تفریح فلم کے ذریعے بھی ہوتی تھی تو اس میں بھی ایک سبق ہوا کرتا تھا۔ مجھے خود تصوف کی طرف لانے میں پی ٹی وی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ تب مزاحیہ مشاعروں اور پروگرامز کا بھی اپنا معیار ہوا کرتا تھا۔ تب تہذیب ہوتی تھی، تربیت ہوا کرتی تھی لیکن اب بھانڈ شو ہی رہ گئے ہیں۔

س بابے کیا ہیں؟

ج بابے خدا کے بندے ہیں۔ خدا سے محبت کرنے والے ہیں اور خدا کی محبت کا اپنا ایک لطف ہے اور ہم عام لوگ خدا سے محبت نہیں کر سکتے۔ ممتاز مفتی صاحب کہا کرتے تھے۔ اللہ نال جپھی نہ پاویں، اس سے محبت نہ کر بیٹھنا۔ اس کی محبت کسی کام کا نہیں چھوڑے گی۔ محبت آپ کو ہوا میں پہنچا دیتی ہے۔ بہت اوپر لے جا کر نیچے گرا دیتی ہے اور آپ چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ میں اس محبت کی بات کر رہی ہوں جو ہم انسانوں سے کرتے ہیں۔ جب آپ چکنا چور ہو جاتے ہیں پھر خدا آپ کو تھام لیتا ہے۔ میں نے ایک کہانی لکھی تھی۔ میں عشق کی بیمار ہوں۔ اس میں انسان سے محبت کر کے خدا تک رسائی حاصل کر لینے کی کہانی ہے۔ محبت ایک اسیری ہے۔ ایک غلامی ہے۔ یہ آپ کو ہر حال میں توڑتی ہے۔ یہ آپ کی توقعات پر کبھی پورا نہیں اترتی اور یہ توقعات بھی آفاقی ہوتی ہیں، زمینی تو ہوتی ہی نہیں ہیں۔ رسائی میں آ کر بھی ناقابل رسائی ہے۔ پھر خدا آپ کو نئی شکل دیتا ہے اور ہمیشہ نئی شکل میں آنے کے لئے پرانی شکل کو ٹوٹنا ہی ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی محبت کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ وہ ہمارے دلوں کو توڑتا نہیں ہے۔ ہم اس سے جیسی توقعات رکھتے ہیں وہ ہمیں اس سے بھی بڑھ کر دیتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ اصل محبت ہے۔ وہ تو ٹوٹے ہوئے دلوں میں اپنا مسکن بنا لیتا ہے۔

س آپ کا مرشد کون ہے؟

ج میری مرشد صرف میری ماں ہے۔ میں نے اپنی ماں کو عیبوں پر پردہ ڈالنے والی دیکھا ہے۔ وہ وسیع ظرف کی عورت تھی۔ میری ماں ہم چھ بہن بھائیوں کی ہی ماں نہ تھی بلکہ

اس کی مامتا بہت بڑی تھی۔ جس میں بے شمار لوگوں کی محبت سمائی ہوئی تھی۔ تو میں نے اپنی ماں کو ہی اپنا مرشد جانا اور اس سے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔

س ادبی تنظیمیں جو کام کر رہی ہیں کیا آپ ان سے مطمئن ہیں؟

ج کچھ بھی نہیں کر رہیں۔ میں ایک تنظیم کی ممبر بھی تھی۔ اتنا محدود سا فنڈ تھا اور اس کے لئے میں نے لوگوں کو بہت پریشان دیکھا ہے۔ بنیادی ضرورتوں کے لئے لوگ دور دراز سے آتے اور لمبا چوڑا طریقہ کار ہوتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس معمولی فنڈ کو حاصل کرنے لئے بھی سفارشیں آتی ہیں۔ ادب کے لئے کوئی اکیڈمی کام نہیں کر رہی۔ ادیب کی کوئی حالت نہیں ہے اور ان کا کوئی پُرسان حال نہیں ہے۔ ڈرامہ انڈسٹری میں لوگ بہت کما رہے ہیں لیکن وہاں بھی رائٹر کا استحصال ہوتا ہے۔ رائٹر کا ہر جگہ استحصال ہو رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے چھوٹے سے گھر میں بیٹھ کر بہترین ادب تخلیق کیا ہے۔

س شعراء نے خود ایک رواج ڈال دیا ہے کہ وہ ہر جگہ بغیر معاوضہ کے لئے پڑھنے کے لئے چلے جاتے ہیں کیا آپ کو لگتا ہے اس طرح انہوں نے اپنی اہمیت کم کر لی ہے؟

ج ظاہر ہے بالکل ایسا ہی ہے۔ جب تک آپ خود اپنی اہمیت کو تسلیم نہیں کروائیں گے لوگ آپ کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اگر پہلے ہی سائل بن جائیں گے تو آپ کو زمین پر ہی بٹھایا جائے گا۔ کرسی پر بیٹھنے کیلئے آپ کو خود بتانا ہو گا کہ آپ کرسی پر بیٹھنے کے حقدار ہیں۔ جب آپ خود ہی مفت میں تیار ہیں تو دوسرا آپ کو اہمیت کیوں دے گا۔

س کیا آپ کے کام کی عوامی اور سرکاری سطح پر پذیرائی ہوئی ہے؟

ج دیکھیں نہ مجھے پذیرائی چاہئے تھی۔ میری توقع، اوقات اور ضرورت سے بڑھ کر خدا نے مجھے عزت دی ہے۔ میں گھر میں بیٹھی ہوئی عورت ہوں نہ میں کسی کی خوشامد کرتی ہوں نہ کسی کے دفتر میں جاتی ہوں۔ نہ میں خواہ مخواہ کسی کی واہ واہ کرتی ہوں۔ جہاں میں کئی بار عزت سے بلائی جاؤں وہاں بھی مشکل سے جا پاتی ہوں۔ آپ اور آپ جیسے لوگ میری عزت کرتے ہیں، یہی میری کمائی ہے۔ انڈیا میں مجھے بہت بڑا ایوارڈ مل چکا ہے۔ میں وہ

ایوارڈ لینے نہیں جا سکی تو یہاں بھیج دیا گیا۔ میرے کام پر ریسرچ ورک ہو چکا ہے۔ میرا کلام گایا بھی جا چکا ہے۔ میری نظم بی۔اے کے کورس میں بھی شامل کی گئی ہے۔ یہاں فاطمہ جناح، ساحر لدھیانوی اور دیگر ایوارڈز مل چکے ہیں۔ لیکن میری نظر میں ایوارڈز کچھ نہیں ہیں کیونکہ مجھے ایوارڈز کی حقیقت کا بھی پتہ ہے۔ جب منو بھائی کو ان کی وفات سے فقط چھ سات سال قبل ایوارڈ ملا تو ہم کس انتظار میں ہیں۔ منو بھائی کا کام بھی اس ایوارڈ کا محتاج نہیں تھا۔ ریوارڈ یا ایوارڈ لفظ لکھنے کا ہنر ہے جو خدا نے مجھے دیا ہے۔ اللہ نے میرے ظرف اور اوقات سے زیادہ دیا ہے۔

س انٹرنیٹ کی وجہ سے کتب بینی کا رجحان ختم ہو رہا ہے۔ کیا آپ کو لگتا ہے کتب بینی بالکل ختم ہو جائے گی؟

ج کتب بینی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ کتاب کو چھو کر پڑھنے کا جو مزہ ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں۔ انٹرنیٹ کی سہولیات اچھی چیز ہے۔ جیسے میں خود انٹرنیٹ پر کتاب پڑھتی ہوں۔ لیکن کتاب کا دور بہت جلد لوٹ کر آئے گا۔ دنیا کے جدید ترین ممالک میں اب بھی کتاب شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ ہم نئی نئی ٹیکنالوجی کے ہیجانی دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم اس سے وہ کام نہیں لے رہے جو لینا چاہئے بلکہ اس کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ سیلفی کلچر فروغ پا چکا ہے۔ بھلا کوئی اپنی ذات کا جھنڈا بھی اٹھاتا ہے۔ جب تک آپ اپنی ذات کی نفی نہیں کریں گے آپ کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ انسان کا انسان سے رابطہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔

س سوشل میڈیا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج سوشل میڈیا نے انسان کی آزادی ختم کر دی ہے۔ بیڈروم میں لگی آپ کی تصویر اب ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ آپ کھانا کھا رہے ہیں تو ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ آپ کی پرائیویسی ختم ہو چکی ہے۔ آپ آزاد انسان نہیں رہے۔ ٹیلی فون کے اندر آپ کا ڈیٹا اور آپ کی لوکیشن تک سامنے آجاتی ہے۔ میں جس جنریشن سے ہوں اس زمانے میں کسی کی تصویر کسی لڑکے کے پاس چلی جاتی تھی تو لڑکی کا گھر ٹوٹ جاتا تھا۔ اب شریف زادیاں بغیر

معاوضے کے سوشل میڈیا پر ماڈلنگ کر رہی ہیں، یہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے یہ سب سخت ناپسند ہے۔ سوشل میڈیا تو ستائش باہمی کا ایک نیا انداز ہے۔ برتری اور بے ہودہ چیز کو بھی سراہا جاتا ہے۔ جیسے گاؤں میں بھاجی ڈالی جاتی ہے۔ سوشل میڈیا پر واہ واہ، کی بھی بھاجی ڈالی جا رہی ہے۔ یہ تو مکمل فیک ہے۔

س جب آپ نے لکھنا شروع کیا تو بقول آپ کے سینئرز حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کیا اب بھی سینئرز نئے لکھنے والوں کی اسی طرح سے حوصلہ افزائی کرتے ہیں؟

ج اب سینئرز کے پاس اس طرح کے جونیئرز جا بھی نہیں رہے۔ ہر جونیئر خود کو استاد سمجھتا ہے۔ اپنی ذات کو اس نے اپنے کندھے پر اٹھایا ہوتا ہے۔ اس وقت پوری سوسائٹی اپنے کندھے پر خود کو اٹھا کر پھر رہی ہے۔ پہلے اپنی ذات کو کسی ایک کے سامنے سرینڈر تو کریں۔ ہم پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں۔ ہم اس کی مخلوق ہیں وہ ہمیں اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ بھی کہتا ہے کہ میرے سامنے جھکو، اپنا اظہار عبودیت کرو تا کہ پتہ چلے کہ میں تمہارا خدا ہوں۔ تو یہ ہم ذات کو سرینڈر ہی کرتے ہیں۔ اور کیا ہمیں استاد کی عزت کے آداب آتے ہیں۔ شاگرد کو خود اپنی حدود مقرر کر کے استاد سے کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ آپ کو اپنی بھی حدود مقرر کرنی ہوتی ہیں۔ پرانے نظریات ٹوٹ رہے ہیں اور نئے نظریات ابھی بنے نہیں ہیں۔ اب علم سیکھنے کا لوگوں کو وہ شوق بھی نہیں ہے۔

سعید آسی

س اپنے علمی سفر کے بارے میں بتایئے۔

ج پاکپتن سے تعلق ہے اور پاکپتن کی فضا کافی علمی وادبی ہے۔ میرے اپنے گھر کا ماحول والد صاحب کی وجہ سے علمی وادبی رہا۔ انہوں نے گلستان و بوستان پڑھ رکھی تھی اور ان کا شعری ذوق بہت پائے کا تھا۔ ہمارے گھر میں بیٹھک ہوا کرتی تھی جہاں ادبی تقریبات منعقد ہوا کرتیں۔ اسی مناسبت سے میں نے اپنے کالمز کا عنوان بھی بیٹھک رکھا۔ پاکپتن کے مشہور رائٹرز یہاں جمع ہوتے۔ میرا اپنا میلان بھی ادبی تھا۔ اس وقت ٹی وی تو ہوتا نہیں تھا۔ ہمارے شہر میں بجلی بھی 65 کے بعد آئی تھی۔ والد صاحب نے گھر میں ٹرانزسسٹر رکھا ہوا تھا جس پہ سارا دن ہم گانے سنا کرتے۔ یہاں سے موسیقی کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ پرائمری کلاس سے ہی مجھے مصوری کا شوق بھی رہا۔ انہی تمام رجحانات کے ساتھ لکھنے کا رجحان بھی میرے اندر کہیں موجود تھا۔ کالج پہنچ کر کتابیں پڑھنے کا موقع میسر ہوا۔ ایک بار کالج میں میں نے اردو کا سارا پرچہ منظوم صورت میں حل کیا۔ یہ ایک طرح کا منفرد واقع تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں اس میں فیل ہو جاؤں گا لیکن میرے اُستاد نے میری بہت ستائش کی اور ساری کلاس کو دکھایا۔ کالج میں میں نے بھرپور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ پنجابی ڈیبیٹ میں گولڈ میڈل لیا۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کی لائبریری میں پڑھنے کے وسیع مواقع میسر آئے۔ منٹو اور دیگر مصنفین کے مشہور افسانے میں نے اسی کالج کی لائبریری میں پڑھے۔ یہاں مجھے بھرپور مواقع میسر آئے۔ دلدار پرویز بھٹی صاحب ہمارے انگلش کے اُستاد تھے اور ان کی پہلی پوسٹنگ اسی کالج میں ہوئی تھی۔ تب جاوید قریشی

ڈپٹی کمشنر تھے اور مجید امجد صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ مشاہیر سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ انہی دنوں میری پنجابی شاعری کی دھوم مچ چکی تھی۔ میرے ایک اُستاد نے میری حوصلہ شکنی کی جب میں نے اپنی شاعری سنائی تو کہا کہ آپ تو شاعر نہیں بن سکتے۔ تب انہوں نے مجھے چیلنج کیا کہ پنجابی میں شاعری کر کے دکھاؤ۔ اگلے دن میں نے پنجابی میں نظم لکھ کر سنائی جو زبانِ زدِ عام ہوگئی۔

س یعنی آپ نے شاعری کا آغاز پنجابی زبان سے کیا؟

ج نہیں آغاز تو خیر اُردو شاعری سے ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرے اُستاد نے مجھے چیلنج دیا اور وہیں سے پنجابی اشعار کہنے کا سلسلہ چل نکلا۔

س صحافت کی طرف کیسے آنا ہوا؟

ج دراصل میرے والد صاحب تو مجھے وکیل بنانا چاہتے تھے۔ ان کی ڈیرہ داری تھی اور اس میں میرے لیے یہی پیشہ انہیں مناسب معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا۔ ان کی اسی خواہش کے احترام میں میں نے یونیورسٹی سے لاء کا امتحان پاس کیا اور کچھ عرصہ پریکٹس بھی کی لیکن یہ شعبہ دراصل میرا مزاج نہ تھا۔ یہ سب صرف والد صاحب کا شوق پورا کرنے کے لیے کیا۔ 1976ء میں میں نے لاء کر لیا تھا۔ ان کے ایک دوست نے یونیورسٹی میں خود میرا فارم فل کر کے جمع کروا دیا اور یوں میں لا سٹوڈنٹ بن گیا۔

س صحافت کی طرف لکھنے کی شوق کی وجہ سے آئے؟

ج ظاہر ہے لکھنے کا شوق تھا اور اسی شوق کی وجہ سے میں صحافت کی طرف نکل آیا۔ اصل میں میرے اندر کا رائٹر مجھے بے چین کیے ہوئے تھا کہ میں کسی ایسے فیلڈ میں آؤں جو ملازمت بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اپنے شوق کو بھی پایہ تکمیل تک پہنچانے کا موقع مل سکے۔ سب سے پہلے میں ''وفاق'' میں آیا اور اسی دوران تحریک نظام مصطفٰے کے سلسلہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ پھر ''آزاد'' اخبار کو جوائن کر لیا۔ ساتھ میں ایک پرچہ سٹوڈنٹ نام کا تھا۔ میں اس کا

بھی ایڈیٹر تھا۔ اس دوران روزانہ میرا کالم چھپا کرتا تھا۔ یوں تو میں نے سی ایس ایس کا امتحان بھی دیا لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ جو عزت اور وقار اس شعبہ میں ہے وہ کسی اور میں نہیں ہے۔ لہٰذا اس شعبہ سے وابستگی جاری ہے۔

س گورنمنٹ کالج ساہیوال کی یادیں قارئین سے شیئر کیجیے؟

ج گورنمنٹ کالج ساہیوال میں گریجویشن کا دو سال کا عرصہ انتہائی بھرپور عرصہ رہا۔ بطور شاعر، ادیب، میری پہچان گورنمنٹ کالج ساہیوال ہی میں ہوئی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۷۴ء تک کا یہ عرصہ وہ ہے جب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو چکا تھا اور پاک بھارت جنگ کی تلخیاں اور یحییٰ خان کی رسوائیوں کے چرچے ماحول کو پراگندہ کیے رکھتے تھے۔ ساہیوال کی پرفضا ٹھنڈی سڑک بھی اُداس نظر آتی تھی۔ شعر و شاعری کے جذبوں کو جلا ملتی رہی۔ جاوید قریشی (جو چیف سیکرٹری پنجاب کے منصب سے ریٹائر ہوئے) اس وقت ڈپٹی کمشنر ساہیوال ہوا کرتے تھے۔ باذوق آدمی تھے خود بھی شاعر تھے اس لیے ان کی زیر صدارت گورنمنٹ کالج ساہیوال میں اکثر ادبی تقریبات منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بڑے بھائی امجد علی آغا گورنمنٹ کالج ساہیوال کے پرنسپل تھے اور دلدار پرویز بھٹی کی بطور لیکچرار پہلی پوسٹنگ اسی کالج میں ہوئی۔ پروفیسر انوار الحق پروفیسر ریاض قریشی اور سب سے بڑھ کر سعادت سعید کے والد پروفیسر ڈاکٹر اے ڈی نسیم شعر و ادب کی محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔ شیراز ہوٹل میں مجید امجد کے ساتھ نشستیں اور پھر ظفر اقبال اوکاڑوی، مشتاق صوفی اور جعفر شیرازی کے ساتھ خصوصی نشستیں زندگی کی یادوں کا سرمایہ ہیں۔ دلدار پرویز بھٹی انتہائی سادہ اور شستہ زبان میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ اپنے ناز و انداز کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے خاصے معروف ہو گئے۔ سکوٹر پر کالج آیا کرتے تھے۔ ایک بار ان کا تبادلہ کسی دوسرے سیکشن میں ہو گیا تو ہماری پوری کلاس نے ان کے حق میں پرنسپل آفس تک جلوس نکالا۔ چنانچہ انہیں واپس ہماری کلاس میں بلا لیا گیا۔ اس زمانے میں ہم پانچ چھ کلاس فیلوز علم و ادب کے حوالے سے کالج کے باہر بھی اپنی شناخت پیدا کر چکے تھے۔ ان میں

میرے علاوہ مظہر ترمذی، ریاض نغمی، جوزف سی لال، زاہد حسین رانا، رضا الحق صدیقی اور طاہر نسیم شامل تھے۔ مظہر ترمذی کلاسیکل شاعر تھے ان کا ایک شعر آج بھی ان کی یاد تازہ کرتا ہے۔

مجھے بھی شوق نے مہلت نہ دی ٹھہرنے کی
سفر پہ میں بھی روانہ ہوا کے بعد ہوا

مظہر ترمذی اب لندن میں جا آباد ہوئے ہیں۔

ریاض نغمی ساغر صدیقی کی ڈگر کے شاعر تھے۔ اُلجھے بکھرے بالوں اور ڈھیلے ڈھالے لباس کے ساتھ بالکل شاعر نظر آتے تھے۔ ان کا یہ شعر میرے ذہن کے پردے میں آج بھی محفوظ ہے۔

فلک کا رنگ ہے نیلا زمیں کی چوٹوں سے
چھپا کے دونوں کا غم چاند ہو گیا پیلا

س: آپ نے روزنامہ وفاق سے صحافت کا آغاز کیا۔ اس بارے میں کچھ بتایئے۔

ج: لاء کی تعلیم کے دوران روزنامہ ''وفاق'' سے صحافت کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ بھٹو دور تھا اور پنجاب میں حنیف رامے وزیر اعلیٰ تھے۔ ایک دن جمیل اطہر صاحب وزیر اعلیٰ کی پریس کانفرنس سے واپس آئے تو اے پی پی کی جاری کردہ حنیف رامے کی پریس کانفرنس کا ترجمہ مجھے ڈکٹیٹ کرانا شروع کر دیا۔ جتنی تیز رفتاری کے ساتھ انہوں نے ترجمہ کیا وہ صحافت میں پختگی کے لیے میرا پہلا تجربہ تھا۔ ارشاد حقانی اور بشیر احمد ارشد جو اس وقت لیل و نہار کے ایڈیٹر تھے اور شاہ دین بلڈنگ میں وفاق کے دفتر کے ساتھ ہی ان کا دفتر بھی ہوا کرتا تھا۔ وفاق کا اداریہ لکھتے تھے۔ مجھے ان دونوں سے ان کے اداریے کی ڈکٹیشن لینے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس وقت نیوز ڈیسک پر منصور حیدر، صدیقی سحانی، آفتاب عظیم، ایم ارشد اور کچھ عرصہ بعد انور طاہر، مقبول سعید، ایڈیٹوریل میں ایگزیکٹو ایڈیٹر جمیل اطہر، قربان انجم اور رپورٹنگ میں منیر کاظمی، آغا نعیم صادق، زاہد علی خاں، اعظم ناصر اور پھر مجاہد منصوری، وفاق کی میری اور رحمت علی رازی کی ہم سفری اُسی وقت سے جاری ہے۔ نوائے وقت میں

بھی وہ ایک عرصہ میرے ہم سفر رہے۔ ہماری اتنی قربت رہی کہ آج بھی کبھی کبھی لوگ رازی کو آسی اور آسی کو رازی سمجھ لیتے ہیں۔

س نوائے وقت میں کس طرح آئے؟

ج نوائے وقت میں آنا کچھ اس طرح ہوا کہ ''آزاد'' جب بند ہوا تو میر خلیل الرحمٰن نے روزنامہ جنگ کے لیے مجھے لکھنے کو کہا۔ دراصل جنگ کی جو پہلی ٹیم تھی وہ ''وفاق'' سے اُٹھ کر ہی آئی تھی اور چونکہ میں بھی اس ٹیم میں شامل تھا۔ جنگ کی پہلی ڈمی ہم ہی نے بنائی لیکن میرا اس وقت بھی کریز تھا کہ میں نوائے وقت کے لیے کام کروں اور میں سوچتا تھا کہ اگر اس میں مجھے چانس مل جائے تو اسی پرچہ کو جوائن کرلوں گا اور اس سے بڑی بات میرے لیے اور کوئی نہیں تھی۔ لہذا میں نے وہاں بھی اپلائی کیا ہوا تھا کہ اچانک مجھے وہاں سے لیٹر آ گیا۔ میں خوشی سے نہال ہو گیا اور پھر میں نے کچھ نہیں سوچا۔

مجھے یاد ہے وہ 6 ستمبر 1981 کا دن تھا جب میں نے نوائے وقت کو جوائن کیا۔ اُس وقت سے آج تک میں نوائے وقت سے جڑا ہوا ہوں۔ نوائے وقت میں میں نے ہر طرح کا کام کیا۔ یہاں میری کوئی خواہش نہیں تھی۔ میں نے نظامی صاحب سے کہا تھا کہ جہاں آپ مجھے بہتر سمجھیں وہاں پر مجھے ایڈجسٹ کر دیں۔ سو میں شفٹ انچارج، بچوں کے ایڈیشن، نیز ادبی ایڈیشن کا انچارج بھی رہا۔ دیگر شعبہ جات میں بھی کام کرتے رہنے کے مواقع میسر آتے رہے۔

س آپ کی صحافت پر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگایا تو ایئر مارشل اصغر خان نے اپنی پارٹی تحریک استقلال کو قومی سیاست میں اُجاگر کرنے کے لیے ایک ڈمی روزنامہ آزاد کو اپنی پارٹی کا ترجمان اخبار بنایا۔ چنانچہ آزاد ایک بار پھر پوری شان و شوکت، آب و تاب اور معروف صحافیوں کے جم غفیر کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ جس کا ''ماٹو'' بھٹو کی کردار کشی رکھا گیا تھا۔ عباس اطہر صاحب اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ مظفر الحسن نیوز ایڈیٹر، سہیل ظفر چیف

رپورٹر، اظہر زمان، صادق جعفری شفٹ انچارج، میں پہلی بار بطور سٹاف رپورٹر اس اخبار کے ساتھ منسلک ہوا اور ہائی کورٹ رپورٹنگ میرے حصے میں آئی۔ کورٹ رپورٹنگ کا پہلا ہی تجربہ ہائی کورٹ کے فل بینچ میں زیر سماعت ذوالفقار علی بھٹو اور نواب محمد احمد خان قتل کیسے میں ان کے شریک ملزمان کے مقدمہ کی رپورٹنگ کی صورت میں حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی آزاد میں اپنا کالم ''سرگوشیاں'' بھی شروع کر دیا۔ یہ کالم ادارتی صفحہ پر عباس اطہر، سہیل ظفر اور آزاد کوثری کے کالموں کے ساتھ شائع ہوتا تھا اور عباس اطہر صاحب نے بطور خاص اس کالم کا مونوگرام ایک گنجے آدمی کی ٹنڈ کے اوپر بنوایا تھا۔ اخبار کا فرنٹ پیج میری خبروں کے ساتھ بھرا ہوتا اور ادارتی صفحے پر میرا کالم بھی موجود ہوتا۔ صحافت کرنے کا مزہ اس مختصر سے دور میں آیا۔

س مجید نظامی صاحب سے آپ کی ملاقاتیں رہیں اور ان کے قریب رہ کر ان کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ کیسی شخصیت تھے؟

ج میں نہیں سمجھتا کہ ایسی شاندار اور قابل شخصیت کے بارے میں ایک نشست میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہایت رحم دل اور نہایت پیشہ ورانہ شخصیت تھے۔ انہوں نے پاکستان کی صحافت کی ہے۔ 1942ء میں خود قائداعظم نے انہیں آفر کی کہ کیا آپ ہمارے پریس کے لیے ملازمت کریں گے۔ اس وقت ایک پندرہ روزہ پرچہ چھپتا تھا جو تحریک پاکستان کا داعی تھا۔ وہ دن اور اس کے بعد کی تمام زندگی انہوں نے اسی مقصد کے لیے صحافت کرتے ہوئے وقف کر دی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں جانبدار صحافی ہوں۔ اگرچہ کوئی اور اس طرح اپنے بارے میں کہے تو بڑا معیوب لگتا ہے لیکن وہ اپنے مقصد سے محبت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ پاکستان کے خلاف نہ ہی کوئی بات سن سکتا ہوں اور نہ ہی برداشت کر سکتا ہوں۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ نوائے وقت دراصل ایک نظریاتی اخبار ہے۔ یہ ایک اخبار ہی نہیں ایک پلیٹ فارم بھی ہے۔

جتوئی صاحب کی حکومت تھی۔ میں اس وقت رپورٹنگ کرتا تھا۔ اسمبلیوں کے ٹوٹنے کا

معاملہ چل رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں بھی لکھ دیا۔ نظامی صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ جو رپورٹنگ آپ نے کی ہے کیا وہ سچ پر مبنی ہے۔ میں نے کہا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ جس خبر کی سرخی چھ اخباروں نے لگائی ہے۔ وہ غلط کیسے ہو سکتی ہے۔ نظامی صاحب نے کہا ٹھیک ہے ہم فائٹ کریں گے اور میرے ساتھ اس مسئلے پر ڈٹ گئے۔ عدالت میں بھی پیش ہوئے۔ اگرچہ خوف کی ایسی فضا تھی کہ باقی سب کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ نظامی صاحب نے عدالت میں کہا پہلے آپ اپنا ساؤنڈ سسٹم تو ٹھیک کروائیں۔ خوف کی ایسی فضا میں میاں رفیق تارڑ چیف جسٹس تھے۔ مالکان اور دیگر کو توہین عدالت نوٹس جاری کر دیے گئے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب نظامی صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ مجھے حقائق بتا دیں کہیں کچھ غلط نہ ہو۔ میں نے یقین دلایا اور اوپر والا معاملہ اس کے بعد ہوا۔ تبھی انہوں نے کہا کہ آپ کے خراب ساؤنڈ سسٹم کی وجہ سے میرے پلے ایک بات بھی نہیں پڑی۔ آپ توہین عدالت کا نوٹس تو جاری کر رہے ہیں اور ساؤنڈ سسٹم آپ سے ٹھیک نہیں کروایا جاتا۔ عدالت میں سناٹا طاری ہو گیا۔ کھسر پھسر ہوتی رہی اور پھر چیف جسٹس سمیت سب اُٹھ کر چلے گئے۔ ایک گھنٹے میں اندر سے میسج آیا کہ کیس ختم ہو گیا اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسی بات کو نبھایا۔ بہت آفرز ہوئیں لیکن اس پلیٹ فارم کو نہیں چھوڑا۔ یہی میری چوائس تھی اور یہی مجھے مل گئی۔

س بہت سے اخبار جاری ہوئے اور کچھ عرصہ بعد منظر سے غائب بھی ہو گئے۔ کیا وجہ ہے کہ نوائے وقت آج بھی اتنا ہی پاپولر ہے؟

ج اس کی ایک وجہ ہے اس نے اپنی Good Will اپنی وطن سے محبت اور پاسداری کی وجہ سے بنائی۔ پاکستان کے نظریات کی پاسداری ہی دراصل نوائے وقت کی پالیسی تھی اور آج تک اسی پالیسی پر پہلے دن کی طرح عمل درآمد ہوتا ہے۔ اس وفاداری کا دامن آج تک ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔ آج پاکستان میں جتنے بابے ہیں وہ شروع دن سے یہ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جتنے مرضی اخبار جاری ہو جائیں ان کی نوائے وقت سے محبت اور لگاؤ

میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

س اس فیلڈ میں کیا کامیابیاں اور ایوارڈ حاصل کیے؟

ج دیکھیے ایوارڈ کا مجھے کبھی اتنا لالچ نہیں رہا۔ ایوارڈ کمیٹی کی تشکیل ہونی چاہیے جو کہ سب لوگوں کے کام کا جائزہ لے کہ کس کا کام اچھا ہے اور وہ ایوارڈ کا حقدار ہے۔ لوگوں سے درخواستیں مانگی جاتی ہیں کہ آپ Entry دیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس سے پہلے کبھی Apply نہیں کیا۔ بہرحال ہماری جو تنظیمیں ہیں میں ان کا کئی بار صدر رہا ہوں۔ لاہور پریس کلب کا دو بار سیکرٹری رہ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی کئی تنظیموں کی صدارت میرے پاس رہی۔ تو یہ عزت ہی میرا ایوارڈ ہے۔

س اتنی ٹف ڈیوٹی کے دوران شاعری یا دیگر تصانیف کے لیے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟ روز اداریہ کیسے لکھتے ہیں؟

ج مجھے یہ سب کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ مجھے یہ سب اپنا روٹین ورک لگتا ہے۔ میں پچھلے بارہ سال سے روزانہ اداریہ لکھ رہا ہوں۔ کبھی ایک دن بھی میں نے محسوس نہیں کیا کہ مجھے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ میرا پروفیشن ہی میرا شوق ہے۔ اب عمر کا تقاضا ہے کہ کچھ تھک جاتا ہوں۔

س شاعری، اداریہ، کالم کس صنف میں لکھنا پسند ہے؟

ج بنیادی میدان تو شاعری تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ جرنلسٹ شاعر، ادیب تو نہیں ہو سکتا لیکن ہر شاعر ادیب جرنلسٹ ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے شاعر آج کالم نگاری کی طرف آ چکے ہیں۔ شاعر و ادیب کے کالم لوگ زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ایک ادبی رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے لیکن دوسری طرف ایک پروفیشنل جرنلسٹ زیادہ تجزیے کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔

س کیا الیکٹرانک میڈیا اخبار پر اثر انداز ہوا ہے؟

ج میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ آج چینلز کی بھرمار ہے۔ بولے ہوئے الفاظ تو ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ لکھا ہوا لفظ اپنی توقیر رکھتا ہے۔ آپ جب چاہیں اسے دوبارہ

پڑھ سکتے ہیں۔اس لیے اخبار کی ویلیو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔اب تو عدالتوں میں اخبار کے تراشے کو بطورِ شہادت تسلیم کیا جاتا ہے۔

س پرفیکٹ جرنلسٹس کے تحت صحافیوں کو درپیش خطرات میں پاکستان چوتھے نمبر پر ہے؟اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج میں اس سے سو فیصد متفق ہوں۔پاکستان میں شاید اس سے بھی زیادہ خطرات ہیں۔جبکہ دیگر ممالک میں ایسا نہیں ہے۔اگر خطرات ہیں تو تحفظات بھی بہت زیادہ ہیں۔سہولیات بہت ہیں۔کئی ممالک تو ایسے ہیں جو اپنے صحافی کو سٹوری نکالنے لیے جہاز تک مہیا کرتے ہیں۔یہاں تو ان حالات کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔صحافی کے کندھے پر رکھے کیمرہ کی تو انشورنس ہوتی ہے جبکہ صحافی کی نہیں۔جتنا ٹارچر مجھے کیا گیا اس کا تصور بھی دوسرے ممالک میں نہیں ہے۔یہ ایک جاب نہیں ایک مشن ہے۔مادیت پرستی کی وجہ سے پروفیشنل صحافی بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

س آپ اتنے طویل عرصہ سے نوائے وقت کے ساتھ وابستہ ہیں۔کبھی خیال آیا کہ بس اب کافی ہو گیا، گھر تبدیل کر کے دیکھ لیا جائے۔

ج نہیں، ایسا خیال کبھی نہیں آیا۔ایسا نہیں کہ میرے سامنے ترغیبات نہیں تھیں۔بے پناہ چانس بھی ملے۔اچھی اچھی آفرز بھی آئیں مگر میں نے اپنے لیے پیشہ صحافت میں جس منزل کا خواب دیکھا تھا وہ پورا ہونے کے بعد کسی دوسرے سہانے خواب میں کشش ہی نظر نہیں آئی۔نوائے وقت میرا خواب تھا اور میں دیانت داری کے ساتھ سمجھتا تھا اب بھی سمجھتا ہوں کہ صرف نوائے وقت ہی وہ واحد اخبار ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملک کی صحافت کا بھرم قائم ہے۔یہ صرف اخبار نہیں، ایک تحریک بھی ہے۔ملک کی نظریاتی اساس کی نگہداشت کی تحریک اس ملک کی تشکیل کا باعث بننے والے نظریات اور اصولوں پر کاربند رہنے اور حکمرانوں کو کاربند رکھنے کی تحریک، صحافت میں سچائی اور کردار کی پختگی کی تحریک اور سب سے بڑھ کر قومی درد کا احساس اور اس درد کے مداوا کے لیے اپنا قائدانہ کردار بروئے

کارلانے میں نوائے وقت اوراس کے مدیر محترم مجید نظامی کی خدمات اس ملک اور قوم کے لیے ایک سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجید نظامی صاحب ہی ملک کی نظریاتی اساس کے پاسبان ہیں اور ملک کے صفحہ ہستی سے مٹانے کا خواب دیکھنے والی ہر قوت کے آگے ڈھال بن کر کھڑے ہیں۔قومی تشخص اور وقار کے لیے کسی نقصان کی پرواہ کیے بغیر وہ کلمہ حق ادا کرتے ہیں تو ہمیں بھی حوصلہ ملتا ہے۔اس لیے جتنی جرات اور بے باکی کے ساتھ میں نے نوائے وقت میں لکھا اپنے جذبات کا اظہار کیا شاید میں کسی دوسرے پلیٹ فارم پر ایسا کبھی نہ کر پاتا۔

س اپنی ذات کے حوالے سے اور کوئی خواہش تمنا جو پوری نہ ہوئی ہو؟

ج میں ایک گناہ گار آدمی ہوں اپنے لیے خدا تعالیٰ سے صرف رحم کا طالب ہوں۔ عدل کا اس لیے تقاضہ نہیں کرتا کہ خدا تعالیٰ کی عدالت میں تو گندم کے ایک دانے پر بھی پکڑ ہوسکتی ہے اور خدا تعالیٰ نے خود بھی اپنے بندوں کے لیے رحم کا تقاضہ کرنے کی سب سے زیادہ سہولت رکھی ہے۔ہم ہر وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہیں تو درحقیقت خدا تعالیٰ کی رحمان اور رحیم کی صفت بیان کرتے ہوئے اپنے لیے رحم کا تقاضا ہی کرتے ہیں۔بے شک عادت ہونا بھی خدا تعالیٰ کی صفات میں شامل ہے۔مگر عدل میں سزا بھی ہوسکتی ہے اور جزا بھی جبکہ خدا تعالیٰ سے رحم کی بھیک مانگی جائے تو اس میں جزا ہی جزا ہے۔اس لیے خدا تعالیٰ سے وہی لینے کی تمنا ہے جس کی خدا کے حضور بہتات ہے۔یہ تمنا پوری ہو جائے تو دنیاوی زندگی میں کوئی دوسری تمنا دل میں تڑپ پیدا نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنے ایک پنجابی قطعہ میں بھی یہی تمنا اس طرح کی ہے کہ

اوگن ہاریاں وچہ کی گن ہووے
دکھاں نال اے بھری حیات میری
ربا تیرے سہارے تے آن بیٹھاں
کریں رحم تے ہووے نجات میری

سیما غزل

س اپنا نام اور خاندانی پس منظر بتائیے؟

ج مجھے سیما غزل کہتے ہیں۔ خاندان ادبی تھا۔ اس لئے وہ رنگ مجھ بھی موجود تھا۔ والد ریڈیو پاکستان میں اسکرپٹ رائٹر تھے۔ شاعر تھے اور جگر مراد آبادی کے ہم عصر اور دوست تھے۔ یہ بدقسمتی ہے ہماری کہ ان کا مجموعہ نہیں چھاپ سکے اور ان کی کتابیں، اسکرپٹ اور غزلیں جو بڑی احتیاط سے رکھوائی تھیں، بارش میں ضائع ہوگئیں۔ ایک ڈائری چھوٹا بھائی لے گیا اور پھر جانے اس نے کہاں کی۔ بڑی بہن حجاب عباسی معروف شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ بڑے بھائی بھی ٹی وی پلے رائٹر تھے۔ امی شاعرانہ ذوق رکھتی تھیں اور تھوڑی بہت شاعری کر بھی لیتی تھیں۔

یہ سارا ماحول ایسا تھا کہ ہم چاہتے ہوئے بھی تو اس ماحول سے نکل نہ سکے۔ کیونکہ مشاعروں میں پاپا کے ساتھ جاتے جو نشستیں گھر پر ہوتیں وہ سنتے، بڑے بڑے لوگوں کو پاپا کے پاس آتے دیکھتے۔ ان کی باتیں سنتے۔ شاید اسی وجہ سے میرے خاندان میں جتنے لوگ بھی ہیں وہ کریٹو تھے۔ میرا بیٹا سید علی رضا (اسامہ) ڈائریکٹر رہا ہے جیو کا۔ جہاں اس نے بڑی بڑی سیریلز بنائی ہیں۔ ''کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی'' یہ پلے بہت اچھا تھا۔ لوگوں نے اسے بہت پسند کیا تھا۔

میرے لکھنے کی شروعات تو شاید 14 یا 15 سال کی عمر میں ہوئی مگر شاعری بہت پہلے شروع کردی۔

مجھے جو اپنا پہلا شعر یاد آ رہا ہے وہ 14 برس کی عمر میں کچھ اس طرح ہوا ہوگا۔ میرا پہلا شعر حاضر ہے۔

قبل آغاز کے انجام کا ڈر ہوتا ہے
دور اندیش بڑا تنگ نظر ہوتا ہے

مگر باجی نے ایک قصہ سنایا جو مجھے یاد نہیں تھا مگر باجی کے سنانے پر یاد آ گیا۔ میری پہلی کتاب ''میں سائے خود بناتی ہوں'' کی رونمائی کی تقریب تھی جہاں انہوں نے بتایا کہ یہ تمہارا پہلا شعر ہے۔ تم نے پہلا شعر چھ یا سات سال کی عمر میں کہا تھا۔ یہ سن کر میں حیران ہوگئی اور پھر...... یاد آ گیا۔

ہوا یہ تھا کہ شام کو تختی لکھا کرتی تھی کیونکہ رات کو پاپا سب کی تختیاں دیکھا کرتے تھے۔ میری تختی پر بال آ گیا تھا اور میں نئی تختی چاہتی تھی۔ امی کو دے دی وہ ناراض ہو گئیں اور مجھے ڈانٹ دیا کہ ابھی اس تختی پر لکھو۔ مگر میں روتی ہوئی آنگن میں بنے چبوترے پر جا بیٹھی اور زور زور سے رونے لگی۔ امی نے کئی بار ڈانٹا پھر تختی میری طرف پھینکی۔ مجھے چوٹ لگی اور تختی ٹوٹ گئی۔ عین اسی وقت باجی کمرے سے باہر آئیں۔ پوچھا کیا ہوا...... کیوں رو رہی ہو۔ تو میں نے کہا۔

تختی بنی، بن کر ٹوٹی
امی نے ہمیں مار دیا

تو قارئین لکھنے کے جراثیم شروع سے تھے مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نثر کی طرف دھیان دینے لگی۔ افسانے، ناول اور پھر 1998ء میں ٹی وی کیلئے ڈرامے لکھنے لگی اور لکھتی چلی گئی۔ اب تک 450 سے زیادہ ڈرامے لکھ چکی ہوں۔

س پہلا ڈرامہ کون سا لکھا اور ڈرامہ میں کن موضوعات پر لکھنا پسند کرتی ہیں؟

ج میرا موضوع زیادہ تر معاشرتی رہا ہے۔ کبھی جہاں روایات رشتوں کو جوڑتی ہیں اور خود ہی انہیں کسی بھی لمحے توڑ دیتی ہیں۔ کہیں ماں باپ سماج کے آگے مجبور ہو کر بیٹی کو بھینٹ

چڑھا دیتے ہیں۔ جہاں نہ اولاد کا حق ادا کیا جاتا ہے اور نہ اولاد اپنے فرائض نبھاتی ہے اور پھر چھوٹے چھوٹے گھروں میں جو بڑے بڑے طوفان اٹھتے ہیں ان کی شدت سب تباہ کر دیتی ہے۔

بے حسی، خودغرضی اور نفسیاتی مسائل میں گھرا انسان نہ خود اچھی زندگی گزار پاتا ہے نہ کسی اور کو گزارنے دیتا ہے۔ یہ موضوعات ہوتے ہیں میرے۔ میں کچلے ہوئے انسانوں پر لکھتی ہوں جن کے چہروں پر مسکراہٹ تو ہوتی ہے مگر اندر کے طوفان کی شدت اسے ایک ایسی سمت لے جاتی ہے جہاں وہ دھرتی پر بوجھ بن جاتا ہے۔ میری تحریریں ان کے لئے آسرا ہوتی ہیں۔ میں ان سب کو آئینہ دکھاتی ہوں کہ وہ اپنی غلطیاں دیکھیں اور جان لیں کہ ان کا انجام کیا ہے یا وہ اپنی غلطیاں درست کرلیں اور چین کی زندگی گزاریں۔

میرا پہلا ڈرامہ سیریل ''منزلیں'' تھا۔ جسے شیم برقی نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ وہ بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اس کے بعد بہت زیادہ مقبول ہونے والے سیریلز یہ ہیں۔ مہندی، چاندانی راتیں، ہم سے جدا نہ ہونا، انا، کہاں تم کہاں ہم، اجازت، مورت وغیرہ ہیں اور پی ٹی وی پر ایک ڈرامہ چلا تھا ''عورت کا گھر کون سا'' جس پر مجھے نیشنل ایوارڈ ملا اور میں بہت خوش ہوئی۔ پی ٹی وی ہماری درس گاہ تھا اور ہے۔

س 2000ء قبل کے پی ٹی وی ڈرامہ اور موجودہ ڈرامہ کو آپ کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

ج دیکھو ہر دور کا اپنا انداز، اپنا سچ اور اپنا جھوٹ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ زندگی ارتقاء کرتی ہے۔ ایک جگہ تھمی نہیں رہتی۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ اس میں روایات، سماجی پیچیدگیاں اور معاشی بدحالی بھی سنیارٹی ڈال دیتی ہے اور انسان بھی تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اسی لئے پہلے جیسا نہیں رہتا۔ پرانے ڈرامے اسی زمانے میں اچھے لگتے تھے اب اٹھا کے دیکھیں سوائے چند گنے چنے ڈراموں کے علاوہ آپ کو اچھے نہیں لگیں گے۔ ایک عرصے کے بعد ہمارے ڈراموں کا بھی یہی حشر ہوگا۔ اسی لئے ٹیکنالوجی اسی تیزی سے بدل رہی ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔ یقین کیجئے یہ ٹی وی چینل کے ڈرامے پیچھے رہ جائیں گے۔

س کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ڈرامہ شاعری سے زیادہ موثر ذریعہ ہے؟

ج شاعری سے ڈرامہ......؟ نہیں شاعری بالکل الگ چیز ہے۔ میری شاعری میں پوری کی پوری میں خود ہوں کسی کو اچھی لگتی ہے یا نہیں مجھے پروا نہیں ہوتی۔ ڈرامہ الگ چیز ہے۔ ڈرامے میں ہمیں بہت سی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ دیکھنے والوں کا، سنسر کا اور معاشرتی اور سماجی رویئے کا، ہمیں موضوع ڈرامے کیلئے معاشرے سے اٹھانا پڑتا ہے۔ شاعری ہماری ذاتی کیفیت ہے۔ ڈرامے اور شاعری میں بہت فرق ہے۔

س ڈرامہ کا مستقبل کیا ہے؟

ج ڈرامے کا مستقبل نہ بہت تاریک ہے نہ بہت روشن۔ دیکھیں، دنیا بدلتی جارہی ہے اور بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔ یہ بدلاؤ ڈرامے میں بھی آئے گا۔ پھر ہمارے معاشرے میں جو تبدیلیاں ہورہی ہیں، رسم و روایات بدل رہی ہیں، آج جس طرح ہماری نوجوان نسل سوچتی ہے ہمیں انہیں ساتھ لے کر چلنا ہوگا ورنہ فاصلہ بڑھ جائے گا۔ آج ٹی وی کے ڈراموں سے زیادہ ویب سیریز مقبول ہورہی ہیں۔ تھوڑے دنوں بعد آپ دیکھیں گی اور حیران رہ جائیں گی میڈیا بہت بدل جائے گا۔ ویسے ہماری دعا ہے کہ ڈراموں کا مستقبل روشن ہو کیونکہ اس فیلڈ سے بہت سے لوگوں کی روزی روٹی جڑی ہوئی ہے لیکن میں نئے آنے والے بچوں سے یہ کہوں گی کہ وہ پڑھیں، دنیا بھر کی چیزیں دیکھیں اور اندازہ لگائیں کہ کون سی تبدیلی آرہی ہے۔ اسی تبدیلی کو مدنظر رکھیں تو لکھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ دوسری ایک گزارش کروں گی کہ خدا کے واسطے اردو زبان کی شائستگی کا خیال رکھیں اور اس میں دوسری زبانوں کو ملا کر اردو کو کھچڑی نہ بنائیں۔

س کس صنف میں لکھ کر ذہنی سکون ملتا ہے؟

ج مجھے شاعری اور افسانہ لکھ کر سکون ملتا ہے۔ کبھی ایک نظم یا غزل پوری ہوجائے تو میں بہت خوش ہو جاتی ہوں۔ ڈرامہ لکھنا تو ہمارا پروفیشن ہے۔ میرے خیال سے کوئی ایسا موضوع نہیں بچا جس پر میں نے نہ لکھا ہو یا مجھے کسی موضوع پر لکھنے کی حسرت ہو، لیکن مجھ

میں ایک کوالٹی ہے کہ میں ایک ڈرامے کو بھی کئی زاویوں سے لکھ سکتی ہوں۔ صرف نظریہ بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

س آپ کی مکمل تصانیف اور ان کا تعارف؟

ج میں نے سات ناول لکھے ہیں جو نیٹ پر بھی موجود ہیں اور جو لوگ آج بھی پڑھتے ہیں مجھے ان کا فیڈ بیک ملتا ہے۔ وہ سات ناول یہ ہیں۔ 1۔ کمند 2۔ زرد پتوں کا بھنور۔ 3۔ اندھی رات کا بیٹا 4۔ کال بیل 5۔ چادر کے قیدی 6۔ کوری آنکھیں 7۔ آدھا وجود۔

س کیا ہمارا ڈرامہ دوسرے ممالک کے ڈرامہ سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟

ج میرا خیال ہے کہ ہاں...... ہمارا ڈرامہ دوسرے ممالک کے ڈراموں سے بہتر ہے۔ انڈیا کے ڈراموں سے تو بہت ہی بہتر ہے۔ وہ لوگ کیا لکھتے ہیں میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ ان کے معاشرے میں تو بہت خطرناک موضوعات ہیں مگر پتہ نہیں کیوں وہ لوگ جو چیزیں دکھاتے ہیں وہ سب مصنوعی لگتی ہیں۔

س شاعری کو آپ کس مقام پر دیکھتی ہیں؟ کیا آج معیاری شاعری ہو رہی ہے؟

ج شاعری بذات خود ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے مگر فی زمانہ شاعری کے ساتھ بہت ظلم ہو رہا ہے۔ جنہیں شاعری نہیں آتی وہ شاعری کے شوق میں مبتلا ہو کر یا تو الٹی سیدھی تک بندی کر کے خود کو شاعر یا شاعرہ سمجھنے لگتے ہیں یا پھر کسی سینئر شاعر کی معاشی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ان سے لکھوا کر مشاعروں میں پڑھتے ہیں اور یقین کریں کہ ایک شعر سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ ان کا ذاتی ہے یا خریدا ہوا ہے۔ یہ صورت حال کم از کم کراچی میں بہت خراب ہے۔ البتہ پنجاب میں نئے بچے بڑی نئی بات کر رہے ہیں اور خوبصورتی سے کر رہے ہیں۔

س آپ کبھی مشاعرے پڑھنے باہر کے ممالک میں گئیں؟

ج ہاں میں کئی ممالک میں مشاعروں میں بلائی گئی ہوں۔ قطر، بحرین، انگلینڈ اور امریکہ میں، میں نے کئی مشاعرے پڑھے ہیں۔

س غیر ممالک میں اردو ادب پر ہونے والے کام سے کیا آپ مطمئن ہیں؟

ج جی باہر ان تمام ممالک میں جہاں میں گئی ہوں، اردو سے بہت محبت کرنے والے لوگ موجود ہیں اور وہ سالانہ کئی تقریبات اور ادبی نشستیں کرلاتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی بھی ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے اردو نہ بولنے والوں کو بھی شاعری کی طرف ملتفت کر دیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ آپ حیران ہوں گی کہ عرب اردو شاعری کر رہے ہیں۔ فرانسیسی، مصری، ترکش، ازبکی، ایران اور انگریز اتنی اچھی شاعری کر رہے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ ان تمام ممالک میں اردو سیمینارز ہوتے ہیں۔ عالمی مشاعرے ہوتے ہیں اور بڑے عمدہ ہوتے ہیں۔

س کیا شاعری کی طرح ڈرامہ میں بھی گروہ بندیاں ہیں؟

ج ہاں جناب! گروہ بندیاں ہیں۔ اپنے اپنے گروپ بنا رکھے ہیں۔ ڈائریکٹر اپنے پسند کے آرٹسٹ کو ہی کاسٹ کرتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کردار کو سامنے رکھ کر کاسٹنگ کرتے ہیں۔ ان کے ڈرامے کامیاب ہو جاتے ہیں اور جہاں دوستیاں نبھائی جاتی ہیں وہاں..........

دیکھیں ادب میں گروہ بندیاں ادب کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہے اور میں نے کہا کہ کراچی میں ادبی صورت حال کافی نازک ہے۔ بہت کم ایسے مشاعرے دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں جن میں شرکت کا مزہ آتا ہے۔ میرے خیال میں اگر لوگ متشاعروں کو شاعر بنانے کی کوشش ترک کر دیں تو ہمارا ادب بچ سکتا ہے۔ ورنہ یہ سسک سسک کر دم توڑ دے گا۔

س کیا آج کی شاعری کو ادب برائے ادب کہا جا سکتا ہے یا ادب برائے زندگی؟

ج نہیں...... ادب برائے زندگی اب نہیں ہوتا۔ سوری میں بہت دکھی ہوں شاعری یا اردو سیمینارز کا حشر دیکھ کر۔ اس میں یہ خیال نہیں رکھا جاتا کون کس مقام پہ ہے بلکہ دوستیاں زیادہ نبھائی جا رہی ہیں اور میں مطمئن نہیں ہوں۔ کراچی میں ہونے والے بہت کم مشاعروں میں جاتی ہوں۔ جہاں سن لیتی ہوں کہ کچھ بہت اچھے شاعر آ رہے ہیں اور سینئرز بھی۔

س قدیم اور جدید شعرا میں کون کون پسند ہے؟

ج: مجید امجد کی نظمیں بہت پسند کرتی ہوں اور بار بار پڑھتی ہوں۔اس کے علاوہ سلیم کوثر بہت اچھے شاعر ہیں اور ماشاءاللہ حیات ہیں۔ویسے میر کو پسند کرتی ہوں اور پڑھا بھی کو ہے اور آج کے بچے بہت اچھا کہہ رہے ہیں۔ان میں بہت سے نام ہیں جنہیں سن اور پڑھ کر مجھے اچھا لگتا ہے۔

س: آپ کا پسندیدہ ڈرامہ کون سا ہے؟

ج: میرا پسندیدہ ڈرامہ مورت، اجازت اور آشتی ہے۔

س: اب تک کون کون سے یوارڈ حاصل کیے؟

ج: میں نے 31 ایوارڈ حاصل کیے ہیں جس میں نیشنل ایوارڈ بھی شامل ہے۔چار لکس ایوارڈ اور ''ہم'' ایوارڈ ہیں اور بھی بہت سے ہیں۔

س: نئے لکھنے والوں کے لئے کوئی پیغام؟

ج: میرا نئے لکھنے والوں کے لئے یہی پیغام ہے کہ ڈرامے کو صرف پیسہ کمانے کا ذریعہ نہ سمجھیں بلکہ آپ پر بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ آپ کا لکھا ہوا اور بنا ہوا ڈرامہ دیکھنے والوں پر بہت تیزی سے اثر انداز ہوتا ہے۔تو لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھا کریں کہ آپ کے قلم سے کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو معاشرے میں خرابی کا سبب بنے۔

صہیب مرغوب

س بچپن، تعلیم اور ابتدائی زندگی سے متعلق کچھ بتائیں۔

ج گنگا رام بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر چار پانچ فلیٹس تھے۔ ان میں سے ایک تھا۔ 27 جنوری 1950ء کو پیدا ہوا۔ 2007ء تک اسی بلڈنگ میں رہائش پذیر رہے۔ ایف سی کالج سے ایف ایس سی کیا۔ گریجوایشن پرائیویٹ کیا۔ باقی تعلیم بھی پرائیویٹ کی۔ کیونکہ یونیورسٹیوں میں وقت ضائع ہوتا تھا۔ پیدل چلنے کا بہت شوق تھا۔ بچپن سے اسکول اور کالج گھنٹوں کا راستہ...... پیدل چل کر جایا کرتا تھا۔ بچپن پاک بھارت جنگ میں گزرا۔ 1960ء میں پیدا ہوا تو 65ء میں جنگ ہوگئی۔ سائرن بجتے تو سیڑھیوں میں جا کر بیٹھ جاتے۔ چھ سال بعد اکہتر میں پھر جنگ ہوگئی۔ 1971ء کی ان دو جنگوں میں بچپن گزرا۔ چنے اور گڑ کھا کے۔

س صحافت کی طرف حادثاتی طور پر آئے یا منصوبہ بندی کے تحت؟

ج دو تین چیزیں مجھ میں پیدائشی طور پر ہیں۔ مثلاً میں ہر کام کی باریکیوں میں چلا جاتا ہوں۔ کھوج لگانے اور جستجو کی عادت بچپن سے تھی۔ اس زمانے میں شاعری کا جنون ہوا۔ اپنی طرف سے زبردستی شاعری کی۔ بھٹو صاحب پر کتاب مرتب کی۔ صفدر ہمدانی پروڈیوسر تھے۔ مسعود منور صاحب سے پیش لفظ لکھوایا۔ مسعود منور صاحب نے ریمارکس دیے کہ انتہائی بے وزن شاعری ہے لیکن خیالات اچھے ہیں۔ سکول کے زمانے میں والد صاحب ریڈیو اور ٹی وی پر ٹاکس کیا کرتے تھے تو انہوں نے ساتھ لے کر جانا، اسٹیشن ڈائریکٹر ہوتے تھے راحت کاظمی صاحب، تو میں نے ریڈیو پر پروگرام کرنا شروع کیا جب میں ساتویں

کلاس میں ہوتا تھا۔ایف سی کالج میں یونیورسٹی میگزین پروگرام شروع کیا۔

شاعری کا بھوت بے وزن شاعری کرکے اپنے سر سے اتارا۔اس کتاب کو میں نے چھاپا بھی۔مختلف اسٹالز پر جا کے رکھوایا بھی۔جب مختلف اسٹالز پر رکھوایا،اس کے بعد جنرل ضیاء صاحب نے نثری تقریر میں سنسر شپ عائد کر دی،ایسے لٹریچر پر پابندی عائد کر دی۔ میری کتاب کا کیا بنا۔یہ کالج کے دنوں کی بات ہے۔ریڈیو پر یونیورسٹی پروگرام صفدر ہمدانی کے پاس تھا۔میں نے ایک بے وزن غزل لکھی۔اس کے 7 شعر تھے۔ہمدانی صاحب نے اس کو وزن میں ڈھالا۔

زندگی کا درد آنکھوں میں اتر کر آ گیا
بستیوں پر آنسوؤں کا کون مینہ برسا گیا

میرے سات شعر تھے،ہمدانی صاحب نے پانچ واپس کیے۔میں نے کہا یہ میرے دو شعر پی گئے ہیں۔جب فائنل ریکارڈنگ تھی میں نے پوری غزل ری رائٹ کی۔اس میں وہ دو شعر بھی ڈال دیے۔تبسم کاشمیری صاحب پروگرام کے میزبان تھے۔میرے ساتھ یونیورسٹی کے دو اور نوجوان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔میں نے تیسرے نمبر پر ایک شعر گھسایا ہوا تھا۔جب میں نے وہ شعر پڑھا تھا تو لائٹ بند ہو گئی اوپر سے۔میں نے تبسم کاشمیری کی طرف دیکھا تو وہ بے بسی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے کہا یہ کیسے آ گیا۔میں نے کہا اس پہ پانی گر گیا تھا۔اس لئے ری رائٹ کر لی غزل۔انہوں نے کہا اس میں یہ دو شعر تو نہیں تھے۔بعد میں انہوں نے کہا یہ نہیں پڑھنی۔ بے وزن شاعری کا کافی کریڈٹ جاتا ہے مجھے۔

ٹائم کا بڑا پابند ہوں۔ہمیشہ سے اسکول کے کلاس رومز کے سارے دروازے میں نے کھولے ہیں بلکہ جوان کے اسٹاف ممبر ہوتے تھے وہ تو آئے نہیں ہوتے تھے تو میں چھ بجے سارے دروازے کھولتا تھا۔

جب ایف سی کالج کا Exam ہوا اس لئے میرے نمبر کم آئے کہ مجھے ہر چیز کا گہرا

تجزیہ کرنے کی عادت تھی اور وہ اتنا گہرا کہ شاید ٹیچر کو بھی نہ پتہ ہو۔ اس زمانے میں میں نے بلیک ہول پہ ایک سائنس کی کتاب لکھی۔ جو 70 یا 80 صفحات پر مشتمل تھی، جو کسی نے شائع نہیں کی۔ شیخ نیاز صاحب کا بہت بڑا شوروم ہوتا تھا۔ ان کے پاس گیا۔ انہوں نے پہلے مجھے دیکھا پھر کتاب کو دیکھا کہا ہم نہیں شائع کر سکتے۔ ایسے کئی پبلشرز کے پاس پھیرے لگائے مگر سب نے کہا ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔

77ء میں جب امتحان دیا اور اس کے بعد جو چھٹیاں آئیں میں نے مکتبہ شاہکار جوائن کیا۔ عطش درانی صاحب چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ''قافلہ'' ہوتا تھا اس کا ڈپٹی ایڈیٹر بنا۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا معلومات کی دو جلدیں بنائیں جو رکی ہوئی تھیں۔ 32 اور 33 نمبر انڈیکس قاسم صاحب نے تیار کیا۔ کتابیں میں نے مرتب کیں۔ اس وقت میں انٹر میں تھا۔ بعد میں اس انسائیکلو پیڈیا کا کراچی میں راجہ ظفر الحق نے افتتاح کیا۔ یہ جو 33 جلدیں جب شائع ہوئیں تو اس میں سے ان تمام لوگوں کے نام غائب تھے، جنہوں نے مختلف مراحل میں کام کیا تھا۔ میرے سمیت کسی کا نام اس میں پذیرائی حاصل نہ کر سکا۔

س اس کی کیا وجہ تھی؟

ج بہر حال جو پرنٹر ہوتا ہے، پبلشر ہوتا ہے وہی ہر چیز کا رائٹر بھی ہوتا ہے۔ سید قاسم محمود صاحب یہاں سے اچانک کراچی چلے گئے۔ اس زمانے میں تمام چیزیں شاید ردی کے بھاؤ دے دی ہوں گی۔ اس زمانے میں پھر میں نے بھٹو صاحب پر 5 کتابیں Complete کیں۔

س بھٹو پر آپ اپنے آپ کو اتنا فوکس کیوں کرتے تھے؟

ج بات فوکس کرنے کی نہیں، بات مارکیٹ کی ہوتی ہے۔ سید قاسم محمود صاحب پر اس زمانے میں بہت قرضے چڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک ناول ٹرانسلیٹ کرایا۔ The promise اس کا نام ستار طاہر صاحب نے تجویز کیا۔ ''پیمان وفا'' آپ 77 کے بعد کا

دور مدنظر رکھیں تو وہ پیمان وفا یا اس طرح کی چیزوں کا نہیں تھا۔ زمانہ تھا بھٹو کی زبردست مخالفت کا یا زبردست حمایت کا۔ میں نے سید قاسم محمود صاحب سے کہا کہ اگر آپ نے اپنے قرضے اتارنے ہیں تو یہ جو ڈیشنگ نما چیزیں ہیں ان کی جگہ ''قافلہ'' میں ہے۔ قافلہ میں سیر اچھی تھی۔ جیسے انگلش لٹریچر کے کلاسیک ہیں وہ چھ چھ کے ٹرانسلیشن ایک ساتھ شائع کریں لیکن آپ جانتے ہیں ہمارے ہاں کلاسیک کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ بہت محدود سا طبقہ ہے جو ان لوگوں کو پڑھتا ہے لیکن قاسم صاحب ان لوگوں کو اپروچ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ صلاحیت سے میرا مقصد ہے Advertisement وہ اشتہار بازی کا زمانہ تو نہیں تھا۔ اشتہار مہنگے تھے۔

س بطور صحافی آپ کو بیرون ملک پاکستان کی نمائندگی کرنے کا کہاں کہاں موقع ملا؟

ج دوسرے صحافیوں کے برعکس غیر ملکی سفر کا کوئی شوق نہیں۔ دو چار یا پانچ دورے ایسے ہیں جو مجھے زبردستی کرنا پڑ گئے۔ شاید میں ان سے فرار ہو جاتا۔ اگر پھنس نہ جاتا۔ مثلاً آفس نے مجھے 1989ء میں عراق بھیجا۔ عراق کا سرکاری ٹرپ تھا۔ صدام حسین نے اپنی ہسٹری میں پہلی بار الیکشن کرائے تھے جہاں سارے گئے تھے اور کہہ رہے تھے بڑا دیانتدارانہ الیکشن ہیں۔ وہاں مجھے جا کر پتہ چلا کہ ہر تیسرا آدمی صدام کی سکیورٹی کا ایجنٹ ہے۔ وہاں جا کر مجھے احساس ہوا کہ پاکستان کی میڈیا انڈسٹری انتہائی نوزائیدہ حالت میں ہے کیونکہ میرے ساتھ جو صحافی برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے تھے، وہ اپنے ہیلی کاپٹر اور ہوائی جہاز کرانے کے چکر میں تھے۔ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ ہم اس کا سوچ بھی سکتے۔

س بطور صحافی آپ کو بیرون ملک نمائندگی کرنے کا کہاں کہاں موقع ملا؟

ج دیکھیں جی ایک تو وہ دورہ تھا اس کے بعد ظاہر ہے جو رپورٹ لکھی وہ عراق گورنمنٹ کو پسند نہیں آئی ہو گی۔ کیونکہ اس میں ہم نے آغاز میں لکھا۔ صدر صدام حسین کی خفیہ پولیس کے سائے میں جو الیکشن ہوئے وہ منصفانہ نہیں تھے۔ اس کے بعد امریکن

گورنمنٹ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے مجھے مدعو کیا۔ 1982ء میں اس دورے سے بھی شاید میں آخری وقت میں بھاگ جاتا۔ مگر سین ایسا بن گیا کہ مجھے جانا پڑ گیا۔ ایک ماہ کا دورہ تھا۔ چھ سات ریاستیں تھیں۔ بہرحال اس دورے میں وژن بہت تبدیل ہوا اور امریکیوں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ ہم لوگ دشمن پیدا کرنے کے ماہر ہیں اور ہماری حکمت عملی اتنی کمزور ہے کہ ہم بلاوجہ دوسروں کو دشمن بنا لیتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک ماہ کے قیام کے دوران ان کی عوام میں کچھ ایسا محسوس نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کے مخالف ہیں یا وہ پاکستان کے مخالف ہیں بلکہ عام آدمی کو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ پاکستان بھی کوئی ملک ہے۔ بہت سے لوگ کہتے تھے اچھا یہ عمران خان کے ملک سے آئے ہیں یا بے نظیر کے ملک سے آئے ہیں، تو ہماری طرح ایک عام امریکی اتنا سیاسی نہیں ہے جتنے ہم سیاسی ہیں۔ یہاں تو موچی اور دھوبی بھی قومی امور پر تبادلہ خیال کرتا ہے، وہاں ایم اے پاس بھی قومی امور پر تبادلہ خیال نہیں کرتے صرف جوان امور کے ماہر ہیں وہ تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ ہمیں جس چیز کا نقصان ہے وہ یہ کہ ہم تمام ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس میں ان کے یہودیوں کے زیر اثر میڈیا ہے۔ وہ اس کو بہت اچھالتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری عوام میں امریکہ کی تو بات نہیں کرتا۔ اگر یہاں ہندو بھی آ جائیں تو ان کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ میرا اندازہ بھی ہے اور تجربہ بھی ہے۔ یہاں اٹل بہاری واجپائی آئے تو ہم نے ان کا بڑا استقبال کیا۔ ایک دو جماعتوں کے علاوہ سب نے کیا لیکن جب ہمارے سوشل میڈیا پر یا ویسے میڈیا پر یہ خبر آتی ہے کہ ہم نے فلاں ملک کا پرچم جلا دیا، اسی وجہ سے میں نے سوشل میڈیا پر بہت دشمنیاں مول لیں۔ اب استعمال نہیں کرتا۔ اس پر بے تحاشا لوگوں نے پوسٹیں لگائی ہوتی ہیں۔ آج میں نے امریکہ کے جھنڈے کو جلایا۔ امریکہ مردہ باد وغیرہ۔ میں نے سب کو یہی مشورہ دیا کہ ہم کون ہوتے ہیں کسی قوم کو مردہ باد یا زندہ باد کہنے والے۔ ہاں تو سب قومیں اللہ کی تخلیق ہیں۔ ہاں رویوں پر بات ہونی چاہئے۔ ہم جب کسی قوم کا پرچم جلاتے ہیں تو اسے بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ کیونکہ اگر کوئی میرے ملک کا جھنڈا جلائے

تو میں ساری رات سو نہیں سکوں گا۔تو اس طرح ہم کسی اور ملک کا جھنڈا جلاتے ہیں اور اس کے اخبار میں چھپتا ہے تو اس ملک کے شہری بھی شاید ساری رات سو نہ پائیں۔ہم جب دشمنیاں پالتے ہیں اس طریقے سے اس کا اظہار وہاں کے میڈیا پہ ہوتا ہے۔میں نے ایک ماہ کے دورے کے دوران یہ محسوس کیا کہ امریکی عوام کے پاس تو وقت نہیں ہے سیاسی باتیں کرنے کا اور یہی حال یورپ کا ہے کہ وہ جو میڈیا میں آجاتا ہے اس کو مان لیتے ہیں۔اس لئے جب ان کے میڈیا میں یہ خبر چھپتی ہے کہ آج پاکستان نے امریکہ کو مردہ باد کہا ہے تو ان کا ردعمل ان میں ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا ہے کہ امریکی عوام اپنی رائے کو بھی بدلنے پر تیار رہتے ہیں اگر ان کو Convince کرلیا جائے۔میرے اپنے تجربے ہیں ہوسکتا ہے غلط بھی ہوں۔جب ہم شخصیات کے خلاف مہم کو قوموں کے خلاف مہم میں تبدیل کردیتے ہیں تو ملک خلاف ہو جاتے ہیں۔امریکہ اور یورپ کے میڈیا میں انتہا پسند ہم سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔اس کے بعد برطانیہ، قطر اور کئی اور ممالک میں بھی جانے کا اتفاق ہوا لیکن بہت سے دورے میں نے مسترد بھی کیے۔مسترد سے مطلب مختلف جگہ سے دعوت نامے آئے، ریٹرن ٹکٹ بھیجے گئے۔اس کی بنیادی وجہ نہ جانے کی یہ ہے کہ میرے جیسا کوئی بندہ جب باہر سے ہو کر یہاں آتا ہے تو اسے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔کیونکہ وہاں کے معاشرے میں اخلاقی اور دیگر حوالوں سے بڑی خوبیاں ہیں اور یہاں آکر جب وہ اس سے الٹ معاملات نظر آتے ہیں تو پھر دکھ بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔میرے بہت سے دوست ہیں جو باہر مقیم ہو گئے مگر جب انہوں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تو وہ یہاں آکر ایڈجسٹ نہیں ہو پائے۔

س آپ کو بڑے صحافیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، جواب اس دنیا میں نہیں ہیں۔چند ایک کا ذکر کریں اور کس کس کے ساتھ قربت رہی؟

ج ان میں نذیر ناجی صاحب کے ساتھ میں نے بہت کام کیا اور پاکستانی صحافت میں لوگوں سے ملاقاتوں کا کوئی اتنا وسیع تجربہ نہیں ہے لیکن جتنا میرا ذاتی تجربہ ہے اور میں نے

لوگوں سے سنا ہے میں نذیر ناجی صاحب کو 100 میں سے 500 نمبر دیتا ہوں کیونکہ کسی بھی شعبے میں آپ چلے جائیں وہاں ایسے لوگ ملیں گے جو نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے لیکن نذیر ناجی صاحب نے ہمیشہ نئے آنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں اپنی بات کہوں تو جب وہ فورم کے انچارج تھے، انہوں نے میری انگلی پکڑی میں ان کے ساتھ پولیٹیکل پیج بھی کرتا رہا ہوں، جتنی حوصلہ افزائی وہ کر سکتے تھے اس سے بڑھ کر کی۔ ارشاد احمد حقانی صاحب کے ساتھ کام کیا۔ ان سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ اظہر مسعود صاحب کے ساتھ کام کیا۔ ان کے بارے میں رائے تھی کہ وہ خبر دیکھ کے انداز ہ لگا لیتے تھے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ عقابی نگاہوں سے کسی چیز کو پرکھنے کی عادت ان سے سیکھی۔

س صحافیوں کو حکومت کی طرف سے پلاٹ اور دیگر مراعات جو دی جاتی ہیں، ان کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج جنگ میں، میں نے 36 سال گزارے۔ اس عرصہ میں صحافیوں کو پلاٹ اور پیسے دینے کی بہت سی لہریں اٹھیں۔ جوہر ٹاؤن میں پلاٹ الاٹ کئے گئے۔ اس لہر میں مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب پلاٹ تقسیم ہو گئے۔ کمیٹیاں بھی بنیں، بہت سے نئے آنے والے بھی فیض یاب ہو گئے لیکن چونکہ میں ایسی بک جس کو گڈ بک کہتے ہیں، اس کتاب میں میرا نام شامل نہیں رہا تو میرا نام اس حوالے سے جو مشکوک لسٹ ہوتی ہے اس میں شامل رہا۔ 1998ء میں نواز شریف دور میں ان تین صحافیوں میں تھا جن کی لسٹ بنائی گئی کہ ان کو برطرف کر دیا جائے۔ ملیحہ لودھی، ارشاد حقانی اور صہیب مرغوب۔ مجھے یہ جنگ گروپ نے نہیں بتایا لیکن باہر سے پتہ چلا کہ میرا نام بھی شامل ہے۔ بلکہ چھ سات ماہ تک مذاکرات چلتے رہے اور جنگ زیر عتاب رہا لیکن میں نے خود پھر اس زمانے میں Sunday magazine چھوڑ دیا تا کہ پریشر کم ہو۔ حقانی صاحب کے ساتھ بھی معاہدہ ہو گیا کہ وہ دو کالم کم لکھیں گے۔ انٹرنیشنل ریلیشنز پر بھی لکھیں گے۔ ملیحہ لودھی کے ساتھ بھی اس طرح کا

طے ہو گیا۔ میرے بارے میں ان کا فلسفہ تھا کہ اس بندے کو تو نکال ہی دو۔ کافی سینگ پھنسے رہے اور شیطان کی آنت کی طرح یہ فہرست دراز ہوتی گئی اور بعد میں یہ 33 تک چلی گئی۔ اب ایسے شخص کو جو ہر دور میں مشکوک ہو اس کے ساتھ پیسوں یا پلاٹوں کی سیاست ہو نہیں سکتی، بہت سی آفرز بھی ہوئیں لیکن میں نے ہمیشہ اپنی مرضی سے لکھا۔

س زندگی میں کبھی کسی سے محبت ہوئی؟

ج دیکھیں مجھے دو تین چیزوں کی کبھی سمجھ نہیں آئی۔ ایک یہ کہ یہ سالی محبت کیا ہوتی ہے۔ اس کی مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی۔ ہاں البتہ ملنا جلنا رہا ہے۔ اگر آپ اس کو محبت کہتے ہیں۔ چھ سات خواتین وحضرات سے اس میں سے حضرات نکال دیں تو میں نے ایک PIA پہ رائٹ اپ لکھا تھا جس میں میں نے بتایا تھا کہ جو جہاز ہے، اس کی بناوٹ کیسی ہے۔ کچھ چیزیں جو کمزور رکھنی ہیں ان کو دانستہ کمزور رکھا گیا ہے، جیسے اس کا شیشہ ہے اس پہ اگر آپ تین ہارس پاور کا مکا ماریں گے تو ٹوٹ جائے گا۔ ایسے اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو ہر چیز کے دو دو تین تین سسٹم ہیں۔ انجن دو ہیں، اگر ایک بند ہو بھی جائے گا تو دوسرا سانس لینے کے لئے ہو گا اور ہوا کے تین راستے ہیں۔ دو بند ہو جائیں گے تو پھر بھی سانس آتی رہے گی۔ اس کے بعد کافی ایئر ہوسٹسز کے فون آئے۔ ایک کے گھر آتا جاتا بھی رہا۔ اس کے بعد ایک اسٹوڈنٹ تھی اس نے تو جان ہی نہیں چھوڑی۔ کبھی اس پارک میں کبھی اس پارک میں اور میں حسب عادت اور حسب روایت وعدہ کر کے کبھی نہیں پہنچا۔ پھر اس کی شادی بھی ہو گئی۔ دو بچے بھی ہو گئے تب بھی اس کے فون آتے رہے۔ میں نے پھر بیگم کی بات کرائی۔ یہ سلسلہ ہے اس نے کہا کوئی بات نہیں میں ایڈجسٹ کر لوں گی۔ ایک ماڈل ٹاؤن میں رہتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی تھوڑا بہت ملنا جلنا رہا۔ اس کے ساتھ مل کر فوٹو گرافی بھی کر لی۔ اس شوق نے فوٹو گرافر بھی بنا دیا۔

س آپ کی زندگی کا کوئی خواب جس کی فوری تکمیل چاہتے ہوں؟

ج میں قطعی طور پر جذباتی آدمی نہیں ہوئی۔ کوئی ایسی پلاننگ کرتا نہیں ہوں جو "فوری"

طور پر منحصر ہوں۔ بہت دور اندیش آدمی ہوں اور بڑی لانگ ٹرم پلاننگ کرتا ہوں اور زندگی میں مجھے کچھ ایسے مسئلے درپیش نہیں آئے کہ فوری پلاننگ کی ضرورت پڑ جائے۔

س آپ نے بھرپور صحافتی زندگی گزاری ہے، اس میں بڑے بڑے دلچسپ واقعات بھی رونما ہوتے ہوں گے۔ایک دو قارئین سے شیئر کریں گے؟

ج میں قارئین سے ایک بات شیئر کرنا چاہوں گا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنا حق لے سکتے ہیں۔میں نے 8 یا دس مقدمات لڑے ہیں اور اپنا حق حاصل کیا ہے۔اسکول کے زمانے میں جب کالج میں رزلٹ آیا ایف ایس سی کا تو میرے نمبر کم تھے۔ظاہر ہے میری ہینڈ رائٹنگ بہت خراب تھی۔پھر میں نے برٹش کونسل اور امریکن سنٹر کا سہارا لیا تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔میں نے جا کر بورڈ میں مارکنگ کو چیلنج کیا اور ان کو میں نے لیگل نوٹس بھیجا کہ آپ نے قابل اعتماد سسٹم قائم نہیں کیا۔میرے پرچے بغیر فیس کے ری چیک کریں۔اس زمانے میں یہ پرچے مارکیٹ میں بیچ دیتے تھے۔ان دنوں شاپر تو پولی تھین کے تھے نہیں تو دکاندار اس میں چیزیں بیچا کرتے تھے۔میں نے وہ سارے لفافے اکٹھے کئے اور اس میں جہاں جہاں مارکنگ کی غلطیاں تھیں ان کی نشاندہی کر کے جنرل ضیاء الحق کو بھیج دیں۔مجھے لیٹر ملا جنرل عبادی کی جانب سے کہ آپ کا کیس ہم نے چیئرمین بورڈ کو بھیج دیا ہے۔خواجہ غلام فرید صاحب چیئرمین ہوتے تھے اور ڈپٹی کنٹرولر تھے۔اقبال بٹ مولوی اصغر تھے۔اسسٹنٹ کنٹرولر سیکریسی مجھے ایک دن چیئرمین صاحب کا خط ملا کہ چیئرمین صاحب گیارہ بجے ہفتے کے دن بالمشافہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔بوقت ملاقات انہوں نے پوچھا دو کروڑ کا لیٹر آپ نے لکھا ہے۔میں نے کہا جی ہاں۔تو کہتے ہیں اس سے آپ کو پتہ ہے کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔یہ کہ دو کروڑ کا لکھا ہے تو آپ تو پاگل ہی ہیں۔میں نے کہا ہاں دو کروڑ کی رقم کوئی معمولی نہیں ہوتی۔میں نے کہا کہ میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ کیا لکھا ہے، آپ بھی لگالیں۔اس کے بعد چونکہ خواجہ صاحب فلاسفی کے ٹیچر تھے، بڑی بحث ہوئی۔ان کے ساتھ Subjective اور Objective مارکنگ پر انہوں نے کہا یہ اردو انگریزی جیسے نمبر تو

ہیں نہیں۔ ان میں آپ کے نمبر نہیں ہوئے ہوں گے۔ پونے دو گھنٹے بحث ہوئی۔ ایک ایف سی کے طالب علم نے فلاسفی کے ماہر چیئرمین بورڈ کے ساتھ میٹنگ کی۔ اس سے پہلے مجھے کنٹرولر امتحان نے گھر میں وہ فارم بھجوایا کہ آپ یہ بھر کر بھیج دیں۔ ساتھ بیس روپے دے دیں تو ہم آپ کے پرچے دوبارہ چیک کر دیتے ہیں۔ اتنا میں نے ان کو تنگ کیا۔ اپنے خطوں کے ذریعے اور خط لکھنے کے لئے میں نے امریکن سنٹر میں قانون کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ اس وقت ڈائریکٹر یا ڈپٹی ڈائریکٹر ہوتے تھے۔ اسلم مجاہد صاحب۔ انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ کیا دیکھ رہے ہو۔ یہاں پر میں نے کہا جی ثانوی تعلیمی بورڈ مجھے خطوں کا جواب نہیں دیتا تو میں وہ دیکھ رہا ہوں کہ کون سا ایسا قانون ہے جو خطوں کا جواب نہ دینے والے پر اپلائی ہوتا ہو تو انہوں نے کہا یہ تو آپ کو یہاں نہیں ملے گا۔ یہ تو امریکہ کا قانون ہے۔ میں نے کہا شاید کوئی راہنمائی مل جائے۔ انہوں نے پھر مجھے کمرے میں بلایا، چائے پلائی۔ پھر کسی وکیل سے بات کی۔ اس نے کہا ٹاٹ کا قانون ہے لیکن یہ یہاں پڑھایا جاتا ہے نافذ نہیں ہوتا۔ میں نے ٹاٹ کے قانون کے تحت ان کو لیٹر بھیجا۔ میں نے کہا انہوں نے کون سا پڑھا ہو گا یہ نافذ نہیں ہوتا۔ قانون تو قانون ہے تو اس دوران ان کو جنرل ضیاء کا لیٹر بھی آ گیا۔ اس کے بعد جواب دیا کہ ہم نے آپ کے پرچے ری چیک کئے ہیں تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں پاکستان کا واحد آدمی ہوں جس کے پرچے بورڈ نے بغیر فیس کے چیک کئے۔ اس کے علاوہ میں نے اور بھی مختلف محکموں کے خلاف مقدمات اصولوں کی بنیاد پر جیتے۔

س آپ کی طرف سے جو پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں وہ اکثر سچ ثابت ہوتی ہیں۔ کیا آپ کے پاس بھی کوئی چڑیا ہے؟

ج زندگی میں دو پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئی ہیں، باقی اللہ کے فضل سے سب درست ثابت ہوئی ہیں۔ جہاں تک چڑیا اور طوطا مینا کا تعلق ہے تو میں 99 فیصد تجزیے گراف روٹ پر بیٹھ کر کرتا ہوں۔ 50 فیصد تجزیے Information پر کرتا ہوں۔

مجھے PA کے کمرے بہت پسند ہیں۔ مجھے اپنا بطور صحافی تعارف کروانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ ابھی بھی مجھے بہت سے لوگ نہیں پہچانتے ہوں گے۔ میں جہاں بیٹھا ہوں گا ایسے گوتم بدھ کی طرح، لوگ سمجھیں گے یہ پتہ نہیں کون بیٹھا ہوا ہے۔ ایک وزیر تھے میں ان کو پنجاب اسمبلی ملنے ان کے کمرے میں گیا۔ وہ اپنی گپ شپ میں لگے رہے۔ کابینہ کا اجلاس ہوا تھا اس دن۔ میں کابینہ کی مخبری لینے گیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے فلاں نے یہ کہا، میں نے یہ کہا۔ فلاں نے یہ کہا میں نے یہ کہا۔ ان کو خیال ہی نہیں آیا کہ جو سامنے بیٹھا ہے وہ اخبار میں ہے۔ وہ سمجھے کہ کوئی ملاقاتی ویسے گھس آیا ہے۔ جس کا کام میں نے نہیں کرنا۔ 20 منٹ بعد انہوں نے پوچھا تو بتانے پر پتہ چلا ان کو۔ اس طرح بیٹھنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے جتنے بھی کابینہ کے اجلاس ہوئے اس زمانے میں وہ سارے میں نے چھاپے۔ ایک لاء منسٹر ہوتے تھے۔ ان کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ فون پر بات کر رہے تھے۔ اچھا بینک بنانا ہے اچھا ٹی وی تو اس میں نہیں ہے۔ اچھا سٹیٹ بنک...... جیسے کوئی جان بوجھ کے ادھوری بات کر رہا ہوتا ہے تو انہوں نے مجھے کہا کہ کچھ لوگ ملنے آ رہے ہیں وہاں ایک اور جگہ ہے، وہاں آپ جا کر بیٹھیں پھر ملتے ہیں۔ وہاں میں نے 45 منٹ انتظار کیا تو خبر آ گئی۔ پنجاب حکومت ٹی وی اسٹیشن نہیں بنا رہی۔ ان دنوں یہ نعرہ بہت پاپولر تھا جاگ پنجابی جاگ۔

یہ خبر میں پیٹ میں لے کر گھر آ گیا۔ میں نے پھر ایک رائٹ اپ جنگ میں لکھا کہ پنجاب حکومت دو بینک بنائے گی اور ٹیلی ویژن بنانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اس کے بعد ایک بیت المال بنا اور ایک پنجاب بینک بنا۔ تو میں تجزیے تبصرے اس طرح گراف روٹ پہ کرتا ہوں اس طرح اور بھی بہت سی پیشین گوئیاں ہیں جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں۔ جیسا کہ کئی دہائیوں سے بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خاتمہ کی خوشخبری مختلف حکومتوں کے ادوار میں عوام کو سنائی جاتی رہی اور میں نے ہمیشہ حقائق پر مبنی رائٹ اپ لکھ کے عوام کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایسا ممکن نہیں۔

س اب تک آپ کتنے رائٹ اپ لکھ چکے ہیں اور کیا حکومتی سطح پر آپ کا اعتراف کیا گیا؟

ج اگر آپ گوگل پر سرچ کریں گے۔ صہیب مرغوب تو آپ کو ایک چیز آئے گی۔ Most popular name of 1980 and 1990 ان دو دہائیوں میں کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر میں نے نہ لکھا ہو۔ سیاست، خواتین، بچے، جرم، فلم وغیرہ کوئی ایسا پنگا نہیں ہے جس میں میں نے ہاتھ نہ ڈالا ہو اور کام میں بہت باریکی اور گہرائی سے معاملے کی تہہ تک جانے کا مجھے جنون ہے۔

س قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج پیغام یہ ہے کہ دیکھیں جتنے بڑے بڑے لوگ ہیں۔ انہوں نے اپنی کامیابی کے سفر کا آغاز پہلے قدم سے کیا ہے، یعنی چھوٹے پیمانے پر دنیا کا جو سب سے بڑا بک سیلر ہے جس کا ساڑھے چار ارب ڈالر کا ٹرن اوور ہے، اس نے اپنے کام کا آغاز اپنے گھر کے گیراج میں کتابیں رکھ کر کیا۔ اس طرح کئی بڑے لوگ ہیں جن کی زندگی کا آغاز کچرا چننے سے ہوا۔ کئی کے پاس ایک وقت کا کھانا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے میرا نوجوان نسل کے لئے پیغام ہے کہ اگر وہ کچھ بننا چاہتے ہیں تو کسی بھی کام سے آغاز کرنے میں عار محسوس نہ کریں۔

ظہور الاسلام جاوید

س ادب کی طرف رجحان کیسے ہوا۔

ج بچپن ہی سے ملنے والے ادبی ماحول کا خاص اثر رہا۔ پہلی غزل 1966ء میں مشہور ادبی رسالے عکس لطیف میں شائع ہوئی۔ ریڈیو پاکستان کراچی کی بزم طلباء میں کئی بار شرکت کی۔ 68-1967ء میں ریڈیو پاکستان کراچی کے ہفتہ طلباء کے بین الکلیاتی مشاعرہ میں پہلا انعام حاصل کیا۔ جامعہ کراچی سندھ، مسلم سائنس کالج کراچی اور دیگر اداروں سے انعامات وصول کئے۔ پھر مجھے ٹیکنالوجسٹ رسالے کا ایڈیٹر انچیف بھی مقرر کر دیا گیا۔

س فروغ ادب کے لئے کیسے وقت نکال پاتے ہیں؟

ج اللہ تعالیٰ نے ایسے روزگار کے مواقع عطا فرمائے کہ ان ادبی سرگرمیوں کے لئے وقت نکالنا مشکل نہیں رہا۔ اگر ایسا کہوں تو زیادہ بہتر رہے گا جس کام میں بھی نیت صاف ہو اور حوصلے بلند ہوں تو اللہ تعالیٰ بھی وقت میں برکت ڈال دیتے ہیں۔

س اپنی فیملی کے بارے کچھ بتایئے؟

ج میرے پانچ بچے ہیں۔ ڈاکٹر احمد انعام، اسماء ندیم، ڈاکٹر یاسر انعام اور ربیعہ ذیشان جو خوشگوار ازدواجی رشتوں میں بندھ چکے ہیں۔ جبکہ ایک بیٹا منصور انعام ہمارے ساتھ ہے جو اللہ کی رضا سے ہمارا سہارا ہے اور ہم اس کے سہارے ہیں۔ گویا مجھے کبھی کوئی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا (عاجزی سے) الحمدللہ۔

س اب تک کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج مجموعہ کلام ''موسم کا اعتبار نہیں'' شائع ہوا جبکہ اپنے والد محترم انعام گوالیاری کے

نعتیہ مجموعہ کلام ''سب اچھا کہیں جسے'' اور مجموعہ کلام ''نغمہ زیرلب'' کے علاوہ ظہور گوالیاری کے مجموعہ کلام ''فروزاں ہیں چراغ آرزو'' کی ترتیب وتدوین بھی کر چکا ہوں۔

س: آپ صحافت سے بھی منسلک رہے یہ سفر کیسا رہا؟

ج: جی الحمد اللہ شعبہ صحافت کے حوالے سے جنگ اور مشرق سے منسلک رہا اور اب یونیورسل اردو پوسٹ کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے منسلک ہوں۔ روزنامہ اردو ایکسپریس، روزنامہ الشرق میں کالم نگاری بھی کرتا رہا جو بعدازاں میری بڑھتی ہوئی ادبی مصروفیات کی نذر ہوگئی۔ ہاں ایک اور بات...... کہ میری ادارت میں امارات کا پہلا اردو رسالہ 1980ء ''لالہ صحرا'' شائع ہوا تھا جو بہت مقبول ہوا۔

س: منعقد ہونے والے عالمی مشاعروں سے قارئین کو کچھ بتایئے؟

ج: اب تک دس عالمی مشاعرے منعقد ہو چکے ہیں۔ جن میں عالمی اردو مشاعرہ مئی 2002ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ مئی 2003ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ مئی 2004ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ مئی 2009ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ مئی 2010ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ 2015ء ابوظہبی شامل ہیں اور اس کے علاوہ بامِ شعر وادب الامارات کے تحت مشاعرہ 1986ء ابوظہبی، مشاعرہ 1985ء العین اور مشاعرہ 1986ء دبئی کے انتظامی امور میں شامل تھا اور یہ اللہ کا خاص کرم ہے ہر مشاعرہ ہی کامیاب اور یادگار رہا ہے۔

س: جشن مشاعروں میں بطور منتظم اعلیٰ آپ کی شرکت رہی۔ ان کا بھی تذکرہ ہو جائے؟

ج: ان جشنیہ مشاعروں کے بانی سلیم جعفری تھے۔ جن کا خیال تھا کہ شاعر کو اس کی زندگی میں سراہنا چاہئے۔ اس لئے انہوں نے جشنیہ مشاعروں کا آغاز کیا۔ سلیم جعفری دبئی میں یہ مشاعرے منعقد کرتے تھے اور ابوظہبی اور العین میں منصور جاوید، نجم جعفری، مستان شریف، ڈاکٹر رشید رانا اور اعجاز یوسف شامل تھے۔ ان جشنیہ مشاعروں میں میری بحیثیت

شاعر منتظم اعلیٰ شرکت رہی۔ ان مشاعروں میں جشن خمار 1987ء، جشن فراز 1988ء، جشن سحر ابوظہبی 1989ء، جشن جون ایلیا 1990ء، جشن مجروح 1991ء، جشن غزل وغزال 1991ء، جشن قتیل شفائی 1992ء، جشن جگن ناتھ آزاد 1993ء، جشن محشر 1994ء، جشن کیفی 1995ء، جشن پیرزادہ قاسم 1996ء، جشن علی سردار جعفری 1997ء شامل ہیں۔

س بین الاقوامی مشاعروں میں اپنی شرکت کے بارے میں بتایئے۔

ج جی الحمد اللہ! اس کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ مختصراً قطر، سعودیہ، لندن، امریکہ، کراچی، لاہور، بحرین، دبئی، شارجہ، راس الخیمہ اور العین کے کئی معروف وعالمی تنظیموں میں بحیثیت صدر محفل، مہمان خصوصی کے شرکت میرے لئے اعزاز رہا ہے۔

س اب تک کتنے اعزازات حاصل کر چکے ہیں؟

ج اللہ کے فضل سے نمایاں اعزازات میں دبئی میں نوائے وقت کی جانب سے مجید نظامی ایوارڈ، انجمن فروغ اردو ادب دوحہ، قطر کی جانب سے 1994ء میں اعزازی شیلڈ، اردو مرکز جدہ کی جانب سے اعزازی شیلڈ، اردو اکیڈمی لندن کی جانب سے اعزازی شیلڈ، انجمن فروغ اردو ادب دوحہ، قطر کی جانب سے 2014ء میں اعزازی شیلڈ، سوشل سنٹر شارجہ کی جانب سے اعزازی شیلڈ، پاکستان ایسوسی ایشن دبئی کی جانب سے جشن پاکستان ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔

س ادب اور زندگی میں کیا فرق ہے؟

ج ادب اور زندگی دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔

س بڑے شاعر کی کیا خصوصیات ہیں؟

ج پہلے زمانے میں بڑا شاعر اپنی شاعری، علمیت اور قابلیت کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منواتا تھا مگر آج اپنے آپ کو اچھا اور بڑا شاعر منوانے کیلئے پبلک ریلیشن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جبکہ آج Receving award from sharjah social

center کے دور میں بھی بڑے قابل، عالم اور بہترین شاعر موجود ہیں جو اردو ادب کے لئے ایک سرمایہ ہیں مگر وہ پس منظر میں ہیں کہ ان کی کوئی انجمن تحسین باہمی نہیں ہے۔

س ادب برائے زندگی اور ادب برائے اصلاح میں آپ کس کے قائل ہیں؟

ج ادب برائے زندگی ہو تو ادب برائے ادب اور ادب برائے اصلاح دونوں کا حصول ناممکن نہیں۔

نصیر احمد ناصر

س اپنا قلمی اور اصلی نام بتائیں۔

ج اصلی نام: نصیر احمد، قلمی نام: نصیر احمد ناصر

س تاریخ اور جائے پیدائش؟

ج یکم اپریل 1954ء، ناگڑیاں (تحصیل کھاریاں، ضلع گجرات، پنجاب، پاکستان)

س تعلیم کہاں تک حاصل کی؟

ج انجینئرنگ، ایم آئی ای (یو کے)

س آباؤ اجداد کا تعلق کہاں سے تھا اور موجودہ رہائش کہاں پر ہے؟

ج ننھیالی گاؤں کا نام کالس ہے۔ ددھیال کے گاؤں کا نام ناگریاں ہے جو ضلع گجرات، تحصیل کھاریاں میں واقع ہے۔ دونوں گاؤں قریب قریب ہیں اور ضلع گجرات اور آزاد کشمیر کے ضلع بھمبر کے تقریباً درمیان میں واقع ہیں۔ اب راولپنڈی میں مستقل رہائش پذیر ہوں۔

س آپ کا بچپن کہاں گزرا ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ج میرا تعلق جٹوں کے ایک متوسط زمیندار گھرانے سے ہے۔ بچپن کا ابتدائی حصہ گاؤں میں یعنی ناگڑیاں میں گزرا۔ گاؤں میں اُس وقت بجلی تھی نہ سڑک۔ صرف لڑکوں کا ایک پرائمری اسکول تھا۔ تیسری جماعت تک گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھتا رہا جہاں ٹاٹ تک نہیں تھے اور زمین پر یا درختوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھائی کی جاتی تھی۔ اسکول ماسٹر اپنے ہی گاؤں یا قریبی دیہات سے تعلق رکھتے تھے۔ اسکول ڈاکخانے کا کام بھی کرتا تھا اور

ہیڈ ماسٹر پوسٹ ماسٹر بھی ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے والدہ دن میں ایک بار اسکول کا چکر ضرور لگاتی تھیں اور میرا ہاتھ منہ دھلاتی اور کھانا کھلاتی تھیں۔ تیسری جماعت کے بعد والد صاحب نے ہمیں کھاریاں منتقل کر دیا جو اس وقت ایک چھوٹا سا قصبہ نما شہر تھا اور تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا۔ کھاریاں میں اُس وقت لڑکوں اور لڑکیوں کے پرائمری اور ہائی اسکول تھے۔ ریلوے اسٹیشن بھی تھا اور سرکاری اسپتال بھی۔ پانچویں جماعت تک گورنمنٹ پرائمری اسکول کھاریاں میں پڑھا۔ پھر گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں میں داخلہ لیا اور میٹرک وہیں سے پاس کیا۔ کھاریاں کا ہائی اسکول بہت اچھا تھا، ماحول اور پڑھائی ہر دو لحاظ سے۔ غیر نصابی کتابیں پڑھنے کا شوق وہیں سے پیدا ہوا۔ دو تین اساتذہ تو بہت اچھے تھے اور خود کتابیں لا کر دیتے تھے۔ ان میں ماسٹر عبدالغنی کا نام مجھے یاد ہے۔ انھوں نے ساتویں جماعت میں "خدا موجود ہے" جیسی کتابیں مجھے پڑھوا دی تھیں۔ یہیں سے ابتدائی لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا جو دراصل گاؤں ہی میں فطرت سے گہری قربت کے باعث کہیں اندر جڑ پکڑ چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں گاؤں میں تیسری جماعت میں تھا تو گاؤں کی عورتیں خطوط لکھوانے اور پڑھوانے میرے پاس آتی تھیں اور میں بڑی آسانی سے خط لکھ اور پڑھ لیتا تھا۔ تاہم باقاعدہ لکھنا بہت بعد کالج کے زمانے میں شروع کیا۔ کھاریاں شہر سے متصل بہت بڑی فوجی چھاؤنی ہے۔ جہاں اُس زمانے میں کئی انگلش میڈیم اچھے اسکول اور ایک انگلش میڈیم ڈگری کالج تھا جس میں مخلوط تعلیم (کوایجوکیشن) تھی۔ میٹرک کے بعد میں نے وہاں سائنس (پری انجینئر نگ) کے مضامین میں داخلہ لے لیا اور پہلی بار سائیکل چلانا سیکھا کیونکہ کالج جانے آنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ سی بی ڈگری کالج (موجودہ نام ایف جی ڈگری کالج) ڈسپلن، تعلیم، غیر نصابی سرگرمیوں اور کھیلوں میں ایک مثالی درسگاہ تھی۔ یہاں میں نے ایک بھرپور عرصہ گزارا۔ انجمنِ اردو کا صدر اور سائنٹیفک سوسائٹی کا جنرل سیکرٹری رہا۔ یہیں سے باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا۔ ابتدا میں شاعری کے علاوہ افسانے اور ہلکے پھلکے مضامین بھی لکھے لیکن پھر میلان شاعری کی طرف ہو گیا کیونکہ فطرت میں شاعری تھی۔ مجھے

سوشیالوجی اور اینتھروپولوجی کے مضامین بہت اچھے لگتے تھے اور میں نے بی اے میں بطور خاص یہ مضامین رکھے تاکہ ان میں ایم اے کرسکوں لیکن حالات پھر کسی اور طرف چل پڑے۔ مجھے ملازمت کے بہترین مواقع مل گئے اور مزید پیشہ ورانہ تعلیم کے بھی۔ میں نے برطانیہ سے ایم آئی ای کرلی اور اسٹرکچرل انجینئرنگ بھی، کئی دیگر پیشہ ورانہ کورسز بھی کرتا رہا اور بہت ہائی ٹیک منصوبوں اور غیر ملکی فرموں میں ملازمت بھی۔ یہ سب ایک لمبی داستان ہے، اب سوچتا ہوں تو یہ ساری جدوجہد اور سارا عرصہ ایک خواب سا لگتا ہے۔

س لکھنے کی تحریک کیونکر ہوئی کس نے راہ نمائی کی؟

ج انسان اور فطرت کی ازلی مکاشفت نے لکھنے کی تحریک دی۔ زندگی کے تلخ ترین حقائق بھی میں نے فطرت کے منظر نامے سے اخذ کیے۔ لیکن میرا بچپن فکری تنہائی کا تھا۔ دور و نزدیک کوئی علمی و ادبی ہستی نہیں تھی۔ فطرت کی تمام تر خوبصورتیوں کے باوجود بے رحم قسم کی دیہاتی زندگی، پس ماندگی، لڑائیاں، جھگڑے۔۔۔۔۔۔ اپنی عمر سے پہلے بڑا ہو جانے کے تمام لوازمات کے ساتھ میں اکیلا فطرت کی تخلیقی قوت کی زد پر تھا۔ یہیں سے کہیں شاعری نے میرے اندر راستہ بنالیا تھا۔ تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ ارسطو نے نیچر کو تخلیقی قوت اور کائنات کے تخلیقی اصول کا نام دیا ہے اور ارسطو ہی نے کہا ہے کہ استعارے پر قدرت ہونا سب صلاحیتوں سے بڑھ کر ہے۔ باقاعدہ راہنمائی کسی نے نہیں کی۔ سی بی (موجودہ ایف جی) ڈگری کالج کھاریاں کینٹ کا زمانہ میری تعلیمی زندگی کا سنہری اور شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب میں نے فطرت سے جذب کیے ہوئے علوم و اسرار کو انسانی جذبوں اور زندگی کے وسیع تر تناظر میں سمجھنا اور باقاعدہ الفاظ میں ڈھالنا شروع کیا۔ پھر یہ سلسلہ ایسا چلا کہ ابتدا اور انتہا دونوں نامعلوم سروں پر چلی گئیں۔ زمینی محبتوں، معاشرتی و معاشی حقیقتوں، آفاقی سچائیوں سے کائناتی ماورائیت اور لامتناہیت تک موضوعات اور الفاظ کا انبار بڑھتا گیا۔ لیکن بچپن میں گاؤں سے نکلا ہوا وہ بچہ اس پختہ عمری میں بھی، جب میرے اپنے بچے جوان ہو چکے ہیں، میرے ہمراہ ہے اور اسی بچے کی بدولت میری تخلیقی

سچائی، حیرت، تازگی اور بے ساختگی آج بھی برقرار ہے۔

س شاعری سیکھی جا سکتی ہے یا یہ خداداد ہوتی ہے؟

ج میرے خیال میں خداداد ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیکھی نہیں جا سکتی۔ اس کا کوئی حتمی اصول مقرر نہیں۔ عربی کا مقولہ ہے شعرا تلامیذ الرحمان یعنی خدا کے شاگرد ہوتے ہیں۔ گویا تخلیقی عمل کو ایک قسم کی الہامی کیفیت تسلیم کیا گیا ہے۔ افلاطون کے نظریہ تخلیق کے مطابق شعر گوئی کا عمل ایک خاص قسم کی مقدس دیوانگی کا نتیجہ ہے اور یہ اکتسابی فن نہیں بلکہ دیویوں کا عطیہ ہے۔ فرانسیسی فلسفی ماری تاں کا کہنا ہے کہ معانی الہام میں موجود ہوتے ہیں لیکن ان کو الفاظ میں مجسم کرنے کے لیے الہام کو آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا زبان و بیان میں مہارت اکتسابی ہو سکتی ہے مگر شعری حس مکمل وہی ہوتی ہے۔ جسے علم اور مطالعے سے مزید صیقل کیا جا سکتا ہے۔

س کیا کسی ادبی تحریک سے وابستہ رہے؟

ج کسی مخصوص ادبی تحریک سے وابستگی نہیں رہی۔ اچھا اور حقیقی ادب بذاتِ خود ایک نظریہ، ایک تحریک ہوتا ہے جسے کسی خاص گروہ کے لیبل کی ضرورت نہیں ہوتی۔

س آپ کے خیال میں ادبی نظریہ کیا ہوتا ہے؟

ج میں نے اس پر تسطیر میں ایک اداریہ لکھا تھا۔ اسی میں آپ کے سوال کا جواب بھی پنہاں ہے۔ ادب بذات خود کوئی نظریہ نہیں ہوتا، اس کے اندر کئی نظریات موجود ہوتے ہیں۔ ظاہر بھی اور پنہاں بھی۔ اردو ادب میں دو بنیادی نظریات ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے مباحث تا دیر گونجتے رہے۔ اب بھی کبھی کبھی ان کی بازگشت سنائی دیتی ہے، لیکن یہ بحث اب پرانی اور بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے اور ایک بے معنی کلیشے بن چکی ہے محض ایک نصابی موضوع۔ وسیع معنوں میں ادب برائے زندگی کی بات درست ہونے کے باوجود ''روایتی ترقی پسندوں'' نے ایک مخصوص معنی اور تناظر میں اس کا نعرہ لگایا، جو غلط تھا۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے اور امریکی نیو ورلڈ آرڈر کے بعد ''نو ترقی پسندوں'' نے اب

اس کے معنوں میں نہ صرف تصحیح کر لی ہے بلکہ ترقی پسندی اور ادب برائے زندگی کی معنوی وسعت کو بھی بڑی حد تک تسلیم کر لیا ہے۔ ویسے بھی یہ بحث ادب کے بارے میں بعض بنیادی اور تصوراتی مغالطوں پر مبنی ہے۔ ادب کو زندگی سے اور زندگی کو ادب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی ہے تو ادب کا احساس بھی ہے۔ شاعر اور ادیب کا انفراد بھی زندگی کے اجتماعی شعور اور لاشعور کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کی ذات کو، اس کی زندگی کے ذاتی غموں، خوشیوں اور معاملات کو مجموعی معاشرت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ شاعر اور ادیب کی ''میں'' دراصل بنی نوع انسان کی ''میں'' ہوتی ہے۔ ادب انسانی جذبات و احساسات، افکار و مسائل اور حادثات و واقعات کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے، اس میں روحِ عصر اور تاریخِ عصر ہوتی ہے۔ اب بھلا بتایئے کہ فی زمانہ ماحولیاتی آلودگی، گلوبلائیزیشن، مارکیٹ اکانومی، کارپوریٹ کلچر، نیو ورلڈ آرڈر، تہذیبی کشاکش، جوہری اسلحے اور تابکاری کے خطرات، دہشت گردی، خودکش حملے، مشرقِ وسطی اور دیگر ممالک میں سیاسی خلا اور بے چینی کی لہر، پولرائزیشن، غربت، بے روزگاری، مہاجرت، امیگریشن، آئی ڈی پیز، توانائی کا بحران، کرپشن، عالمی کساد بازاری، انسانی و لسانی حقوق، حیات و کائنات کے وسیع تر علوم، سائنسی ترقی اور ایجادات کے مثبت و منفی اثرات اور دیگر بہت سے موضوعات اور مسائل کو کس کھاتے میں ڈالیں گے؟ موجودہ دور کے پیچیدہ اور معکوس طرزِ فکر و عمل کا یہ محض ایک اشاریہ ہے۔ اس عہد کے ادیب و شاعر کے اردگرد معاشرتی، معاشی، سیاسی، لسانی، مذہبی، سائنسی اور نظریاتی موضوعات و مسائل کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ان موضوعات کا احاطہ کرنے والے ادیب اور شاعر کی ترقی پسندی، روشن خیالی اور دردمندی سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اس لحاظ سے ہر ''ذی شعور'' اور ''ذی روح'' شاعر و ادیب اپنے آپ میں ترقی پسند ہوتا ہے۔ یہ ایک رویہ، ایک طرزِ فکر ہے جس کے لیے کسی لیبل اور کسی گروہ میں شمولیت یا کہیں سے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اوریجنل اور سچا شاعر ادیب اپنی ذات میں یعنی بذاتِ خود ایک نظریے کی صورت نمو پذیر ہوتا ہے۔ جو ذاتی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہوتا

ہے۔ ادبی نظریے سے مراد دراصل ادب کی نوعیت اور اس میں جاری وساری شعریات، حیاتِ انسانی، فلسفہ، حسیات، جمالیات، اخلاقیات، سماجیات، معاشیات، نفسیات وغیرہ اور تاریخی وعصری شعور کا کھوج ہے۔ مختلف ادبی تھیوریز، امیجزم، فارملزم، مارکسزم، فیمینزم، ساختیات، ردساختیات، پوسٹ کالونیل ازم، جدیدیت، بعد جدیدیت وغیرہ وغیرہ یہ سب ادب کے ایک بڑے درخت کی نظریاتی شاخیں ہیں اور کسی نا کسی طور ادبی فن پاروں پر منطبق ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کسی تحریر میں ادبیت نہیں تو وہ ادب نہیں چاہے وہ زندگی سے متعلق ہو یا کسی غیر مرئی دنیا کے بارے میں ہو۔

س نظم کے علاوہ کن اصناف میں طبع آزمائی کی؟

ج غزل، افسانہ، کالم، تسطیر کے اداریے وغیرہ

س نثری نظم آپ کی پہچان ہے۔ نثری نظم کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج معلوم نہیں آپ نے یہ مفروضہ کیسے قائم کیا۔ میں بنیادی طور پر آزاد نظم کا شاعر ہوں۔ میں نے مجموعی طور پر آزاد اور معریٰ یعنی وزن اور بحر میں زیادہ نظمیں لکھی ہیں اور نثری کم۔ نظم میری پہچان ہے وہ معریٰ ہو، آزاد ہو کہ نثری۔ مجھے یاد ہے شروع شروع میں ستر کی دہائی میں جب نثری نظم کا بڑا فیشن چل نکلا تھا تو میری بھی خواہش تھی کہ کوئی نثری نظم لکھوں لیکن جب نظم ہوتی تھی تو وہ خود بخود ایک ردھم یعنی وزن اور بحر میں آ جاتی تھی۔ یعنی خواہش کے باوجود نثری نظم نہیں ہوتی تھی۔ پھر جب اس کا حقیقی ادراک ہوا اور اظہار کے مروجہ سانچے کرب وآگہی کے لیے ناکافی لگنے لگے تو نثری نظم بھی خود بخود ہونے لگی۔ دراصل ہر نظم اپنی ہیئت اور فارمیٹ خود لے کر آتی ہے اسے کوشش سے نثری یا آزاد نہیں بنایا جا سکتا۔ احساسات وخیالات کے بہاؤ کو محض شعوری طور پر کسی مخصوص سانچے میں ڈھالنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسا کرنے سے تخلیق کی خوبصورتی، بے ساختگی اور بین السطور بہنے والی آگہی کی رو متاثر ہوتی ہے۔ تخلیق کے بعد کسی نظم کی تراش خراش تو کی جا سکتی ہے لیکن تخلیقی عمل کے دوران اسے زبردستی "نظم" یا "نثری نظم" نہیں بنایا جا سکتا۔ نثری نظم کہنا ایسا

آسان بھی نہیں جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں اور نہ نثری نظم کے نام پر شائع ہونے والی چھوٹی بڑی چند سطروں پر مشتمل ہر تخلیق کو نثری نظم کہا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے گہرے تہذیبی شعور، آگہی، عرفان ذات، جدید طرز احساس، عمیق مطالعے، مشاہدے، ریاضت، تخلیقی مزاج کی موزونیت اور علامتوں، استعاروں، تشبیہوں اور پیکروں کے پیچیدہ مگر قابل فہم نظام کے علاوہ نامیاتی وحدت اور پس الفاظ اور بین السطور ایک اندرونی آہنگ جیسے لوازمات درکار ہوتے ہیں۔

س نثری نظم بالکل جداگانہ انداز شاعری رکھتی ہے کیا لوگ اسے سمجھتے اور پسند کرتے ہیں؟

ج دنیا بھر میں زیادہ تر شاعری اب نثری نظم کی صورت میں ہی ہو رہی ہے اس لیے نثری نظم کی اصطلاح اضافی لگتی ہے۔ تاہم نثری نظم پر بحث اور اس کے رد و قبول کا سلسلہ دنیا کے مختلف ممالک میں کسی نہ کسی حد تک اب بھی جاری ہے۔ بہت سے ممالک میں یہ بحث اب دم توڑ چکی ہے۔ اردو میں جب نثری نظم شروع ہوئی تو امریکہ میں نثری نظم کا سنہری دور گزر بھی چکا تھا۔ شاعری کسی بھی فارم، کسی بھی زبان میں ہو اس میں شعری عناصر کا ہونا ضروری ہے۔ اردو کے زیادہ تر ادبی جرائد اب آزاد نظم اور نثری نظم کو "نظم" کے خانے میں ہی رکھتے ہیں۔ البتہ نصابی ضرورت اور نئی نسل کی تربیت کے لیے اردو کی آزاد نظم اور نثری نظم کو الگ الگ رکھنا ضروری ہے۔

س غزل آزاد نظم اور نثری نظم میں آپ کیا تفریق کرتے ہیں؟

ج اس سوال کا جواز اور وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

س کیا آپ سمجھتے ہیں کہ نثری نظم مستقبل کی شاعری ہے؟

ج نثری نظم زمانہ قدیم سے لکھی جا رہی ہے۔ نثری نظم کے شجرہ نسب کی جڑیں دنیا کے قدیم ادب سے ملتی ہیں۔ بہت سی دیومالائیں، لوک داستانیں اور قبل مسیح کے طویل رزمیے اپنے شاعرانہ آہنگ، ہیئت اور اسلوب میں نثری نظم کے قریب تر ہیں۔ قدیم ویدوں اور سنسکرت ادب سے بھی اس کے ڈانڈے ملائے جاتے ہیں۔ مغرب میں نثری نظم کا آغاز

انیسویں صدی میں ہوا۔ ابتدا میں فرانس میں اور بعد میں امریکہ میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہ آج کی شاعری بھی ہے اور مستقبل کی بھی۔ نثری نظم کو اردو ادب کے مختلف مکاتب فکر نثری نظم، نثر لطیف، نثرین، نثم، نثر پارے، نثرانے، نثمانے، نظمیے، امکانات وغیرہ کے نام سے قبول کرتے اور اپنے اپنے رسائل میں شائع کرتے ہیں۔ بیشتر اسے نظم کے خانے ہی میں رکھتے ہیں۔ بلکہ اب تو آزاد نظم اور نثری نظم میں کوئی فرق روا رکھے بغیر انہیں ایک ساتھ نظم کے تحت شائع کیا جانے لگا ہے۔ گویا اس صنف میں اظہار پر تو کوئی اعتراض نہیں لیکن اس کے نام کا مسئلہ درپیش ہے۔ کچھ مکاتب فکر ایسے بھی ہیں جو اپنے افکار ونظریات میں جامد یا بہت زیادہ قدامت پسند ہونے کے باعث اس صنف کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ رویہ بھی ادبی اعتبار سے قابلِ تحسین نہیں۔ جس طرح نظم سے مراد اب بالعموم آزاد نظم لی جاتی ہے اور نظم کی پابند اور معریٰ ہیئتیں ناپید ہو چکی ہیں اسی طرح وہ دن دور نہیں جب نظم سے مراد نثری نظم لی جائے گی اور نظمیہ شاعری کی عروضی ہیئتیں از کار رفتہ ہو جائیں گی۔ تاہم یہ احتیاط بھی برحق ہے کہ نئی نسل کی شعری تربیت اور نصابی ضرورت کے تحت اور عروضی فرق کے باعث نثری نظم کو معریٰ اور آزاد نظم سے الگ رکھا جائے۔

س آپ کے خیال میں کیا نثری نظم کا کینوس زیادہ وسیع ہے؟

ج نظم کا کینوس زیادہ وسیع ہے۔

س اُردو میں نثری نظم کی عمر زیادہ طویل نہیں ہے اردو میں نثری نظم کب وارد ہوئی اور اس کی ضرورت کیسے محسوس کی گئی؟

ج میں نے نثری نظم کے موضوع پر تسطیر میں ایک اداریہ لکھا تھا جس پر سیر حاصل بحث ہوئی تھی۔ اردو میں مختلف ہیئتوں اور ناموں سے نثری نظم کی مثالیں بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایک ادبی تحریک کے طور پر اس کا باقاعدہ آغاز ساٹھ کی دہائی سے ہوا۔ تاہم لگ بھگ تین دہائیاں گزر جانے کے بعد تک نثری شاعری کا یہ تجربہ سلسلہ، جنبانی اور ایک اشتعال انگیز ترغیب سے آگے نہ بڑھا اور اردو شاعری میں کسی

واضح قبولیت کے مقام تک نہ پہنچ سکا۔ یوں ماسوا چند تخلیق کاروں کی ذاتی کاوشوں کے نثری نظم کا "دورِ اول" بالعموم کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ غالب اور اسکے بند قسم کی ادبی تحریکوں کے خلاف ردِ عمل اور اردو کی شعری روایات سے یک دم اور یکسر بغاوت تھی۔ اس کے علاوہ اس دور کے نثری نظم نگاروں کی ضرورت سے زیادہ جدت و تجرد پسندی، مغرب پرستی اور شعری کیفیات و تجربات کو داخلی صاف گری کے عمل سے گزارے بغیر خام شکل میں پیش کر دینے والا تلخ اور ناراض رویہ بھی اس صنف کی ابتدائی ناکامی کا سبب بنا۔ جبکہ نظمِ معریٰ اور آزاد نظم اُس وقت تک اردو شاعری میں ایک واضح جگہ بنا چکی تھی۔ گزشتہ تیس پینتیس برسوں سے اردو نثری نظم ایک نئے فنا منا سے گزر رہی ہے۔ اسے نثری نظم کا "دورِ ثانی" بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس بار میدانِ قرطاس میں زیادہ تر وہ شعرا ہیں جو جدید تر شعری حسیات اور عصری ادبی شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ اردو کی کلاسیکی شعری روایات سے بھی مربوط و منسلک ہیں اور فنِ شعر گوئی یعنی اوزان و بحور پر بھی گرفت رکھتے ہیں۔ نثری نظم نگاروں کی اس کھیپ کی شعری ترجیحات و ترغیبات کسی خاص ادبی تحریک کے تابع یا خلاف نہیں بلکہ ادب کے ان جدید اور پس جدید متنوع تخلیقی رویوں سے عبارت ہیں جو اس صنف میں نت نئے اسالیب اور موضوعات کے اضافے کا باعث ہیں۔ بلاشبہ اس زمرے میں وہ شعرا اور نارسیدہ و ناپختہ کار خامہ فرسا شامل نہیں کیے جا سکتے جو اردو کی شعری و عروضی روایات سے آگاہی حاصل کیے بغیر الٹی سیدھی سطروں میں سطحی اور خام شعری مواد کو نثری نظم یا نظم کے نام سے پیش کر دیتے ہیں۔ اردو نثری نظم پر اب تک کئی مباحثے و مکالمے ہو چکے ہیں اور طویل مضامین رقم کیے گئے ہیں جن میں اس کے نام، پس منظر، مزاج، آہنگ، علامتی و استعاراتی نظام، فنی و تخلیقی جواز اور شناخت پر تفصیل وار بحث کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک اہم سوال اپنی جگہ برقرار ہے کہ بعض شعرا اظہار کے مختلف سانچوں مثلاً غزل، پابند نظم، معریٰ نظم، آزاد نظم اور دیگر اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے ہوئے بھی نثری نظم کب اور کیوں کہتے ہیں؟ میرے خیال اور تجربے کے مطابق نثری نظم اس وقت سرزد ہوتی ہے جب

تخلیقی اداسی اور آگہی انسانی بس سے باہر ہو کر وجود کی حدیں پار کرنے لگتی ہے اور شاعری کے مروج پیمانے یا سانچے اس کے اظہار کے لئے ناکافی ہو جاتے ہیں۔ شاید انسان کی ازلی وابدی تنہائی کسی ایسے شعری نظام اور لسانی آہنگ کی متقاضی و متلاشی ہے جسے ابھی تک دریافت نہیں کیا جا سکا۔ شاید نثری نظم اظہار کی اسی غیر مرئی بے بسی کا تخلیقی جواز ہے۔

س کیا دور جدید میں نثری نظم لکھنے والوں کی تسلی بخش تعداد موجود ہے؟ اور کیا ان کے لکھنے سے مطمئن ہیں؟

ج کسی بھی صنف کو پرکھنے کا پیمانہ اس میں لکھنے والوں کی تعداد نہیں اس میں لکھی گئی معیاری تخلیقات ہوتا ہے۔ اگر اردو کے حوالے سے بات کی جائے تو بے شمار رطب و یابس کے باوجود اردو میں بہت عمدہ نثری نظم بھی لکھی گئی ہے اور لکھی جا رہی ہے جسے عالمی سطح پر رکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر اچھی نثری نظم لکھنے والے ناموں کی فہرست ہی مقصود ہو تو وہ بھی خاصی طویل ہے۔

س تسطیر کے اجرا کا خیال کیونکر آیا۔ ابتدا میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

ج 1997ء کے آغاز میں جب تسطیر کا اجرا ہوا تو ایک ایسے رسالے کی شدت سے ضرورت تھی جو نام کا نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں غیر جانبدار ہو، شخصی گروہ بندیوں سے آزاد ہو، نظریاتی طور پر ادب کی کسی ایک تحریک تک محدود نہ ہو بلکہ پاک و ہند کے ہر ادبی اسکول آف تھاٹ کی نمائندگی کرتا ہو، جس میں معیار کے ساتھ ساتھ نئے اور پرانے ناموں اور اصناف کا امتزاج ہو، جس کے تخلیق کاروں اور قارئین کی فہرست دیگر تمام ادبی رسالوں سے کہیں وسیع اور متنوع ہو اور جس کا ادبی پھیلاؤ نہ صرف برصغیر کے تمام ادبی طبقات کے معیاری لکھنے والوں کا احاطہ کرتا ہو بلکہ عالمی نوعیت کا ہو۔ یہ کارِ دشوار ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ تسطیر اپنے اولین شمارے سے لے کر آخری شمارے (دسمبر 2012ء) تک اس پالیسی اور معیار پر قائم رہا۔ تسطیر نے کئی عمدہ لکھنے والوں کو پروان چڑھایا اور کئی تخلیق کار جو صرف مقامی طور پر جانے جاتے تھے انہیں نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ پوری دنیا میں

متعارف کرایا۔ کتنے ہی شاعروں اور شاعرات نے بالخصوص شاعری کی نئی اصناف کو محض تسطیر کی وجہ سے قبول کیا اور اپنایا۔ نظم/نثری نظم کے معاصر شاعروں اور شاعرات کو جتنا تسطیر نے انسپائر اور پروموٹ کیا شاید ہی کسی اور ادبی رسالے نے کیا ہو۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تسطیر نے معاصر نظم اور نثری نظم نگاروں کو دیگر رسالوں کے مدیرانہ جبر سے آزاد کروایا اور انہیں کھلی تخلیقی فضا مہیا کی جس میں وہ خوب پھولے پھلے اور ادب کے معتبر نام کہلائے۔ تسطیر اُس وقت کے دو بڑے رسالوں "اوراق" اور "فنون" سے بالکل مختلف تھا۔ اس میں اُن دو طبقہ ہائے فکر یا گروپس کے لکھاریوں کے علاوہ، گروہ بندیوں سے بیزار اور الگ رہنے والے اور دیگر تمام ادبی طبقہ ہائے فکر کے لکھاری بھی سب ایک ساتھ بخوشی شائع ہوتے تھے۔ اس لحاظ سے تسطیر ایک رجحان ساز ادبی جریدہ ثابت ہوا۔ کوئی مانے نہ مانے، اعتراف کرے نہ کرے لیکن اس کے بعد میں آنے والے ہر ادبی رسالے نے سائز سے لے کر پیٹرن، فہرست اور پالیسی تک کم وبیش اور بظاہر تسطیر ہی کی طرز کو اپنایا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے ذاتی تعصبات و مفادات، دوست نوازی، نظریاتی وفکری اور ذاتی تنگ نظری سے بالا ہونا ہر مدیر کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ ہے اُن کے لیے جو تسطیر اور اس کے پس منظر سے آگاہ نہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ قریبی احباب جنہوں نے جی بھر کر تسطیر سے استفادہ کیا آج اپنی اپنی عظمت کا لبادہ اوڑھے تسطیر کا اعتراف کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، بعض تو اس کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے۔ اپریل 2017ء سے "تسطیر" کتابی سلسلے کے طور پر پھر سے جاری ہو گیا ہے اور بک کارنر پبلشر والے سال میں اس کے تین شمارے شائع کرتے ہیں۔ کتابی سلسلے کے طور پر تسطیر کے اب تک چھ ضخیم شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

س تسطیر کی آپ کے نزدیک انفرادیت؟

ج تنوع، جدت پسندی اور بڑی حد تک غیر جانبداری۔ ذاتی اور ادبی گرہ بندیوں سے بالاتر پالیسی۔ پرانے ناموں سے لے کر نئے لکھنے والوں تک معاصر تخلیقی وتنقیدی ادب کا

امتزاج اور ادب کے مستقبل کی آبیاری۔

س :بطور مدیر کیا مشکلات پیش آئیں۔اور فوائد؟

ج کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔فوائد؟ اس پر تو ہنسا ہی جا سکتا ہے۔لوگ فائدہ اٹھاتے ہوں گے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اس سے کوئی فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔کوئی ادبی فائدہ نہیں اٹھایا۔البتہ نقصان ضرور ہوا کہ کئی احباب اور معاصرین ناراض ہوئے۔غیر جانب دار مدیر کے طور پر سب کو خوش رکھنا ناممکن ہے۔سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اپنے لکھنے اور پڑھنے کا بہت سا قیمتی وقت ادارت کی نذر ہو جاتا ہے۔

س کیا کتب بینی مفقود ہو چکی ہے؟

ج کتب بینی مفقود تو نہیں ہوئی نہ ہو سکتی ہے لیکن کم ضرور ہوئی ہے۔ٹیکنالوجی کی بدولت پڑھنے کا طریقہ کار بدل گیا ہے۔ای بکس کا رجحان بڑھ رہا ہے۔مجھے تو آج بھی کتاب کے لمس کے بغیر مطالعے کا لطف نہیں آتا۔کتاب محبوبہ کی طرح ہوتی ہے۔ای بک محبوبہ کی جگہ نہیں لے سکتی۔

س نئے لکھاریوں سے آپ کتنے پر اُمید ہیں؟

ج نئے لکھنے والے کسی بھی زبان کے ادب کا نہ صرف مستقبل ہوتے ہیں بلکہ معاصر ادب کا بھی اہم اور لازمی جزو ہوتے ہیں۔میں نئے لکھنے والوں سے ہمیشہ پر امید رہتا ہوں۔غزل، افسانہ اور دیگر ادبی اصناف کی حالت تسلی بخش نہیں لیکن نظم میں نئے لکھنے والے نئی حسیات اور نئے موضوعات سے ہم آہنگ ہیں اور بیشتر پرانے نظم نگاروں کی نسبت اچھی نظم لکھ رہے ہیں۔

س آپ کس صنف میں خود کو کامیاب سمجھتے ہیں؟

ج میں جس صنف میں بھی لکھوں اس میں خود کو کامیاب سمجھتا ہوں۔بنیادی طور پر میں نظم نگار ہوں۔لیکن غزلیں، افسانے اور کالم بھی لکھے ہیں۔

س اُردو نثر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اُردو ادب میں بہترین نثر پارے

موجود ہیں؟

ج معلوم نہیں اردو نثر سے آپ کی مراد نثر کی کون سی صنف ہے؟ اگر آپ کی مراد فکشن ہے تو اردو میں عالمی سطح کا فکشن کم ہی لکھا گیا ہے۔

س تنقید کے حوالے سے کیا کہیں گے؟ کیا ہمارے تنقید نگار تنقید کے تقاضے پورے کر رہے ہیں؟

ج ہمارے ہاں تنقید کے اپنے منابع نہیں ہیں۔ نظری تنقید سب کی سب مغرب سے مستعار ہے یا ترجمہ شدہ نقل ہے۔ عملی تنقید نہ ہونے کے برابر ہے۔ واضح رہے کہ تقریباتی اور تبصراتی تحریریں عملی تنقید کے زمرہ میں نہیں آتیں۔ ہمارے ہاں نقد و تبصرہ کا زیادہ تر کام فرمائشی یا نصابی ہوتا ہے۔ حقیقی اور غیر جانبدارانہ تحقیق و تنقید مفقود ہے۔

س آپ کی شاعری کا ایک عالمی حوالہ بھی ہے اور اسے عالمی سطح کی شاعری سمجھا جاتا ہے۔ کیا آپ کی نظموں کے تراجم دوسری زبانوں میں ہوئے ہیں؟

ج میری نظموں کے تراجم انگریزی، روسی، ازبک، سپینش، پرتگیزی، رومانین، نیپالی، یونانی، ہندی، فارسی، سندھی اور دیگر کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ 2014ء میں میری نظموں کے انگریزی تراجم "اے مین آؤٹ سائیڈ ہسٹری" کے نام سے انڈیا سے شائع ہوئے جنہیں ڈاکٹر بینا بسواس نے ترجمہ کیا تھا۔ اس سے پہلے 1994ء میں "ڈریمز لاسٹ ان واٹر" کے نام سے ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا ترجمہ کردہ نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ ان نظموں کو عالمی سطح پر بہت پسند کیا گیا۔

س اعزازات اور ایوارڈز کے بارے میں بتائیے۔

ج میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا، نہ کبھی ان کے حصول کے لیے کوئی کوشش کی ہے۔ میں اعزازات اور ایوارڈز کے لیے نہیں لکھتا۔ کوئی بھی حقیقی شاعر اور ادیب ایوارڈز کے لیے نہیں لکھتا۔ میں تخلیقی سچائی کا قائل ہوں۔ ادبی سماجیات کے ذریعے حاصل ہونے والی مصنوعی کامیابی پر یقین نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی ایوارڈ یا اعزاز نہیں ملا۔

مجھے کبھی اس کی ضرورت یا کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اچھی تخلیق دنیا بھر کے لوگوں کے دلوں میں خود بخود راستہ بناتی ہے اور ہوا کی طرح پھیلتی ہے۔ یہی سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔

س مشاعروں اور عمومی ادبی محفلوں میں شرکت نہ کرنے کی وجہ؟

ج میں شروع ہی سے مزاجاً محفل باز اور شہرت پسند نہیں۔ میڈیا پہ آنے اور سکرین پہ رہنے کا بھی شوق نہیں۔ جبکہ مشاعرے کے لیے یہ دونوں خصوصیات لازمی ہیں۔ واہ واہ کہنے اور سننے کی بجائے مجھے شاعری پڑھنا اور سننا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بولنے کی بجائے لکھنے میں زیادہ سہولت اور عافیت محسوس کرتا ہوں۔ مغرب میں ریڈنگ کی روایت ہے۔ سامعین خاموشی اور توجہ سے سنتے ہیں اور ریڈنگ کے اختتام پر داد دیتے ہیں۔ جتنی اچھی تخلیق ہوگی دورانِ قرات اتنی زیادہ خاموشی ہوگی۔ پن ڈراپ سائلنس کا مطلب ہے بہت اچھی تخلیق۔ لیکن ہمارے مشاعروں میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ہماری ادبی روایت اور ادبی مزاج مختلف ہے۔ جتنی واہ واہ جتنا شور ہوگا اتنی کامیابی سمجھی جائے گی۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھنے یا سنانے کی بجائے پرفارم کی جاتی ہیں۔ افسوس کہ ہمارے ہاں ریڈنگ کی روایت نہیں بن سکی۔

نیلم احمد بشیر

س اپنے والد صاحب کے بارے میں کچھ بتایئے؟

ج والد صاحب احمد بشیر مشہور رائٹر رہے۔ آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ ان کا مشہور ناول 'دل بھٹکے گا'' جو ملے تھے راستوں میں' (جو کہ خاکوں کی کتاب ہے) اس کے علاوہ بھی ان کی بے شمار تحریریں ہیں جو میں مختلف جگہوں پر چھپواتی رہتی ہوں، یہ ان سے محبت کا اظہار بھی ہے۔ آرٹیکل اور مضامین والد صاحب کے میں چاہتی ہوں کہ چھپتے رہیں۔

س آپ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

ج میری پیدائش ملتان میں ہوئی۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں۔ زندگی کا زیادہ وقت لاہور میں گزرا۔ شادی ہوگئی اور پھر میں امریکہ چلی گئی۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ امریکہ میں گزارا اور امریکہ میں رہنے کے باوجود لاہور اور پاکستان کی یادیں وہاں بھی ہر دم تازہ رہیں۔

س اپنے بچوں کے بارے میں کچھ بتایئے؟

ج بچے میرے تین ہیں۔ سب کی شادیاں کر چکی ہوں۔ ماشاء اللہ سب اپنی زندگی خوشی سے گزار رہے ہیں۔ سب بیرون ملک مقیم ہیں۔ سب امریکہ میں ہی پیدا ہوئے۔

س کیا آپ کے شوہر بھی علمی وادبی شخصیت ہیں؟

ج نہیں ان کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور نہ ہی ان کو ادب سے کسی قسم کا کوئی لگاؤ ہے۔

س آپ بھرپور علمی وادبی شخصیت رہیں اور ہیں تو کیا شوہر کی طرف سے اس حوالے

سے تعاون ملا؟

ج اس پہ زیادہ کچھ نہیں کہوں گی لیکن مختصراً یہ کہوں گی کہ مجھے ادبی حوالے سے ان کا تعاون حاصل نہیں رہا۔ بلکہ وہ مکمل ایک غیر ادبی شخصیت ہیں اور ہمارے معاشرے میں یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے بلکہ عام سی بات ہے۔ ہمارے ہاں بیشتر شادیاں اسی نوعیت کی ہیں۔ یہ مکمل ارینج میرج تھی اور ایسا ہونا نارمل تھا۔ اس بات میں نہ ان کا کوئی قصور تھا اور نہ میرا کوئی قصور ہے۔ اس لئے میں اپنے شوہر کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتی۔

س اس کے علاوہ زندگی میں اور بھی مسائل آئے؟

ج میں نے اپنے لکھنے پڑھنے کی بہت قیمت ادا کی ہے۔ بہت سے دیگر مسائل کا بھی لگاتار سامنا کرنا پڑا لیکن میں اسے قربانی کا نام ہرگز نہیں دوں گی کیونکہ یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے۔ قیمت ادا کرنا کہوں گی۔ قربانی دینے جیسے الفاظ سے لگتا ہے جیسے آپ خود پر ترس کھا رہے ہوں اور میں خود پر ترس کھانا پسند نہیں کرتی۔

س اگر میاں بیوی دونوں ادبی شخصیات ہوں تو کیا آپ کے خیال میں یہ آئیڈیل صورت حال ہے؟

ج مرد کبھی تعاون نہیں کرتا۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی۔ ہمارے ہاں سب شادیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں شادیاں ماں باپ کی مرضی کی وجہ سے ہوتی ہیں خواہ لڑکی یا لڑکے کی اپنی مرضی نہ ہو۔

س علمی و ادبی سفر کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

ج میں چونکہ بچپن سے ادبی ماحول میں پلی بڑھی۔ والد صاحب علمی و ادبی شخصیت تھے، گھر میں ادبی لوگوں کی آمدورفت تھی۔ ماحول اور وراثت نے میرے اندر بھی لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ بچپن میں مختلف رسائل کے لئے بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے سے آغاز کیا۔ بڑی ہوئی تو کالج کے زمانہ میں بھی لکھتی اور چھپتی رہی۔ اسی دوران شادی ہوگئی اور میں امریکہ چلی گئی۔ میاں اور مزاج کے تھے۔ امریکہ میں بیس سال کا طویل عرصہ بغیر لکھے گزر

گیا۔ اس دوران میں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ 1991ء میں پاکستان آ گئی اور پہلی کتاب چھپی۔ میں نے افسانے لکھنے سے آغاز کر دیا تھا۔ پہلا افسانہ لوگوں نے اتنا پسند کیا کہ میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ میرے ابھی تک افسانوں اور ناولوں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں، نیز سفرنامہ اور خاکے بھی لکھے۔

گلابوں والی گلی، جگنوؤں کے قافلے، ملکہ، وحشت ہی سہی، چار چاند (خاکے) نیپال نامہ (سفرنامہ) ستمگر ستمبر۔ طاؤس فقط رنگ۔ (ناول)

س: کیا آپ نے شاعری بھی کی؟

ج: شاعری کرتی رہتی ہوں لیکن زیادہ تر نثری نظمیں لکھی ہیں لیکن شاعری کی طرف بہت زیادہ رجحان نہیں رہا۔ نثر میں لکھتی رہتی ہوں۔

س: آپ کے نزدیک کونسی صنف اظہار کا سب سے بہترین ذریعہ ہے؟

ج: نثر کا اپنا ایک مقام اور وقار ہے۔ مجھے ہمیشہ سے نثر لکھنا پسند ہے۔ شاعری تو ہر کوئی کر رہا ہے اور شاعری کی کتب کی اتنی بھرمار ہو چکی ہے کہ پڑھنے کو دل بھی نہیں چاہتا۔ نثر میں تفصیل سے بھرپور بات کی جا سکتی ہے۔

س: آپ نے کن کن ممالک کا سفر کیا؟ وہاں اردو ادب کے حوالے سے کیا کام ہو رہا ہے؟ کیا آپ مطمئن ہیں؟

ج: دیکھیں میں زیادہ تر تو امریکہ ہی جاتی ہوں کیونکہ میرے بچے بھی وہیں ہیں۔ کینیڈا اور برطانیہ بھی جاتی رہتی ہوں۔ امریکہ اور کینیڈا میں ادب نواز زیادہ ہیں۔ لوگ ادب سے محبت کرنے والے ہیں۔ میں اپنی کچھ کتابیں ساتھ رکھتی ہوں جو امریکہ اور کینیڈا میں لوگ خریدتے ہیں اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں جبکہ برطانیہ میں حالات اس سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ وہاں کے لوگ ادب کی نشوونما میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ مجھے لگتا ہے انگلینڈ بہت پیچھے رہ گیا ہے ادبی حوالے سے۔

س: شاعر تو دوسرے ممالک میں جاتے رہتے ہیں اور مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ کیا

وہاں پہ نثر نگار بھی موجود ہیں؟

ج: جی ہاں، ایسے لوگ بھی وہاں جاتے رہتے ہیں۔ وہاں بھی اچھی نثر لکھنے والے موجود ہیں اور وہ اپنا کام کر رہے ہیں۔ شاعری تو وقتی غذا ہے اور اسے لکھنے والے سے بھی اسے انسٹنٹ فوڈ سمجھتے ہیں۔ نثر تو وقت مانگتی ہے اور شاعری سے زیادہ وقت اور محنت مانگتی ہے۔

س: جدید اور کلاسیکل ادب میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

ج: فرق یہ ہے کہ کلاسیکل میں وہ لکھا گیا جو اس دور میں پیش آ رہا تھا جبکہ ہم وہ لکھ رہے ہیں جو ہمارے ارد گرد کے حالات و واقعات ہم دیکھ اور محسوس کر رہے ہیں۔ جو چیزیں میر امن نے لکھی ہیں میں وہ نہیں لکھ سکتی اور جو میں لکھ رہی ہوں وہ میرا تجربہ ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ وہ لوگ زبان دان تھے جبکہ میں خود کو اتنی بڑی زبان دان نہیں سمجھتی۔ پنجابی لوگوں نے اردو کے فروغ کے لئے بہت کام کیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ آج اردو ادب جس مقام پر ہے۔ اس میں پنجاب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ پنجاب نے تو اُردو کو گلے لگا لیا ہے، اپنا لیا ہے۔

س: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میڈیا اور نیٹ کی وجہ سے نئی نسل کا کتاب سے رشتہ ختم ہو چکا ہے؟

ج: دیکھیں کتاب تو دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہے اور نیٹ تو ہر جگہ موجود ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی پڑھی جا رہی ہے۔ یہ ہے کہ کتاب خریدنے کی سکت کم ہوگئی ہے۔ کتابیں مہنگی ہو چکی ہیں۔ لائبریری ہے نہیں تو وہ کتاب کہاں سے لیں اور کیسے خریدیں؟ اسی طرح سکولوں اور یونیورسٹیوں میں کتاب پڑھنے کی ترویج نہیں دی جاتی اور جس ملک میں علم وادب کے لئے کوئی گرانٹ نہ ہونے کے برابر ہو وہاں رجحان کیسے پیدا ہوگا۔ اس لئے نئی نسل کا کیا قصور جب انہیں کتابیں با آسانی مہیا ہی نہیں ہیں۔

س: لیکن ہمارے ہاں کتابیں فٹ پاتھ پر کم قیمت میں دستیاب ہیں تب بھی خریدنے والے نظر نہیں آتے؟

ج: نہیں ایسا نہیں ہے۔ کتابیں خریدنے والے بھی موجود ہیں۔ میں کچھ دن پہلے Lums یونیورسٹی گئی ہوئی تھی جہاں سٹوڈنٹس کہانیاں لکھ کر لا رہے تھے۔ یعنی اب بھی لکھنے

اور پڑھنے کا ماحول موجود ہے۔ کہیں پر کم ہے اور کہیں پر زیادہ۔ کتب بینی کے لئے طالب علم کے لئے کتاب کی فراہمی کو آسان بنانا ہوگا۔

س: قدیم اور جدید میں کون کون سے رائٹرز پسند ہیں؟

ج: منٹو، چغتائی اور تقریباً زیادہ لوگوں نے اچھا ہی لکھا ہے۔ بانو قدسیہ بہت روایتی عورت تھیں اور عورت کو نیچے دیکھنا چاہتی تھیں۔ میں عورت کو تھوڑا اوپر کی سطح پر دیکھنا پسند کرتی ہوں۔ کچھ خواتین اسی طرح کی باندی ٹائپ عورت کا نقشہ کھینچتی ہیں جبکہ مجھے عورت کا اپنے حقوق کے ساتھ زندگی بسر کرنا پسند ہے۔

س: حال ہی میں بیاض گروپ کی جانب سے آپ کو آپ کے ناول طاؤس فقط رنگ پہ ایوارڈ ملا۔ اس سے قبل کوئی ایوارڈ ملا؟

ج: نہیں مجھے اس سے قبل کوئی ایوارڈ نہیں ملا۔

س: کیا آپ موجودہ ادب کو ادب برائے زندگی کا ادب سمجھتی ہیں؟

ج: جی آج کل ادب برائے زندگی ہی تخلیق ہو رہا ہے۔ جب تک آپ ادب کو اپنی زندگی کے ساتھ جوڑیں گے نہیں آپ عمدہ ادب تخلیق ہی نہیں کر سکتے۔ ادب کو ہمیشہ ادب برائے زندگی ہی ہونا چاہئے۔ کچھ لوگ جدید موضوعات پر لکھ رہے ہیں اور چاند کو دیکھ کر آہیں بھرنے والے بھی ہیں لیکن اب اس سے آگے سوچنے کا دور ہے۔ حالات اور مسائل بدل چکے ہیں۔ اس لئے حقائق کے بارے میں لکھنا ہوگا۔

س: کن موضوعات پر لکھنا پسند کرتی ہیں؟

ج: میں تقریباً ہر موضوع پر لکھنا پسند کرتی ہوں لیکن جب بچوں پر زیادتی ہوتی ہے۔ جب عورت کو زندہ جلایا جاتا ہے، مجھے تکلیف ہوتی ہے اور میں ایسے اور دیگر مسائل پر لکھتی رہتی ہوں۔ چلمن میں بیٹھی عورتیں میرا موضوع نہیں ہے۔

س: کیا عورت کا ادبی استحصال ہو رہا ہے؟

ج: میں ایسا نہیں سمجھتی۔ کیونکہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔

میں نہیں سمجھتی کہ کوئی اس کا ادبی استحصال کرسکتا ہے اور اگر کہیں ایسا ہو رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ عورت اپنی مرضی سے اپنا ادبی استحصال کرواتی ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں بھی لکھتی ہوں، باہر نکلتی ہوں۔ ایسا مجھے تو نظر نہیں آتا۔

س کیا عورت بہترین تخلیق کار ہے؟

ج میں سمجھتی ہوں عورت بہت باصلاحیت ہے اور اللہ نے اسے تخلیق کیلئے چنا ہے۔ اور بہترین تخلیق کار ہے۔ اس نے ہر شعبہ میں خود کو منوایا ہے۔ نثر زیادہ عورت ہی لکھ رہی ہے اور اس نے یہاں بھی اپنے آپ کو منوایا ہے۔

س کیا تخلیق اہم ہے یا تخلیق کار؟

ج میرا خیال ہے کہ ہمیشہ سے تخلیق زیادہ اہم رہی ہے۔ حالانکہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ رائٹر کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے نام سے اپنی تحریر کے ذریعے جانا پہچانا جائے۔

س کیا شاعر و ادیب معاشرے کا نباض ہوتا ہے؟

ج جو باتیں ایک عام شخص دیکھ یا محسوس نہیں کرسکتا اس کو شاعر و ادیب کرتا ہے۔ اللہ نے اسے تیسری آنکھ دی ہوتی ہیں اور وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مشاہدہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے۔

س نئی نسل کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟

ج نئی نسل کے لئے پیغام ہے کہ کتاب کو خریدنے اور پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ جلد شہرت کی حسرت نہیں کرنی چاہئے۔ پہلے پڑھنے پر توجہ دیں اور شہرت کے لئے محنت کریں۔ تعصب رکھے بغیر اپنے کام سے محبت کریں اور زندگی میں آگے بڑھتے رہیں۔ ادیب بننے کیلئے تفرقہ بازی کی طرف بھی مت جائیں۔ ہر چیز کو اس کے اپنے خانے میں رکھیں۔

نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر

س خاندانی پس منظر؟ جائے پیدائش اور تعلیمی سفر

ج ایک سخت گیر بلوچ قوم۔ روزگار زیادہ تر زمیندارہ ہے اور لڑکیوں کی تعلیم کچھ عرصہ پہلے تک بالکل مفقود۔ مگر اب کچھ حالات بدل گئے۔۔ کچھ بہتری ہوئی۔ ۵ دسمبر کو ڈیرہ غازی خان کی نواحی بستی میں پیدائش ہوئی

ابتدائی تعلیم کیلئے پرائمری سکول جندانی والا میں داخلہ لیا اور سوم کلاس میں تھی کہ اپنے گاؤں سے نانی کے گھر ڈیرہ غازیخان شہر میں منتقل ہوگئی اور دو سال تک میں اور میری بہن نانی کے گھر رہے اور پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ پھر اسی شہر سے والدین کے منتقل ہونے کے بعد گورنمنٹ گرلز ہائی سکول سے میٹرک اور ڈگری کالج سے ایف ایس سی کی اور نشتر میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس میں داخلہ لیا۔ سکول مذکورہ میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اچھی کارکردگی کی بنا پر میرا نام پرنسپل آفس بورڈ پر آویزاں کیا گیا۔ میں اپنے آبائی علاقہ ٹرائبل ایریا کی واحد لڑکی تھی جس نے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ میڈیکل جیسے خوبصورت شعبے میں جا کر مجھے اپنی صلاحیتوں کو منوانے اور اپنے پسماندہ علاقہ کے لوگوں کی خدمت کرنے کا بھی موقع ملا۔ مجھے اپنے شہر کی بہت محنتی اور باصلاحیت ڈاکٹر ثریا نثار کو دیکھ کر ڈاکٹر بننے کا شوق ہوا تھا اور اللہ کا احسان ہے کہ اُس نے مجھ ناچیز کا یہ خواب پورا کیا۔

س اپنے پیشہ سے لگن اور خدمت اور جذبہ ابھی تک قائم ہے؟

ج جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ خدمت کا وہ جذبہ سلامت ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدمت کے جو جذبات کل میرے دل میں تھے وہی جذبات آج بھی ویسے ہیں۔

س شادی پسند کی یا والدین کی مرضی کی؟

ج جی میری شادی میرے قبیلے کے رسوم و رواج کے مطابق والدین کی مرضی سے ہوئی اور میرے شوہر میرے پھوپھی زاد ہیں اور وہ ایک پرائیویٹ ادارے میں الیکٹریکل انجینئر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

س اولاد کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ج جی میرے دو بیٹے ہیں محمد عمر اور محمد حمزہ۔

س بیٹی کی خواہش؟

ج نہیں مجھے بیٹی کی خواہش نہیں کیونکہ میں بھی ایک لڑکی تھی اور ایک لڑکی ہونے کے ناطے آپ اگر آگے جانا چاہیں، اپنی سوچوں، اپنے ارادوں کی تکمیل میں آپ کو ہزار رکاوٹیں ملتی ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری تعلیم اور ارادوں میں جو رکاوٹیں ڈالی گئیں وہ میری بیٹی کو بھی سہنی پڑیں۔

س ایسے قبیلے اور پھر ایک شاعر۔۔۔ کس کا تعاون رہا کہ ڈاکٹر اور پھر شاعر؟

ج جی اس میں میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد اپنے والد کی دل و جان سے مشکور ہوں کہ جنہوں نے خاندان کے ٹرائبل ایریا میں آج بھی لڑکی کو گھر کی بھیڑ بکری سے زیادہ اہمیت نہیں۔ ایسے ماحول میں میرا ڈاکٹر بننا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ باقی جہاں تک شاعری میں تعاون کا تعلق ہے تو ابھی تک میں ایک لڑائی لڑ رہی ہوں۔ اس شعبے کو منوانے کی۔ ابھی بھی ایک شاعر کی حیثیت سے پورے خاندان کی مخالفت کا سامنا ہے۔ میرا لکھنا کسی کو بھی پسند نہیں۔ میں خود بھی کوشش کرتی ہوں کہ ایسی تقریبات یا فنکشن یا مشاعروں میں نہ جاؤں جہاں میری فیملی پسند نہ کرے۔ میں صرف چند ایک ایسی تقریبات میں جاتی ہوں اور جو میری کتابوں کے حوالے سے منعقد کی جا رہی ہوں یا پھر چند ایک بڑے مشاعروں میں، جہاں مجھے شوہر کی اجازت مل جائے اور وہ جانے کیلئے بھی میرا ساتھ دیں۔

س آپ ایم بی بی ایس گائنا کالوجسٹ ہیں۔ شعر و ادب کی طرف کیسے آئیں؟ شاعری

کا آغاز؟ ادبی سفر، کب کہاں سے شروع ہوا۔

ج جی اپنے تمام دن بھر کے کاموں کے بعد کوئی کتاب پڑھنا یا ڈائری لکھنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یوں سمجھیں ڈائری میری سہیلی بن چکی تھی اور آہستہ آہستہ ڈائری میں لکھے لفظ شاعری کی صورت اختیار کر گئے۔ ویسے تو شاید اس کے جراثیم بچپن سے تھے کیونکہ کہیں بھی کوئی اچھا شعر سنتی یا کسی میگزین میں دیکھتی تو اُسے اپنے کاغذوں میں کاپی کر لیتی مگر لکھنے کی ہمت اس لئے نہیں تھی کہ ہمارے قبیلے میں شاعری تو کجا پڑھنا لکھنا بھی لڑکی کیلئے شجرِ ممنوعہ تھا۔ اسی لیے میرے اندر کی حساس لڑکی کو شاعرہ کا روپ دھارنے میں بہت وقت لگا۔ مصوری کرنا، باغبانی کرنا اور سلائی کڑھائی سے تصویریں بنانا میرے بچپن کے شوق تھے جو ایک شاعرہ کے روپ کی تجسیم کر رہے تھے۔ پہلی نظم "ملاقات آخری" نے اُس شاعرہ کو دنیا کے سامنے لانے میں مدد دی۔ مگر یہ نظم جو دسمبر 1996ء میں لکھی تھی۔ اس کے اور شاعرہ کے روپ میں سامنے آنے میں مکمل بارہ سال لگے اور پہلی کتاب پھول سے بچھڑی خوشبو 2007ء میں شائع ہوئی۔

2007 میں گائنی کی کانفرنس میں جاتے ہوئے میں ایک حادثے کا شکار ہوئی اور دو ماہ تک مکمل طور پر بستر کا حصہ بن گئی۔ ایک مصروف بندے کیلئے فراغت کسی سزا سے کم نہیں ہوتی۔ سو میں نے اُن دو ماہ میں اپنی ڈائری کو ترتیب دی اور اُس میں نثر اور شاعری علیحدہ علیحدہ کیں۔

سرائیکی کے ایک بزرگ شاعر چاچا رمضان طالب باقاعدہ میری عیادت کو آتے تھے۔ انہوں نے ضد کر کے اور میری فیملی سے اجازت لے کر میری شاعری والے حصے ایک کتاب کی صورت میں شائع کرائے جس کا نام میں نے اپنی نظم "پھول سے بچھڑی خوشبو" سے لیا۔ یوں ایک ڈاکٹر ایک شاعرہ کے روپ میں سامنے آئی۔

س کیا آپ کی منصبی ذمہ داریاں آپکے شوق کی راہ میں حائل ہوتی ہیں؟

ج جی بالکل۔ اگر میں ایک مصروف ڈاکٹر نہ ہوتی تو شاید اتنے عرصے میں میری پندرہ

ہیں کتابیں آچکی ہوتیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کوئی خوبصورت خیال ذہن میں آتا ہے مگر میں اُسے مناسب وقت پر کاغذ پر اتار نہیں سکتی جس کی وجہ سے بہت کچھ لکھنے کو رہ جاتا ہے۔ اور ایک چیز طے ہے کہ اگر وقت پر نہ لکھیں تو وہ خیال اُسی صورت میں موجود نہیں رہتا۔ محو ہو جاتا ہے پھر جتنا بھی سوچیں وہ چیز نہیں رہتی۔

س آپ کو اپنے والد گرامی سے بہت محبت ملی! کچھ اُن کے بارے میں بتائیں؟

ج میرے والد کا نام جان محمد کھوسہ ہے۔ ان کو بچوں کو تعلیم دینے کا بہت شوق تھا۔ خود بھی ماشاءاللہ پڑھے لکھے اور بہت سوبر انسان ہیں۔ اللہ انہیں تا قیامت سلامت رکھے۔ میری پیدائش جس بستی میں ہوئی وہاں لڑکیوں کی پڑھائی کا تصور بھی نہیں تھا۔ بابا کی خواہش تھی کہ بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیاں بھی پڑھائیں۔ اس کیلئے انہوں نے ہم دونوں بہنوں کو نانی کے گھر شہر بھیج دیا۔ خود وہ زمیندار کے علاوہ ایک ٹریول ایجنسی چلا رہے تھے جو کراچی میں تھی پھر جب ہم نے پرائمری پاس کر لیا تو خود بھی شہر آ گئے اور تمام خاندان کی مکمل مخالفت کے باوجود ہم دونوں بہنوں کو تعلیم دلائی۔ اور وہ بھی اعلیٰ تعلیم اور ہمیں بالکل دوستوں والا ماحول دیا۔ امی ابو نے ہمیں بچے نہیں اپنے دوستوں کی طرح پالا۔ انہیں کی یہ شفقت کہ آج ہم چاروں بہن بھائی اچھے اچھے عہدوں پر فائز اپنی زندگی کی مشکلیں آسان کر رہے ہیں۔

س ڈیرہ غازی خان کی ادبی فضا کیسی ہے؟

ج ایک خاتون شاعرہ کیلئے کانٹوں سے بھرپور۔ ایک ڈاکٹر کے باوجود مجھے بھی ایک شاعرہ ہونے کے ناتے سے بے پناہ رکاوٹوں اور یہاں تک کہ خاندان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاندان کی مخالفت کے ساتھ ساتھ اگر باہر بھی دیکھیں تو ایک خاتون شاعرہ کیلئے کوئی اچھے حالات نہیں اُسے ہر طرح کی تنقیدی سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے جب ایک خاتون شاعرہ سامنے آتی ہے تو دو چار لائنیں لکھنے والا ہر مرد اُس خاتون کی شاعری کا تنقید نگار یا اصلاح کار بن جاتا ہے۔ اور آئے روز اُس شاعرہ کو اس مدد کی بن مانگے آفر مل رہی ہوتی ہے کہ اگر آپ کو کہیں اصلاح کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔

مجھے تو اس بات پر حیرت ہوتی تھی جب میرے کانوں تک یہ بات پہنچتی کہ آپ اتنی مصروف ڈاکٹر ہیں۔ آپ کو کون شاعری لکھ کے دیتا ہے۔ اس طرح کی باتوں پر بہت غصہ بھی آتا ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے کہ بھلا مجھے میرے علاوہ کون لکھ سکے گا۔ کون میری سوچوں اور جذبوں کو اُسی طرح سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرے گا جو میں خود کر سکتی ہوں۔

بہر حال میں اس معاملہ میں خود کو مضبوط اعصاب کی مالک سمجھوں گی کہ ان حالات اور رکاوٹوں کے باوجود لکھ رہی ہوں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنے خاندان۔ گھر کی مخالفت کے باوجود اب تک لکھ رہی ہوں۔

س اپنی کس کتاب سے مطمئن ہیں اور اب تک کتنی تخلیقات کریڈٹ پر ہیں۔ اور مزید کتنی کتب زیرِ طبع ہیں؟

ج ایک تخلیق کار جب کوئی تخلیق کرتا ہے تو وہ ایک کرب اور تخیل سے گزرتا ہے اور اسے اپنی ہر تخلیق دوسری سے بڑھ کر لگتی ہے جیسے ایک ماں کو اپنا ہر بچہ پیارا ہوتا ہے اور وہ یہ کبھی نہیں کہہ سکتی کہ اُسے کسی ایک بچے سے زیادہ پیار ہے۔ اسی طرح تخلیق کار کو بھی اپنی تخلیق پیاری ہوتی ہے مجھے بھی اپنا سارا کلام اور تخلیق پیاری ہے۔ چاہے وہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو ہو''، ''میں، آنکھیں بند رکھتی ہوں'' یا اور ''پھول خوشبو اور تارہ'' اور ایک شاعری کی کتاب زیرِ عمل ہے۔

س آپ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ سائنس اور آرٹ کی وسیع خلیج کو آپ نے کیسے ہم کنار کر دیا؟

ج ڈاکٹری میرا پیشہ ہی نہیں بلکہ عشق بھی ہے اور شاعری تحلیل نفسی (کتھارسس) کا ذریعہ...... میرے لیے دونوں بہت اہم ہیں۔ احساس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی۔

س ڈاکٹر کی زندگی بہت مصروف ہوتی ہے' آپ تخلیقی کاموں کے لیے وقت کیسے نکال لیتی ہیں؟

ج میں گائنی آبسٹر کیکٹس کی پریکٹس کر رہی ہوں اور اپنا ایک چھوٹا سا ہسپتال ہے جہاں

چوبیس گھنٹے کام ہوتا ہے۔ شاعری کے لیے کوئی وقت مختص نہیں ہے۔ جب کچھ ذہن میں آیا لکھ لیتی ہوں۔

کئی دفعہ ایسا ہوا میرے ذہن میں بہت سے خیالات نے جگہ بنائی مگر کچھ لکھا نہ جا سکا اور جب لکھنے کے لیے وقت ملا تو وہ کیفیت نہ مل سکی۔ اگر مجھے لکھنے کے لیے وقت ملے تو روزانہ سیکڑوں موضوعات ملتے ہیں۔

س محبت شاعری کا بنیادی نقطہ ہے۔ ہماری بیش تر شاعری اسی کے مدار میں گھومتی ہے۔ کیا شاعری کے لیے محبت ضروری ہے؟

ج محبت کے بغیر شاعری کچھ بھی نہیں...... پھر شعر صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہو جاتا ہے، جس میں کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔

س عشق اور محبت کی تفریق کیسے کریں گی؟

ج عشق کی بنیاد محبت ہے...... محبت جب ہر تفریق کو ختم کردے اور وفا اور جنوں کا امتزاج بن جائے تو عشق ہو جاتی ہے...... عشق وحدانیت ہے...... خدا ہے۔

س شاعری کیوں کرتی ہیں؟

ج جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے کہ میں اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ جواب دے چکی ہوں کہ میں شاعری کیوں کرتی ہوں۔ شاعری میری ذات کا اظہار بھی ہے اور شکست و ریخت کا شکار ہونے والے اس معاشرے کا نوحہ بھی۔ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے اور وہ یہ سوال مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ ڈاکٹر ہونے کے ناتے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے شاعری کیلئے کیسے وقت نکالتی ہو تو جواب صرف اتنا سا ہے کہ شاعری میرے لیے زندگی کی علامت ہے اور زندہ رہنے کیلئے سانس لینا ضروری ہے اور سانس لینے کیلئے وقت نہیں نکالنا پڑتا۔

س کتابوں کے نام تفصیل سے بتائیں۔

ج جی میری شاعری کی چار کتابیں آ چکی ہیں۔ جن میں

(i) پھول سے بچھڑی خوشبو 2007ء

(ii) میں آنکھیں بند رکھتی ہوں 2010ء خزینہ علم وادب لاہور

(iii) اور شام ٹھہر گئی 2013ء سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

iv) ''پھول، خوشبو اور تارا'' 2016ء۔ الحمد پبلیکیشنز لاہور

v) میرا صاحب، سائیں عشق ہے تو

vi) [شاعری] ایک ناول اور ایک مضامین اور نثر کی کتاب،،، زیر طبع ہیں

س کتابوں کے نام کچھ مختلف نہیں؟

ج جی یہ حقیقت تھوڑی عجیب سی ہے کہ میں نے کتابوں کے نام شعوری طور پر نہیں دیئے بلکہ جب میں نے چاہا کہ اپنے کلام کو کسی مسودے کی صورت میں لے آؤں اور کتاب کی اشاعت کا فیصلہ کیا تو اپنی کتابوں میں سے اس نظم یا غزل کے کچھ لفظ چن لیتی جو مجھے خود کو زیادہ پسند ہوتے۔ پھر ان میں سے کچھ نام چن لیتی ہوں اور جو نام سب سے زیادہ متاثر کر رہا ہوتا ہے کتاب کا وہی نام رکھ لیتی ہوں۔

اس میں کوئی حقیقت نہیں کہ میں نے اپنی پہلی کتاب ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' کا نام پروین شاکر کی کتاب ''خوشبو'' سے متاثر ہو کر لیا جس نے وہ کتاب پڑھی؛ وہ جانتے ہیں کہ میں نے اپنی ایک نظم کے عنوان ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' کو کتاب کا نام دیا جو مجھے اپنی اُس کتاب میں سے بہت پسند تھی۔

س اپنی کس کتاب سے مطمئن ہیں؟

ج ایک تخلیق کار جب کوئی تخلیق کرتا ہے تو وہ ایک کرب اور تخیل سے گزرتا ہے اور اسے اپنی ہر تخلیق دوسری سے بڑھ کر لگتی ہے جیسے ایک ماں کو اپنا ہر بچہ پیارا ہوتا ہے اور وہ یہ کبھی نہیں کہہ سکتی کہ اُسے کسی ایک بچے سے زیادہ پیار ہے۔ اسی طرح تخلیق کار کو بھی اپنی تخلیق پیاری ہوتی ہے مجھے بھی اپنا سارا کلام اور تخلیق پیاری ہے۔ چاہے وہ پھول سے ''بچھڑی خوشبو ہو''، ''میں، آنکھیں بند رکھتی ہوں' اور شام ٹھہر گئی، ہو یا ''پھول خوشبو اور تارا''

س: آپ کا نظریہ شعر؟

ج: انسانیت، محبت، خلوص، وفا اور عشقِ حقیقی۔

س: پسندیدہ شعر۔

ج: پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجد ہم نے بچتے دیکھا کم

امجد اسلام امجد

س: اپنا پسندیدہ شعر۔

ج: چھوڑ یہ بات ملے زخم کہاں سے تجھ کو
زندگی اتنا بتا، کتنا سفر باقی ہے

س: پسندیدہ شاعر۔

ج: علامہ اقبال، فیض احمد فیض، احمد فراز، محسن نقوی، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، امجد اسلام امجد، رضی الدین رضی

س: ترقی پسند ہیں یا حلقہ ارباب ذوق کو پسند کرتی ہیں؟

ج: بنیادی طور پر تو ہر شاعر ہی ترقی پسند ہوتا ہے۔ باقی جہاں تک ہمارے Era کا تعلق ہے تو یہاں حلقہ ارباب ذوق مشکل ہی سے سنا ہے۔

س: آپ کا تعلق جس گھرانے یا قبیلے سے ہے اس میں ادبی محرکات کم دیکھے گئے پھر آپ کیسے؟

ج: جی یہ حقیقت ہے کہ میرے قبیلے سے خواتین تو کجا مرد شعراء کا تصور بھی کجا ہے اور میرے قبیلے میں شاید مستقبل میں بھی صدیوں تک کوئی شاعرہ پیدا نہ ہو اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں خود بھی ابھی تک اسی شش و پنج میں ہوں کہ میں کیسے لکھ رہی ہوں۔ میری پہلی کتاب میری وہ ڈائری تھی جو میں عملی زندگی میں آنے کے بعد دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد لکھا کرتی تھی جو ایک بار ہمارے شہر کے ایک بزرگ شاعر جو ایکسیڈنٹ کے بعد میری عیادت کو آتے

تھے پڑھنے کیلئے لے گئے اور پھر انہوں نے وہ ڈائری کتاب کی صورت میں شائع کرا کے مجھے تحفتاً دی۔ اگر وہ اُسے گفٹ نہ کرتے تو شاید میں کبھی شاعرہ کے روپ میں سامنے نہ آتی اور اس کتاب کی تقریب رونمائی پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن ڈیرہ غازیخان نے رکھی اور بہت سراہا جس کی وجہ سے مجھے بھی اچھا لگنے لگا کہ میں لکھوں۔ مجھے لگا کہ لکھنے سے زندگی کے حبس زدہ موسم میں جیسے تازہ ہوا کا جھونکا مل جاتا ہو، جب میں لفظوں کو کاغذوں پر جوڑتی اور انہیں مجسم شکل دینے کی کوشش کرتی تو مجھے لگتا کہ تھکن اور گھٹن سے چور راہوں میں یہ لفظ ایک مجسم روپ لے کر میرے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ تب تنہائی گھٹن اور حبس کا احساس قدرے کم محسوس ہوتا۔

لوگ اب تک ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کون ہے جو میری اتنی مصروف زندگی میں مجھے لکھ کر دیتا ہے اور جس نے مجھے شاعری کی چار کتابوں اور بہت ساری نثر کی تخلیق کا حق دے دیا۔ تو ایسے لوگوں کے ایسے سوالوں اور شکوک پر میرا ایک ہی سوال ہوتا ہے کہ مجھے بھی وہ شخص دکھاؤ جو میری سوچوں کو ایک عکس میں ڈھال کر ایک آئینے میں لاکھڑا کرے۔ مجھے بھی تو معلوم ہو کہ مجھے مجھ سے زیادہ کون سوچتا ہے۔ ایسے سوالوں پر میں اُسے ڈھونڈنا شروع کر دیتی ہوں کہ جو مجھے لکھتا ہے اور عجیب بات ہے کہ وہ لوگوں کو تو اب تک نہیں ملا مگر مجھے بہت پہلے مل گیا اور میں اپنے اس حاکم کی تابع ہوں وہ مجھے حکم کرتا ہے اور میں قلم پکڑ کر حروف جوڑنا شروع کر دیتی ہوں اور وہ حاکم ہے، میرا دل جو سارا دن دماغ کی غلامی کر کے تھک ہار کر سرِ شام اپنی من مانی کرتا ہے، دماغ کو تسخیر کرتا ہے اور خود اُس کا حاکم بن کر یادوں کے چراغوں سے شب کو لفظوں کے دیئے روشن کرتا ہے۔

س محبت کیا ہے آپکے نزدیک اور شاعری کیلئے کتنی ضروری ہے محبت کا دوسرا روپ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

ج محبت زندگی ہے اور موت بھی۔ جنت بھی ہے اور دوزخ بھی۔ بندگی ہے، عشق ہے، وحدانیت ہے اور خدا ہے۔ گماں سے یقین تک کا سفر ہے۔ مکاں سے لامکاں تک کا

سلسلہ ہے۔میں نے اسے مقام عرفہ حطیم ،اور سجدوں میں نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ دیکھا ہے۔اور دنیا کی رنگینیوں میں گم ہوس پرستوں اور دولت کے پجاریوں کو اس کے نام پر دھوکا اور فریب کرتے اور بکتے بھی دیکھا ہے۔مگر محبت تو بس محبت ہے،عشق ہے، وحدانیت ہے، خدا ہے۔

جہاں تک شاعری اور محبت کا تعلق ہے تو شاعری اس کے بغیر ادھوری ہے کیونکہ محبت احساسات وجذبات کا نام ہے اور شاعری ان احساسات وجذبات کا اظہار۔

س کیا آج معیاری ادب تخلیق ہو رہا ہے؟ موجودہ عہد کی شاعری کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

ج آج ادب یکسانیت کا شکار ہے۔ادیب اور شاعر اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔پہلے کتابیں اتنی زیادہ تعداد میں شائع نہیں ہوتی تھیں،اخبارات بھی چند ایک ہی ہوتے تھے۔ چند برسوں پہلے تک جو ادبی رسائل وجرائد چھپ رہے تھے ان کا ایک نام اور معیار تھا۔ادبی محفلیں آباد تھیں،قہوہ خانوں،ادبی بیٹھکوں اور تنقیدی محافل میں شعراء وادباء شامل ہوتے اور ادب پر تنقیدی اور تخلیقی گفتگو ہوتی اور اس باہمی مشاورت میں بہترین ادب تخلیق ہوتا۔ اُس دور میں الیکٹرونک میڈیا کی اتنی بھرمار نہیں تھی۔ نیوز پیپرز اور میگزین بھی گنے چنے تھے۔اگر کوئی اچھا لکھ رہا ہوتا تو اس کی مناسب حوصلہ افزائی کی جاتی۔آج اچھا لکھنے والے بہت ہیں لیکن وہ مشاعروں کی بھیڑ میں گم ہیں اور میڈیا پر بھی چند لوگوں کی اجارہ داری ہے جو اپنی پسند کے لوگوں کو سامنے لاتے ہیں۔آج بھی اچھا لکھنے والے موجود ہیں۔

س ڈی.جی خان کے ابتدائی شعراء کرام کے بارے میں رائے؟

ج اس دھرتی سے گوشہ ادب پر شفقت کاظمی،محسن نقوی،کیف انصاری،جاوید احسن،احمد خان طارق،اقبال سوکڑی،غلام قادر بزدار،عزیز شاہد،سلیم فراز،شریف اشرف جیسے پھول ہیں تو نسائی ادب میں اس دھرتی کی ادبی کہکشاں پر خواجہ فرید کی دائی پھاپھل سے لیکر بخت آور کریم ،سعیدہ افضل شیریں لغاری،طاہرہ سوز،رضوانہ تبسم جیسے ستاروں کی وجہ سے ملکی اور غیر ملکی ادب پر ڈیرہ غازیخان کو شہرت ملی۔

س عورتوں کی شاعری کوکیسا دیکھتی ہیں؟

ج عورتوں کی شاعری کو آج بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔آج بھی اگر چہ خواتین بہت اچھی شاعری کر رہی ہیں مگر آج بھی انہیں اپنی شاعری کو اپنا کہنے میں دوسروں کو یقین دلانا پڑتا ہے۔انکے لفظوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہےاور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں بھی مرد سے زیادہ عورت ہی قصوروار ہے۔جو اپنے جیسی عورت کی ترقی اور نیک نامی برداشت نہیں کرتی۔اور بدگمانی پھیلانے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔بعض مرد شعراء بھی کسی عورت کی ترقی کو برداشت نہیں کرتے اور چند لائنیں لکھنے والے بھی کلیات لکھنے والی خواتین کے استاد کہلانے کے شوقین بن جاتے ہیں۔اوراپنے تیئں غلط مفروضے پھیلاتے ہیں۔جس کی وجہ سے بہت سی خواتین دل برداشتہ ہوکر یا تو شاعری چھوڑ جاتی ہیں یاگمنامی اختیار کر لیتی ہیں۔

س اُردو شاعری کے بارے میں رائے۔اردو ادب کا مستقبل کیا ہے؟

ج اردو غزل اور نظم کی روایت بہت مضبوط ہے۔غزل میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موضوعات کا تنوع پیدا ہوا۔جبکہ نظم میں ہمیں ہیت کے بھی تجربات دیکھنے کو ملے۔یہ زبان چونکہ دنیا بھر میں سمجھی جاتی ہےاس لئے اس کے دامن میں موضوعات بھی دیگر زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں غزل اور نظم دونوں نے خلق خدا کے دکھوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔

آج کے سوشل میڈیا کے زمانے میں اگر چہ اردو رسم الخط اور اخبارات اور کتابوں کے مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں لیکن یہ زبان ٹیکنالوجی کے ساتھ بھی خود کو جوڑ رہی ہے۔

س آپ کا تعلق جس علاقے سے ہے وہاں کی اکثر خواتین شعور سے بے بہرہ ہیں، کیا آپ ان میں شعور اجاگر کرتی ہیں

ج یہ درست ہے کہ مجھے روزانہ ایسی کئی مریضوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو تعلیم نہ ہونے کے باعث اپنی صحت کی حفاظت نہیں کر پاتیں،انہیں صحت کے اصولوں سے آگاہی نہیں ہوتی

بیشتر خواتین دائیوں کا شکار ہو کر پہنچتی ہیں جب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوتا ہے۔ایسے میں جس حد تک بھی ہو سکتا ہے ان کا علاج کیا جاتا ہے اور انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ایسی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہیے تھا اور آئندہ اگر ایسی صورت حال کا سامنا ہو تو انہیں کیا کرنا چاہیے۔

س پہاڑی علاقوں میں حفظان صحت کے شعور کو اجاگر کرنے کے لیے کیا اقدامات ہونے چاہیے؟

ج پہاڑی اور پسماندہ علاقوں میں حکومت اور این جی اوز مل کر ہفتہ وار میڈیکل کیمپ منعقد کریں ان کیمپوں میں وہاں کے لوگوں کو صحت کے اصول بتائے جائیں، انہیں مفت طبی سہولت فراہم کی جائے مریضوں کا چیک اپ ہونا چاہیے تاکہ انہیں بروقت ہسپتال منتقل یا کسی ماہر ڈاکٹر کو ریفر کیا جا سکے۔

س دوسرے ممالک کے مقابلے میں ہمارے ہاں بچوں اور خواتین کی شرح اموات کیا ہے؟

ج ہمارے ملک میں پانچ سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل سالانہ ایک ہزار میں سے ایک سو سے زائد بچے وفات پا جاتے ہیں۔

س جنوبی پنجاب یا مضافاتی ادب میں خواتین کی شاعری پر آپ کے خیالات؟

ج بحیثیت مجموعی جنوبی پنجاب کی خواتین اپنی شاعری کے ذریعے ایک خوبصورت معاشرے کی تشکیل میں اپنا بنیادی کردار ادا کر رہی ہیں۔ظلم، جبر اور ناانصافیوں کے خلاف ان کی توانا آواز صرف خواتین کو ہی نہیں معاشرے کے ہر طبقے کو حوصلہ دے رہی ہے۔دبی ہوئی سسکیاں اب چیخ بن کر سامنے آ رہی ہیں اور دنیا کو ان کے مسائل کی جانب متوجہ کر رہی ہیں۔صدیوں سے زندانوں میں پڑے غلام اب زنجیریں توڑ رہے ہیں۔وسیب کی یہ خواتین اردو شاعری میں ایک نئے اسلوب کو جنم دے رہی ہیں ایک ایسا اسلوب جو ان کی پہچان بن رہا ہے اور جس کے ذریعے ان کی شاعری دور ہی سے نمایاں ہوتی ہے۔ان کے ہاں ہمیں ناآسودہ خواہشیں لہولہان پاؤں، ریزہ ریزہ خواب اور چلچلاتی دھوپ میں بے سمت سفر تو دکھائی دیتا ہے لیکن ان کی شاعری کی ایک اپنی سمت ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان

کی شاعری کا یہ سفر کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ایک ایسے ماحول میں جہاں اشاعت و طباعت کوئی زیادہ آسان نہیں، جہاں محفلوں اور مشاعروں کا ماحول بھی خواتین کیلئے موزوں نہیں اور جہاں قدم قدم پر انہیں گھریلو، سماجی و معاشرتی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس ماحول میں بھی اگر کچھ خواتین نے اپنے آپ کو منوالیا ہے تو ہمیں ان کی تعظیم کرنی چاہیے اور انہیں سلام پیش کرنا چاہیے۔

س آپ نے بتایا کہ آپ اپنے خاندان میں پہلی لڑکی ہیں جس نے ایم بی ایس کیا، کیا آج کے دور میں بھی آپ کے ہاں لڑکیوں کے لیے حبس زدہ ماحول پایا جاتا ہے؟

ج جی ہاں! ہمارے ہاں ابھی بھی قدیم روایات موجود ہیں۔میں بہت کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن خاندانی روایات سے بغاوت نہ کرسکی اور مجھے اسی شعبے تک محدود ہونا پڑا۔میں لوگوں سے درخواست کرتی ہوں خصوصاً والدین سے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے زیور سے ضرور سنواریں تاکہ ان میں زندگی گزارنے کا شعور اجاگر ہو۔

س کیا آپ نے کوئی ادبی تنظیم بھی بنائی ہے؟

ج ضرور۔اپنے خطے کی خواتین کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے اس خطے کی لکھاری خواتین کو یکجا کرنے اور نئی لکھنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی اور ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کیلئے ایک ادبی تنظیم "آنچل" کی بنیاد رکھی اور اس کے تحت متعدد ادبی پروگرام خواتین کیلئے کراچکی ہیں۔

س کوئی پیغام نسل نو کیلئے اور ارژنگ کیلئے؟

ج ایک خوبصورت جریدہ جو کہ بے لوث ادبی خدمت کررہا ہے میری دعا ہے کہ یہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔۔نسل نو کے لیے پیغام یہ ہے کہ زندگی کا مقصد سمجھیں۔اللہ نے جو امانت دی ہے اس کو اپنی اور دوسروں کی بہتری کیلئے استعمال کریں وقت ضائع نہ کریں۔جتنا ممکن ہو اس سے فائدہ اٹھائیں اور لوح زیست پہ اپنا نام روشن کرجائیں۔

یاسمین حمید

س آپ کا اصلی اور قلمی نام کیا ہے؟

ج یاسمین حمید ہی ہے۔

س اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیے۔ نیز جائے پیدائش۔

ج میں لاہور میں پیدا ہوئی۔ والدہ کے خاندان کا تعلق امرتسر سے تھا اور والد کا جالندھر کے قریب بجواڑہ سے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو والد (کرنل نیاز احمد رشید) فوج میں تھے۔ ڈیرادون سے تربیت یافتہ تھے۔ والدہ (بریگیڈیر ڈاکٹر سعیدہ اختر) نے 1948 میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے MBBS کیا تھا۔ شادی کے بعد والدہ نے بھی فوج میں کام شروع کیا۔ والدہ gynaecologist تھیں اور پاکستان فوج کی پہلی خاتون بریگیڈیر ہوئیں اور پہلی ہی خاتون جنھیں ستارۂ امتیاز (ملٹری) دیا گیا۔ میرے دادا محمد عبدالرشید بھی ڈاکٹر تھے۔ ہمارے گھر میں لکھنے پڑھنے کو ہر دوسرے کام پر ترجیح دی جاتی تھی۔ والدہ بہت سلیقہ شعار تھیں۔ عمر بھر باہر کام کرنے کے باوجود ہمارے گھر میں ہمیشہ ترتیب و تنظیم کی فضا کا احساس غالب رہا۔ حد درجہ صفائی، وقت کی پابندی، ہمیں کس طرح بیٹھنا ہے، کس طرح کھانا ہے، کیا پہننا ہے، لوگوں کی موجودگی میں کتنی بات کرنی ہے وغیرہ وغیرہ، گویا ہر چیز پر ان کی نظر ہوتی۔ ہمیں پڑھاتی بھی وہ خود تھیں۔ مجھ سے چھوٹے میرے دو بھائی ہیں۔ ہم تینوں کی پرورش تقریباً کلّی طور پر ہماری والدہ ہی نے کی۔ میرے اپنے تین بچے ہیں۔ شوہر، ڈاکٹر عبدالحمید صدیقی کیمیکل انجینئر تھے۔

س علمی اور ادبی سفر کے بارے میں تفصیل سے بتائیے۔

ج میری رسمی تعلیم میں ادب کا حصہ کم ہے۔ میٹرک میں سائنس کے مضامین تھے۔ St. Mary's Convent Multan سے میٹرک کیا، کیونکہ والدہ کا تبادلہ ان دنوں ملتان CMH میں تھا۔ اس کے بعد میں نے ہوم اکنامکس کالج لاہور سے BSc اور پھر Nutrition میں MSc کیا۔ مجھے سکول کے زمانے ہی سے شعر سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ موسیقی مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ جتنی غزلیں، جتنے گیت میں نے بچپن میں ریڈیو پر سنے، سب زبانی یاد تھے بلکہ آج تک یاد ہیں۔ پھر سکول میں بیت بازی میں حصہ لینا شروع کیا، اس کے لیے شعر یاد کیے اور اس طرح لفظ اور لفظ کی غنائی ترتیب مجھے fascinate کرنے لگی۔ کالج کے زمانے میں اُردو شاعری کے ساتھ مجھے انگریزی فکشن سے بہت دلچسپی رہی۔ باقاعدہ شعر میں نے قدرے دیر سے کہنا شروع کیے۔ تقریباً پچیس چھبیس برس کی عمر میں۔ اس وقت میرے دو بچے بھی تھے۔ لیکن اس کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اب تو پڑھنا اور لکھنا ہی میری زندگی ہے۔ نو برس (2007-2016) میں نے LUMS میں پڑھایا ہے۔ DHA لاہور میں 1986 میں The Lahore Alma کے نام سے ایک سکول بھی قائم کیا جہاں اس وقت تقریبا 800 بچے زیرِ تعلیم ہیں۔ یہ سکول University of Cambridge کے ساتھ منسلک ہے۔

س آپ کی شاعری کی متعدد کتب ہیں جو انگریزی ترجمہ بھی ہو چکی ہیں۔ اس بارے میں تفصیل سے بتائیے۔

ج میرے پانچ شعری مجموعے ہیں، 'پسِ آئینہ' (1988)، 'حصارِ بے در و دیوار' (1991)، 'آدھا دن اور آدھی رات' (1996)، 'فنا بھی ایک سراب' (2001)، اور 'بے ثمر پیڑوں کی خواہش' (2012)۔ پہلے چار مجموعوں کو جمع کیا تھا 2007 میں 'دوسری زندگی' کے نام سے۔ 2018 میں ان تمام مجموعوں اور اس کے بعد رسالوں میں شائع ہونے والے کلام سے انتخاب کیا رضی مجتبیٰ صاحب نے اور یہ شائع ہوا ہے 'ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے' کے نام سے۔ ترجمہ میں نے دوسروں کی شاعری کا کیا ہے۔ یہ

بیسویں صدی میں اقبال کے بعد کے 63 نظم نگاروں کے تراجم ہیں جو آکسفرڈ یونیورسٹی پریس(OUP) سے کتابی شکل میں 2010 میں شائع ہوئے۔ کتاب کا نام Pakistani Urdu Verse ہے۔میری اپنی شاعری کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع ہونے والے رسالے Granta میں اور امریکہ میں شائع ہونے والی کتاب Modern Poetry of Pakistan میں شائع ہوا ہے۔ایک کتاب میں نے فیض احمد فیض پر انگریزی میں لکھے گئے مضامین کی مرتب کی ہے۔ یہ بھی آکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے 2013 میں شائع ہوئی۔اس کا نام ہے Daybreak: Writings on Faiz ۔ ایک مضامین کی کتاب 'نیا اُردو افسانہ' کے نام سے مرتب کی جو 2014 میں شائع ہوئی۔ اکادمی ادبیات سے شائع ہونے والے رسالے Pakistani Literature اور LUMS سے شائع ہونے والے مجلے 'بنیاد' کی ادارت بھی کی ہے۔

س اس کے علاوہ آپ کلچرل اور فیشن شوز کے سکرپٹ بھی لکھتی ہیں۔ کچھ اس بارے میں بتایئے۔

ج اس بات کو اب تو بہت مدت ہوگئی۔ میں نے رعنا شیخ (جو اس وقت PTV کی MD تھیں) کی فرمائش پر چار سکرپٹ تیار کیے تھے۔ایک شو لندن میں ہوا تھا، ایک امریکہ میں، بے نظیر بھٹو کے دورے کے موقعے پر، ایک لاہور کے شاہی قلعے میں ورلڈ کپ کرکٹ کی ثقافتی تقریبات کے دوران اور ایک اسلام آباد میں PTV ایوارڈ کی تقریب میں۔ یہ تقریباً بیس سے پچیس برس پہلے کی بات ہوگی۔

س آپ کالم نگار بھی ہیں۔ کالم نگاری اور شاعری میں کس صنف میں لکھنے کے مواقع زیادہ وسیع ہیں؟

ج یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ میں نے روایتی کالم کبھی نہیں لکھا۔ البتہ DAWN میں تین برس تک 2004 سے 2007 تک میرے تراجم شائع ہوئے جن میں شاعر کا تعارف، مختصر تنقیدی نوٹ اور دو نظموں کا ترجمہ ہوا کرتا تھا۔ اسے بھی کالم ہی کہا جاتا

تھا۔ Poetic Justice کے نام سے یہ چھپتا تھا۔ جہاں تک کالم نگاری اور شاعری کے موازنے کی بات ہے تو شاعری جیسے تخلیقی کام کا کالم سے تو موازنہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ کالم کے اپنے مقاصد ہیں، اپنا scope ہے۔ شاعری بہت بڑی صنف ہے۔ اس کا تجربہ بالکل مختلف ہے۔

س آپ نے متعدد ادبی ایوارڈ حاصل کیے۔ ان کی تفصیل بھی بتائیے۔

ج معلوم نہیں کہ ایک meritless معاشرے میں ایوارڈ کی کوئی وقعت ہے بھی یا نہیں۔ میرا سب سے پہلا ایوارڈ تو MSc میں ملنے والا گولڈ میڈل ہے۔ بہت سے ادبی ایوارڈ بھی ہیں جن کی تفصیل میرے CV میں موجود ہے۔

س شاعری میں کن کن اصناف میں طبع آزمائی کی؟

ج غزل، نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم، پابند نظم ان سب ہیئتوں میں لکھا ہے۔

س نثری نظم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، کیا اسے شاعری تسلیم کیا جاتا ہے؟

ج یہ بحث تو اب فرسودہ ہو چکی ہے، شاعری خواہ کسی صنف، کسی ہئیت میں بھی ہو، اسے اولاً شاعری ہونا چاہیے۔ شاعری کا معیار، شعری صنف یا ہئیت کی بنیاد پر طے نہیں ہوتا بلکہ اس میں موجود شعریت کے معیار سے ہوتا ہے۔ ایک غزل کو نثری نظم کے مقابلے محض اس لیے شاعری نہیں کہا جا سکتا کہ وہ غزل ہے۔ بعض غزلیں شعری معیار پر پوری نہیں اترتیں اور بعض نثری نظمیں شعریت سے بھرپور ہوتی ہیں۔ بحر، قافیہ اور ردیف اچھی شاعری کی ضمانت نہیں ہیں۔ بہت سے شاعروں نے بہت کامیاب نثری نظمیں لکھی ہیں اور ان کی داد بھی وصول کی ہے۔ نسرین انجم بھٹی، ذی شان ساحل، افضال احمد سید، تنویر انجم، ابرار احمد، نصیر احمد ناصر، عذرا عباس اور ان کے علاوہ بھی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے بہت موثر نثری نظمیں لکھی ہیں۔

س قدیم شعرا میں کن کن کو پڑھنا پسند کرتی ہیں اور کیوں؟

ج اساتذہ کو وقتاً فوقتاً پڑھتی رہتی ہوں لیکن زیادہ میں نے میرؔ اور غالبؔ کا مطالعہ

کیا ہے، اور غالب کا میر سے زیادہ۔ مصحفی اور مومن اور دوسرے اساتذہ کو بھی اکثر پڑھتی رہتی ہوں۔ غالب کا غیر معمولی ذہن اور شعر میں اس کی کارفرمائی مجھے بہت متاثر کرتی ہے۔ اسی طرح میر کے ہاں موضوعات کی نزاکت اور اتنا ہی دلکش اسلوب پسند ہے۔

جب دور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز
کیا پوچھتے ہو دیر خبردار ہوا میں

س بیسویں صدی میں کن شعرا نے بہترین تخلیقات پیش کیں اور ان کے بعد آنے والے شعرا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ کیسا ادب تخلیق کر رہے ہیں؟

ج میرے خیال میں بیسویں صدی اجتماعی طور پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی سے زیادہ زرخیز ہے۔ شاعری میں، اور نثر میں بھی۔ شعری اصناف میں غزل کے ساتھ ساتھ اس دور میں نظم کی مقبولیت بہت بڑھ گئی اور نظم کی نئی ہیئتیں بھی مقبول ہوئیں۔ اقبال کے بعد راشد، میراجی، مجید امجد، فیض، اختر الایمان، جیسے بڑے ناموں کے ساتھ صدی کے مختلف ادوار میں بے شمار قابل ذکر شاعر ہیں جو اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور اپنے اسلوب میں منفرد اور لائق توجہ۔ نظم میں مقبولیت نے داخلی اور خارجی مضامین میں اضافہ کیا۔ انفرادی تجربہ اس نئے دور کا امتیاز ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ بیسویں صدی ہی میں پہلی مرتبہ خواتین نے بھی اپنی مکمل شناخت کے ساتھ نثر و شاعری میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا اور اُردو ادب میں ایک نئے حسی تجربے کا اضافہ ہوا۔ اگر سب نام گنوائے جائیں تو فہرست خاصی طویل ہو جائے گی۔

س کیا ہماری موجودہ شاعری ہماری اجتماعی سوچ کی عکاسی کر رہی ہے؟

ج اجتماعی سوچ کی ایک سے زیادہ سطحیں ہوا کرتی ہیں۔ خارجی حقائق کے تبدیل ہونے سے انسانوں کی داخلی دنیا بھی تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ موجودہ زندگی اپنی تمام تر پیچیدگیوں اور challenges کے ساتھ آج کے انسان کی فکر پر حاوی ہے۔ سچا شعر کہنے والا بھی اسی فکر کا اسیر ہے۔ وہ معاشرے سے باہر کا فرد نہیں ہے۔ سو

جو کچھ وہ لکھتا ہے وہ خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر اجتماعی رویوں ہی کی نمائندگی کرتا ہے۔

س پاکستان میں مختلف حلقے کام کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کام سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج اگر کوئی خلوص نیت سے کام کر رہا ہے تو اچھی بات ہے۔ ہر شخص کو مطمئن کرنا تو ممکن بھی نہیں۔

س حکومتی سطح پر ادب کے حوالے سے کتنا کام ہو رہا ہے، اور کیا یہ تسلی بخش ہے؟

ج پہلی بات یہ ہے کہ حکومتی سطح پر بھی ہو تو کام پھر بھی ادیبوں ہی کو کرنا ہے۔ میرے خیال میں جس چیز کا فقدان ہے وہ وسائل ہیں اور کام کا معیار۔ اس کے باوجود بعض بہت اچھے کام بھی ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر اُردو لغت کے سلسلے میں کام اچھا تھا سوائے اس کے کہ تسلسل سے معیار کو برقرار نہیں رکھا گیا۔ کتابی سلسلے اور بھی ہیں جو کامیاب ہیں اور مفید ہیں لیکن ان میں بھی بعض جگہ معیار کا مسئلہ ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سرکاری اداروں میں منصوبہ بندی، انتظامی مسائل اور وسائل کی کمی کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ ترجمہ نگاری کا کام بھی توجہ طلب ہے۔ اس ضمن میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

س ادبی گروپس ادب پر کتنا منفی اثر ڈال رہے ہیں اور کیا آپ سمجھتی ہیں یہ ادبی گروپ دراصل قبضہ گروپ ہیں؟

ج ہیں تو سہی لیکن سنجیدہ اور جینوئن (genuine) لکھنے والے کو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اس طرح کی گروپ بندیوں اور دشمنیوں سے کسی کو وقتی طور پر فائدہ یا نقصان تو ہو سکتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اصل اور نقل کی پہچان بھی ہو جایا کرتی ہے۔

س اکادمی ادبیات ادب کے حوالے سے کیا کردار ادا کر رہی ہے؟

ج اس کا جواب سوال نمبر 14 میں دے چکی ہوں۔

س آپ کے نزدیک تصورِ شعر کیا ہے؟

ج اپنی سچائی کا بیان، خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی۔ کسی اور کی سچائی کو اپنے اوپر طاری کر کے اسے بیان تو کیا جا سکتا ہے مگر ایسا اظہار موثر نہیں ہو سکتا ۔ میں کسی قسم کی ذہنی اور تخلیقی

پابندی کے حق میں نہیں ہوں خواہ وہ نظریے کی پابندی ہی کیوں نہ ہو۔

س اس وقت جدید غزل کا بڑا شاعر کون ہے؟ یہی سوال نظم کے حوالے سے بھی ہے۔

ج اس سوال میں پہلی بات طے کرنے کی تو یہ ہے کہ آپ جدید کسے کہتے ہیں۔اس کا جواب میں نے اپنے پانچویں مجموعے کے تعارفی مضمون میں دیا ہے۔ یہاں بات ذرا طویل ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ درجات طے کرنے لیے فاصلہ بہت ضروری ہے۔ہم عصروں کے لیے 'بڑا' یا 'چھوٹا' کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ اِس وقت بعض لوگ بہت اچھی غزل اور نظم لکھ رہے ہیں۔ان میں سے کسی ایک کے حق میں 'بڑا' ہونے کی حتمی رائے دینا ممکن نہیں۔ باتیں وقت گزرنے کے بعد طے ہوتی ہیں اور شاید تب بھی طے نہیں ہوتیں۔ادب اور تخلیق میں حمیت اضافی ہے۔ یہ سفر ختم ہونے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔اس کی کوئی منزل آخری نہیں ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔ضروری نہیں اس سے اور لوگ بھی اتفاق کریں۔

س کیا آپ نے عورتوں کے مسائل کے حوالے سے شاعری میں آواز بلند کی؟

ج شاعری اور نعرہ بازی میں فرق ہونا چاہیے۔میں شاعری میں نعرے بازی کی قائل نہیں ہوں۔اس کے بغیر بھی بات کہی گئی ہے اور کہی جا سکتی ہے۔ میرے ہاں شعوری طور پر کسی ایجنڈے سے وابستگی نہیں ہے۔ میں دیانتداری سے جو بھی محسوس کرتی ہوں، خواہ وہ عورت سے متعلق ہے یا کسی اور مسئلے سے یا میری اپنی ذات سے، میں اس کا اظہار کرتی ہوں۔

س سارہ شگفتہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، عذرا عباس کی شاعری کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

ج آپ نسرین انجم بھٹی اور تنویر انجم کو بھول گئیں۔وہ بھی بہت عمدہ شاعر ہیں۔دیکھیے، سب شاعر ایک ہی طرح سے نہیں لکھتے، اس لیے انھیں اتنی سہولت سے ایک ہی خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔مضمون یا content شاعری کی ایک جہت ہے، اس کا ایک حصہ ہے۔ شاعری دراصل تو ایک فن ہے۔اصل ہنر تو content کو، تجربے کو، شاعری میں تبدیل کرنا ہے۔اس میں ہر ایک کی کامیابی یا حصول کا گراف دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔اگر آپ

نے ان سب کو تانیثیت (feminism) کے حوالے سے یکجا کیا ہے تو وہ بھی ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ یہ سب ہی اہم ہیں لیکن بحثیت شاعر، جو چار نام آپ نے لیے ہیں، ان میں فہمیدہ ریاض مجھے ذاتی طور پر زیادہ پسند ہیں۔ فہمیدہ کے اندر جو فطری شاعر ہے، اس کی آواز بہت موثر ہے۔

س کیا آپ سمجھتی ہیں کہ نوجوان نسل ذہنی اضطراب کا شکار ہے اور کتاب سے دور ہو چکی ہے؟

ج کتاب سے دوری کا سبب ذہنی اضطراب نہیں ہے۔ نئی نسل کے مضطرب ہونے کی خبر کوئی پہلی مرتبہ نہیں دی جا رہی۔ نقادوں نے میرا جی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے بھی لکھا ہے کہ وہ نئی نسل کے اضطراب کی نمائندگی کرتی ہے۔ میرا جی کے انتقال کو اب ستر برس ہو گئے ہیں۔ اضطراب ویسے بھی کوئی ایسی بری چیز نہیں ہے۔ حرکت کے لیے اضطراب مہمیز کا کام کرتا ہے۔ کتاب سے دوری کے اسباب اور ہیں۔ کتاب اب تفریح کا واحد ذریعہ نہیں رہی۔ اب تفریح کے اور ذرائع بھی ہیں، اس لیے اب کتاب پر اتنی توجہ نہیں ہے۔ تعلیمی نظام کی کمزوریاں بھی اس کی ذمہ دار ہیں۔

س کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ادب کو نظریاتی ہونا چاہیے اور کیا آج کی شاعری میں ایسا ہونے کے امکانات موجود ہیں؟

ج میرے خیال میں اس کا جواب میں دے چکی ہوں۔ میں آرٹ میں پابندی کی قائل نہیں ہوں۔ میں آرٹ میں سچائی کی قائل ہوں، چاہے اس کے لیے اپنے آپ ہی سے متصادم کیوں نہ ہونا پڑے۔ اگر کوئی مخصوص نظریہ کسی کی سچائی ہے اور اولین اہمیت اسی کی ہے تو اس کا اظہار و بیان اس بات کی خود بخود تصدیق کر دے گا۔ فیشن یا trend کے دباؤ میں کوئی سمت اختیار کرنے سے مناسب نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

س کیا ادیب اور شاعر معاشرتی اور سیاسی مسائل کے خلاف اپنا کردار تحریروں میں ادا کر سکتے ہیں اور کیا وہ ایسا کر رہے ہیں؟

ج: کیوں نہیں کر سکتے۔ ادیب اور شاعر معاشرے ہی سے اپنے مضامین کشید کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب اپنا اپنا ہوتا ہے۔ آج کا ادیب بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ جو پڑھتے ہیں وہ یہ بات جانتے ہیں۔

س: غزل کا کیا مستقبل ہے؟

ج: ابھی تک تو اُردو زبان میں غزل خوب لکھی جا رہی ہے۔ مشاعرے کی تہذیب اسے فروغ بھی دیتی ہے۔ میرے خیال میں اُردو غزل کو اگر کوئی خطرہ ہے تو یکسانیت سے ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ آج کل بہت سے شاعر، غزل اپنی سچائی منکشف کرنے کے لیے نہیں لکھتے، بلکہ سامع سے داد وصول کرنے کے لیے لکھتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ دو مصرعوں کا ایک مخصوص انداز میں ربط قائم کرتے ہیں۔ اس عمل میں اسلوب کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ سب کی غزل ایک سی لگنے لگتی ہیں۔ دیکھئے آگے چل کر کیا ہو۔

س: بیرونی ممالک میں اُردو ادب کے حوالے سے ہونے والی سرگرمیوں سے آپ کتنی مطمئن ہیں؟

ج: بیرونی ممالک میں رہنے والوں نے اپنے لیے تفریح کا انتظام کر رکھا ہے۔ اپنی تہذیب سے قربت کے التباس کے لیے کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اسی میں جو لوگ ادب کے ساتھ سنجیدگی سے وابستہ ہیں وہ عمدہ تخلیقی اور تنقیدی کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ ساقی فاروقی، عشرت آفرین اور حمیرا رحمان جیسے شاعروں نے اپنی زمین سے دور رہ کر ہی لکھا اور خوب لکھا۔ ن م راشد نے بھی عمر کا ایک بڑا حصہ ملک سے دور گزارا اور ان کی بعض بہترین نظمیں اسی زمانے کی تخلیق ہیں۔

س: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ہمارے ادبی حلقوں کے اجلاسوں میں اب بھی معیاری تنقید ہو رہی ہے؟

ج: آج کل لوگ عجلت میں ہیں اور تنقید تو عجلت کا کام نہیں ہے۔

س: عورت کی آزادی کے بارے میں آپ کے کیا نظریات ہیں؟

ج: وہی جو کسی بھی مہذب معاشرے میں ہونے چاہییں۔عورت کی آزادی کا تعلق اس کے لباس اور طرزِ آرائش سے نہیں ہے، ان رویوں سے ہے جو اس کی زندگی کے بڑے اور اہم فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، جو اس کے بنیادی حقوق سے اسے محروم رکھتے ہیں۔

س: ادبی دنیا میں عورت کن مسائل کا شکار ہے؟

ج: میں نے اس سوال کا جواب اپنے ایک تفصیلی مضمون میں دیا ہے: ''ہمارا معاشرہ اور عورت لکھاری'' ، جو کراچی سے 'مکالمہ' میں شائع ہو چکا ہے۔اجتماعی سطح پر، صرف ہمارے معاشرے ہی میں نہیں بلکہ پوری دُنیا میں، ایک طویل عرصے تک، عورت کے تخلیقی وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا تھا، سو عورت کے تخلیقی تشخص کی عمر ابھی بہت کم ہے۔تاریخ پر نظر ڈالیں تو عورت سے عجیب وغریب توقعات وابستہ کی جاتی رہی ہیں۔پہلے تو اس کے لکھنے پر ہی پابندی تھی، پھر اگر وہ کچھ لکھ لیتی تو اس کی اشاعت ایک مسئلہ تھا، پھر اشاعت شروع ہوئی تو فرضی نام سے۔پھر یہ کہ عورت کیا لکھے۔توقعات کی شکل میں اس کی بھی حدود مقرر کی گئیں۔ جو تجاوز کرے وہ سزاوار ٹھہرے۔پھر یہ ارشاد ہوا کہ عورت کھل کر لکھے۔عجیب وغریب سی توقعات ہیں۔کتنے مرد ادیب محض mediocre ہیں۔انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا، لیکن عورت کی بقا صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر وہ excel کرتی ہے۔اس سے کم پر اسے کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ایک لحاظ سے یہ بات اچھی بھی ہے کہ یہ challenge بعض صورتوں میں مہمیز کا کام بھی کرتا ہے۔

س: آزاد غزل کے حوالے سے جو تجربات ہوئے ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ج: ہر تجربے کا احترام کرنا چاہیے لیکن غزل کا آزاد ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔غزل، اس لیے غزل کہلاتی ہے کیونکہ اس کی ایک مخصوص ہیئت ہے اور ایک خاص مزاج ہے۔اگر تجربہ کرنا چاہتے ہیں تو بصد شوق کریں، لیکن پھر اسے غزل نہ کہیں، کوئی اور اچھا سا نام رکھ دیں اس ہئیت کا۔

س: کیا غزل میں نئے تجربات کی ضرورت ہے؟

ن تجربے کا راستہ کھلا رہنا چاہیے۔ لیکن شاعری میں کوئی بھی تجربہ اسی وقت کامیاب ہوگا جب وہ ایک خاص شعری معیار کو ملحوظ رکھے۔ یہ کام تاریخ میں ہوا ہے۔ عام طور پر تجربے کی کامیابی کا ضامن بڑا شاعر ہوتا ہے جو نئی زبان بھی تخلیق کرنے پر قادر ہو اور کسی نئی صنف یا نئی ہیئت میں بڑی اور اثر انگیز شاعری کے نمونے بھی فراہم کر سکے۔ اس کے شواہد تاریخ میں موجود ہیں۔ آزاد نظم کے سلسلے میں ن م راشد اور میرا جی کی مثال آپ کے سامنے ہے۔

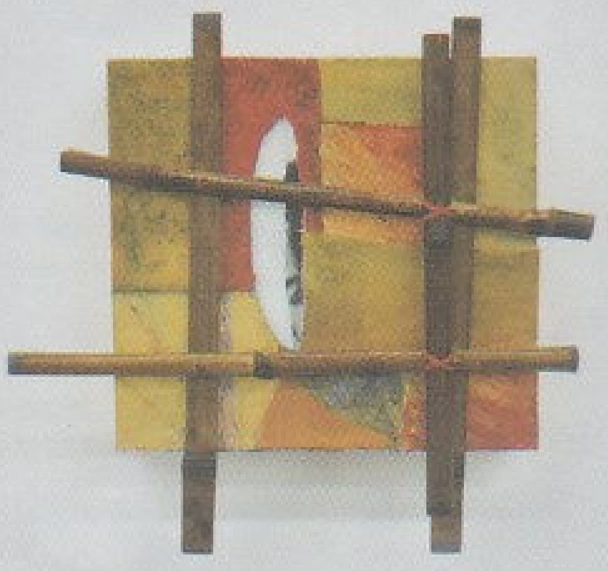

عامر بن علی کی دیگر کُتب

- محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)
- محبت کے دو رنگ - گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)
- گفتگو (انٹرویوز)
- مکتوب جاپان (کالمز)
- آج کا جاپان (سفرنامہ)
- جہاں گردی (سفرنامہ)
- محبت کے موسم (زیرِ طبع)
- گردِ سفر (زیرِ طبع)
- مدیرِ اعلیٰ: ماہنامہ ارژنگ لاہور

حسن عباسی کی دیگر کُتب

- جگنو میری سوچوں کے (شاعری)
- ہم نے بھی محبت کی ہے (شاعری)
- ایک محبت کافی ہے (شاعری)
- اک شام تمھارے جیسی ہو (شاعری)
- سائیں (حمدیہ مجموعہ)
- صاحب (حمدیہ مجموعہ)
- محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (سفرنامہ)
- ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (سفرنامہ)

لبنیٰ صفدر کی دیگر کُتب

- تمھیں تو میرا ہونا تھا (شاعری)
- محبت آئینہ کر لو (شاعری)
- یہ ہجر ہے یا وصال ہے (شاعری)
- بارشوں کے موسم میں (شاعری)
- خوشبو ہے وہ صندل کی (شاعری)
- تم محبت کا استعارہ ہو (شاعری)

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

نستعلیق
Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com